الہاماتِ غالبؔ

مشتمل بر :

1- دیوانِ غالب
2- شرح دیوانِ غالب
3- حالاتِ غالب
4- تنقید کلامِ غالب

از : پروفیسر ملک عنایت اللہ
ایم اے۔ لاہور

PDF By :
Ghulam Mustafa Daaim

شیخ ظفر محمد پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر کشمیری بازار لاہور سے شائع کیا

تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن   این مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است   شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

(حضرت غالب رحمتہ اللہ علیہ)

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل   سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش   گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

(حضرت غالب رحمتہ اللہ علیہ)

فکرِ انساں کو تری ہستی سے یہ روشن ہُوا   ہے پرِ مُرغِ تصوّر کی رسائی تا کجُا
آہ تو اُجڑی ہوئی دِلی میں آرامیدہ ہے   گلشنِ ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

(اقبال رحمتہ اللہ علیہ)

طالبؔ و عرفیؔ و اسیرؔ و کلیمؔ   لوگ جو چاہیں اُن کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے   ہے ادب شرط مُنہ نہ کھلوائیں

غالبؔ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

(حالی رحمتہ اللہ علیہ)

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ وید مقدس
اور دیوانِ غالبؔ!"

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم

"مرزا کے کلام کی خوبیاں تو نہ معلوم کیا کیا ہیں اور کتنی ہیں۔
مگر سب سے بڑی خوبی میری نگاہ میں یہی ہے کہ ہندوستان
کا کوئی شاعر ان کے مقابلہ پر نہیں ٹھہرتا۔ گویا ان کا کلام
ایک تیز شراب ہے جس کے بعد کوئی نشہ نہیں چڑھ سکتا
اور ان کا رنگ جمنے کے بعد کوئی رنگ نہیں جم سکتا۔"

حضرت آسی لکھنوی

توطیہ

۱۹۳۱ء میں جبکہ میں "فارمن کرسچین کالج" لاہور میں پروفیسر تھا میں نے دیوان ذوق کی شرح لکھی جس کا پہلا ایڈیشن اکتوبر ۱۹۳۲ء میں دو ہزار کی تعداد میں اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۳ء میں تین ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ اسی زمانے میں کالج کے بعض ادب شناس طلبا نے مجھے دیوان غالب کی شرح لکھنے کی تحریک کی۔

لیکن میں سمجھتا تھا کہ دیوان غالب کی کافی شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور اس میدان میں مزید طبع آزمائی کی ضرورت نہیں مگر احباب نے باوجود میری معذرت کے اپنے پیہم اصرار اور مسلسل تقاضہ سے مجھے کچھ اسطرح مجبور کر دیا کہ میں نے اس مشکل کام کے انجام دینے کا وعدہ کر لیا اور خدا کا نام لیکر اپنے لمحات فرصت میں اپنی بساط فکر کے مطابق لکھتا رہا۔ ۱۹۳۴ء کے خاتمہ پر نہ صرف شرح بلکہ کتابت کی بھی تکمیل ہو گئی تھی۔ باقی طباعت کے مرحلہ کو طے کرنا میرے لئے کچھ دشوار نہ تھا کیونکہ میں ان دنوں لاہور کے دو مشہور اور عظیم الشان مطابع "مطبع کریمی" "مطبع مجتبائی" کا مالک تھا لیکن ۱۹۳۵ء میں تحریک مسجد شہید گنج شروع ہو گئی اور میں اپنے کاروباری مشاغل کی وجہ سے کالج کی ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر کے سیاسیات میں حصہ لینے لگا تھا۔

اس زمانہ میں تحریک مسجد شہید کے سلسلہ میں پنجاب کے اکثر مقتدر سیاسی کارکن حکومت پنجاب کے حکم سے مختلف مقامات پر نظر بند کئے جا چکے تھے اور صوبہ کے ہر حصہ میں تحریک واگذاری مسجد شہید گنج پوری شدت کے ساتھ جاری تھی۔ تحریک کو کامیاب بنانے کیلئے "آل انڈیا مجلس اتحاد ملت" کی بنیادیں پڑ چکی تھیں اور مجھے اس کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔

حالات اور واقعات کی رفتار نے مسلمانوں کو "سول نافرمانی" پر مجبور کر دیا تھا۔ مجلس اتحاد

ملت نے جو صوبہ میں تحریک کی قیادت کر رہی تھی مجھے "تحریک سول نافرمانی" کا ڈکٹیٹر (آمر) مقرر کیا میں نے شاہی مسجد لاہور کو مرکز قرار دیکر "سول نافرمانی" کی مہم شروع کر دی۔ حکومت نے میری گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے اور تعزیرات ہند کی کسی دفعہ کے ماتحت میری تمام جائداد منقولہ و غیر منقولہ ضبط کر لی اور یہ دونوں مطابع بھی اسی ضبط شدہ جائداد میں شامل تھے۔

انہی دنوں میں مسٹر جناح ولایت سے ہندوستان مراجعت فرما ہوئے تھے انہوں نے دہلی پہنچکر میرے نام ایک پیغام بھیجا اور مسلمانان پنجاب اور حکومت پنجاب کے درمیان سمجھوتہ کرانیکی خواہش ظاہر فرمائی۔ میںنے قائد تحریک کی حیثیت سے اپنے مطالبات کی فہرست دہلی انکی خدمت میں بھیجدی۔ وہ میری دعوت پر لاہور تشریف لائے۔ مسلمانانِ لاہور نے میرے اعلان کے مطابق ریلوے اسٹیشن پر ان کا شاہانہ استقبال کیا وہ سٹیشن سے سیدھے شاہی مسجد لاہور میں تشریف لائے جہاں لاکھوں مسلمان ان کا پیغام سننے کے لئے جمع تھے۔ میںنے اسیدن ان کے ارشاد کے مطابق "تحریک سول نافرمانی" کے ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا اور انہوں نے ہمارے مطالبات "ہز ایکسیلنسی گورنر پنجاب" کی خدمت میں پیش کر دیئے اور قریباً ایک ماہ تک لاہور میں قیام فرمایا۔ آخر قائد اعظم کی کوششوں سے حکومت نے واگذاری مسجد کے علاوہ تمام مطالبات منظور کر لئے اور تحریک کے سلسلے میں جتنے نظر بند اور قیدی تھے سب کو رہا کر دیا۔ اخبارات اور مطابع کی ضمانتیں منسوخ کر دیں۔ عدالتوں میں جس قدر مقدمات زیر سماعت تھے وہ سب واپس لے لئے۔ میرے وارنٹ گرفتاری و ضبطی بھی منسوخ ہو گئے۔

میں جب مسجد سے باہر نکلا اور اپنے کاروبار کا جائزہ لیا تو شرح ہذا کی اکثر کتابت شدہ کاپیاں میری عدم موجودگی میں ضائع اور خراب ہو چکی تھیں اور اصل مسودہ بھی نہیں ملتا تھا۔ اور میرے لئے ناممکن تھا کہ میں نئے سرے سے شرح لکھنے میں مصروف ہوتا لہذا کتاب کی اشاعت معرض التوا میں پڑ گئی۔ مسلم لیگ کی تحریک ملک میں شروع ہو چکی تھی اور میں بھی اب سیاسیات ملکی میں کافی حصہ لے رہا تھا اسلئے اسکی ترتیب و

تدوین کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔

ٹھیک چار پانچ برس بعد یعنی ۱۹۳۹ء میں پرانے کاغذات میں سے شرح ہذا کا اصل مسودہ اتفاقاً دستیاب ہو گیا اور میرے عزیز بھائی شیخ ظفر محمد صاحب تاجر کتب لاہور نے اس کی طباعت کی خواہش ظاہر کی اور آج انہیں کی کوششوں سے میری یہ ناچیز ذہنی کاوش کتابی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔

میں یہ دعوٰی نہیں کر سکتا کہ میں نے جو معانی بیان کئے ہیں وہ صحیح اور حتمی ہیں۔ لیکن جہاں تک مجھ سے ہو سکا ہے میں نے تحقیق و تلاش کے دامن کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ مولانا حالی نے اپنی بے نظیر تصنیف "یادگار غالب" میں جن اشعار کی شرح فرمائی ہے انہیں بجنسہٖ نقل کر دیا ہے۔ کیونکہ ان کی معلومات تمام شارحین سے زیادہ ہیں۔ اس لئے کہ یہ مرزا غالب کے شاگردوں میں سے تھے اور انہوں نے خود مرزا غالب کی زبان سے بعض اشعار کے معنی سنے تھے۔ ان کی تحقیق نے کلام غالب میں بعض ایسے بیش بہا مطالب کا اضافہ کیا ہے جو اس سے پہلے عوام کی نظروں سے مخفی اور پوشیدہ تھے۔

میں نے اس شرح میں جس مقام پر دوسرے شارحین غالب سے اختلاف کیا ہے اور ان پر تنقید کی ہے وہاں اپنی رائے ظاہر کرنے سے گریز نہیں کیا۔ نیز اگر کبھی شعر کی شرح کو میں نے بہتر خیال کیا ہے تو اسے شارح کے نام کے ساتھ نقل کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔

یہ میری انتہائی ناشکر گزاری ہو گی اگر میں اُن شارحین غالب کا ذکر نہ کروں جن کی شرحیں اس شرح کی تکمیل کیلئے میرے زیر مطالعہ رہیں اور میں اس بات میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں نے دیوان غالب کے بعض مشکل اور پیچیدہ اشعار کے سمجھنے کے لئے یادگار غالب حالی، اور شرح مولانا آسی و مولانا حسرت موہانی، و حضرت بیخود دہلوی و مولانا حیدر علی طباطبائی سے

استفادہ کیا۔

اگرچہ میں نے اس شرح کے لکھنے میں انتہائی کوشش اور احتیاط سے کام لیا ہے لیکن آخر انسان ہوں اور سہو و خطا لازمہ انسانیت ہے لہذا مجھے خود اعتراف ہے کہ اس میں کئی ایک اغلاط اور لغزشوں کا احتمال ممکن ہے اس لئے ادب دوست حضرات سے استدعا ہے کہ وہ ہر جائز اصلاح اور مناسب ترمیم کے مشورہ سے دریغ نہ فرمائیں۔ تاکہ اشاعت ثانی میں اغلاط کی گنجائش نہ رہے۔

مجھے اُمید ہے کہ میری یہ ناچیز ذہنی کاوش قبولیت عامہ کا امتیاز حاصل کرے گی اور درحقیقت یہی میری محنت کا اصلی صلہ ہوگا۔

ناچیز

(پروفیسر) ملک محمدؐ عنایت اللہ ایم۔ اے

لاہور

تعارف

ولادت و حسب نسب

مرزا اسد اللہ خاں غالب تخلص المعروف بہ میرزا نوشہ المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کبھی اسد بھی تخلص کرتے تھے۔ مرزا کے آبا و اجداد ایبک قوم کے ترک تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر خود فرماتے ہیں ؎

ایبکم از جماعتِ اتراک　　در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فنِ آبائے من کشاورزیست　　مرزبان زادۂ سمرقندیم

ان کے دادا وہ پہلے بزرگ تھے جو مرزا کی پیدائش سے پچاس ساٹھ برس پہلے سمرقند چھوڑ کر ہندوستان آئے اور اسے اپنا وطن بنایا اور شاہ عالم کی فوج میں ملازمت اختیار کی۔ مرزا کے والد عبد اللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہا پہلے لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے یہاں نوکر ہوئے اور اسکے بعد حیدر آباد دکن میں کئی برس تک ملازم رہے۔ آخر الور پہنچے اور وہاں ایک محاربہ میں گولی لگنے سے انتقال کیا۔ میرزا عبد اللہ بیگ خاں مرزا غالب کے والد کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان رئیس آگرہ کی بیٹی سے ہوئی تھی چنانچہ مرزا شب ہشتم ماہ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷، دسمبر ۱۷۹۷ء کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش اور تعلیم پائی۔

مرزا کے والد کا جب انتقال ہوا تھا تو مرزا کی عمر اس وقت پانچ برس کی تھی۔ والد کی وفات کے بعد مرزا کے چچا نصر اللہ بیگ نے انکو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اسکے چار پانچ برس بعد ۱۸۰۶ء میں جب

چچا کا بھی انتقال ہو گیا تو مرزا کو ان کا وارث ہونے کی حیثیت سے ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ پنشن ملتی رہی لیکن مرزا کے خطوط اور معاصرین کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا قیام آگرہ میں انکے نانا کے یہاں ہی تھا

تعلیم

مرزا کی تعلیم سے بے پروائی نہیں برتی گئی۔ مرزا کی والدہ خود ایک خواندہ عورت تھیں اسلئے انہوں نے مرزا کی تعلیم کا خاص خیال رکھا بعض تذکرہ نگاروں کی تصنیفات اس خیال کی موید ہیں کہ مرزا کے ایک استاد نظیر اکبر آبادی بھی تھے لیکن مرزا نے ابتدائی تعلیم آگرہ کے مشہور فاضل معلم شیخ معظم سے حاصل کی تھی۔ مرزا کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں علوم مروجہ سے کافی واقفیت تھی منطق، فلسفہ، ہیئت کی علمی اصطلاحات ان کے ابتدائی کلام میں پائی جاتی ہیں۔ نیز وہ طب کی مشہور کتب سے بھی بخوبی واقف تھے۔ عربی صرف و نحو پر انہیں کامل عبور تھا۔ مولانا حالی فرماتے ہیں کہ جن ٹیڑھی ردیفوں میں انہوں نے غزلیں لکھی ہیں ان میں علم عروض کے جاننے کے بغیر غزل گوئی ناممکن تھی۔

لیکن جو چیز مرزا کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ زبان فارسی اور ادب سے واقفیت اور اس زبان میں قدرت اظہار خیال ہے۔ مرزا گیارہ برس کی عمر میں فارسی شعر کہا کرتے تھے اور اس خرد سالی میں ظہوری کا کلام اور دوسری فارسی کتب بھی زیر مطالعہ تھیں۔

فارسی ادب سے دلچسپی شیخ معظم کی شاگردی ہی کے زمانہ سے ہو گئی تھی لیکن اس سلسلہ میں ملا عبد الصمد ہرمزد کے احسانات مرزا پر سب سے زیادہ ہیں۔ ہرمزد سنہ ۱۸۱۰ء میں آگرہ میں بطور سیاح وارد ہوا تھا اور دو برس تک مرزا کے ساتھ رہا اور جب مرزا آگرہ سے دہلی آئے تو وہ بھی ساتھ تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرزا کا اتالیق مقرر ہو گیا تھا۔ اسکی رفاقت سے مرزا کو فارسی زبان میں وہ ملکہ حاصل ہو گیا تھا جو اہل زبان کا خاصہ ہے جس طرح عام ایرانی ہندوستانیوں کی فارسی کو خاطر میں نہیں لاتے مرزا بھی شروع ہی سے ہندی

زباندان فارسی نویس" کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اسکے علاوہ ہرمزد کیوجہ سے وہ پارسیوں کے عقائد سے بھی پورے طور سے واقف ہو گئے تھے۔ ہرمزد کے عقائد کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن تعجب نہیں کہ وہ شیعہ ہو اور اپنے خاندانی طریقہ کو چھوڑ کر مرزا کا شیعہ ہونا شاید اسی کی صحبت کا نتیجہ ہے۔

شادی

مرزا کی شادی ۱۲۲۵ھ میں نواب الٰہی بخش خاں معروف کی لڑکی سے ہوگئی اور اسی بنا پر مرزا نے آگرہ کو چھوڑ کر دہلی کی سکونت اختیار کرلی۔ اور پھر آخر عمر تک وہیں رہے۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف ایک خاندانی رئیس اور دربار شاہی کے نہایت مقرب درباری تھے اور بڑے مشہور اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ اپنی عمر کی درازی کی وجہ سے سات شاعروں کی نظر سے اپنا کلام گزار چکے تھے۔

مرزا کی آزاد منشی اور وارستہ مزاجی کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہے اپنے لئے کبھی کوئی مکان نہیں خریدا اسی طرح مطالعہ کیلئے بھی باوجودیکہ ساری زندگی تصنیف کے شغل میں گزری کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی ہمیشہ کرایہ پر کتابیں منگوا کر پڑھتے رہتے تھے۔

معاش

مرزا کو اپنے چچا نصر اللہ بیگ کی وفات کے بعد جو ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ پنشن ملتی تھی وہ غدر تک تو ملتی رہی لیکن جب انگریزوں نے دوبارہ دہلی کو فتح کیا تو یہ پنشن مرزا کے قلعہ سے تعلقات کی بنا پر تین برس تک بند رہی۔ علاوہ بریں بہادر شاہ کی طرف سے جو پچاس روپیہ ماہوار خاندان تیموری کی تاریخ نویسی کے عوض میں ملتے تھے ان کا ملنا بھی موقوف ہوگیا۔ غرضیکہ دو سال کا زمانہ مرزا نے نہایت عسرت کی حالت میں بسر کیا مگر دو سال کے بعد نواب یوسف علی خاں مرحوم رئیس رامپور نے سو روپیہ ماہانہ ہمیشہ

کے لئے مقرر کر دیا جو نواب کلب علی خاں مرحوم نے بھی مرزا کے آخر دم تک جاری رکھا اور غدر سے تین برس بعد جب مرزا ہر ایک الزام سے بری ثابت ہوئے تو سرکاری پنشن بھی جاری ہو گئی تاہم ان کو وہ فارغ البالی نصیب نہ ہوئی جو ان کے خاندان اور کمال کے شایاں تھی مگر مرزا کبھی اس کیلئے دل تنگ نہیں ہوئے۔

اولاد و شاگرد

مرزا کے یہاں سات بچے پیدا ہوئے مگر کوئی زندہ نہیں رہا۔ غدر سے چند سال پہلے جب مرزا کی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کا انتقال ہو گیا تو مرزا نے انکے دو بیٹوں کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا۔ وہ ان کو حقیقی اولاد سے بھی بڑھ کر عزیز رکھتے تھے مگر مرزا کی وفات کے بعد دونوں عین جوانی کے عالم میں وفات پا گئے۔ عارف سے مرزا صاحب کو غایت درجہ کی محبت تھی۔ قرابت کے علاوہ وہ مرزا کے نہایت خوش فکر شاگرد تھے اور باوجود پُرگوئی کے نہایت خوشگو تھے انہیں کے مرنے پر مرزا نے وہ درد انگیز اور مشہور غزل لکھی ہے جس کا ایک شعر یہ ہے۔

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

عارف کے علاوہ مرزا کے اور بھی کئی مشہور و معروف شاگرد ہیں۔ مثلاً

۱۔ نواب ضیاء الدین خاں جو اُردو میں رخشاں اور فارسی میں نیّر تخلص کرتے تھے۔
۲۔ مرزا قربان علی بیگ سالک جن کا کلیات طبع ہو گیا ہے اور مطالعہ کے قابل ہے۔
۳۔ منشی ہرگوپال تفتہ اکبر آبادی جنہوں نے فارسی کے چار ضخیم دیوان یادگار چھوڑے
(۴) میر مہدی حسین مجروح جن کا دیوان چھپ چکا ہے اور جن کے نام اکثر خطوط مرزا کے عود ہندی میں درج ہیں۔

۵- شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی جن کی تصنیفات مشہور و مقبول ہیں اور جنہوں نے مرزا کی مفصل سوانحعمری "یادگار غالب" لکھی ہے جن کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا۔

۶- نواب علاؤالدین خاں علائی ۷- محمد زکریا خاں زکی۔
۸- مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی ۹- حافظ محمد خاں شہید۔
۱۰- عاشق حسین خاں عاشق ۱۱- میاں داد خاں سیاح۔
۱۲- نواب شہاب الدین خاں ثاقب ۱۳- قمر الدین خاں راقم۔
۱۴- عزیز ۱۵- آگاہ ۱۶- ادیب ۱۷- مقصود- ۱۸- سخن- ۱۹- شائق- ۲۰- طالب

تصنیفات

مرزا کی تصانیف تقریباً تمام طبع ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔ مثلاً

۱- دیوان غالب ۲- کلیات نظم و نثر فارسی ۳- عود ہندی ۴- اردوئے معلّیٰ ۵- قاطع برہان
۶- تیغ تیز ۷- نامۂ غالب ۸- پنج آہنگ ۹- مہر نیمروز ۱۰- دستنبو ۱۱- گل رعنا ۱۲- لطائف غیبی
۱۳- سبد چین- وغیرہ متفرق رسالے۔

حلیہ

مرزا جوانی میں شہر کے نہایت حسین و خوبرو جوانوں میں شمار ہوتے تھے اور بڑھاپے میں بھی ان کی شباہت سے حسن و خوبصورتی کے آثار نمایاں طور پر معلوم ہوتے تھے اور اس حالت میں بھی وہ ایک نووارد تورانی معلوم ہوتے تھے۔

اخلاق و عادات

مرزا اپنے اخلاق و عادات کے لحاظ سے اگلے زمانے کے شرفا کی وضع و صفات کا ایک بہترین نمونہ تھے وہ ایسے وسیع الاخلاق تھے کہ انکے حلقۂ احباب میں ہر مذہب و ملت کے بیشمار دوست تھے اور حالت بیماری میں بھی وہ اپنے دوستوں کے خطوط کا جواب برابر دیا کرتے تھے اور غزلوں کی اصلاح سے بھی باز نہ آتے تھے۔ فراخ حوصلگی اور سخاوت کا یہ عالم تھا کہ سائل انکے دروازے سے بہت کم خالی ہاتھ جاتا تھا۔ وہ غریبوں اور محتاجوں کی امداد اپنی وسعت سے زیادہ کرتے تھے اسلئے خود تنگ رہتے تھے۔

خودداری کی یہ کیفیت تھی کہ بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے اور عمائدین شہر میں سے جو لوگ انکے ہاں نہیں آتے تھے وہ بھی کبھی انکے مکان پر نہیں جاتے تھے اور یہ قصہ تو عام طور پر مشہور ہے کہ جب دہلی کالج کی پروفیسری کے لئے بلائے گئے تو مرزا صرف اتنی بات پر واپس آگئے کہ مسٹر ٹامسن جو ممالک مغربی و شمالی کے لفٹنٹ گورنر بھی رہ چکے تھے مرزا کے استقبال کو نہیں آئے۔

ان صفات کے علاوہ مرزا حد درجہ کے حق پسند۔ راست گفتار۔ مرنجاں مرنج اور غیر متعصب بزرگ تھے چنانچہ کوئی شخص انکے عقائد سے پورے طور پر واقف نہ ہو سکا۔ سوائے اسکے کہ انکو اہلبیت رسالت سے بیحد عشق اور عقیدت تھی۔ غالباً مرزا تفضیلی شیعہ تھے لیکن مولانا فخر الدین قدس اللہ سرہ کے خاندان کے مرید بھی تھے اور انتقال کے بعد نواب ضیاء الدین خاں نے تجہیز و تکفین کے تمام مراسم عقائد اہل سنت والجماعت کے مطابق ادا کئے تھے۔

باوصف ان تمام خوبیوں اور صفات کے بر بنائے آزادہ روی و رندانہ مزاجی مرزا کے شغل شراب اور اسکے متعلق بہت سی حکایات اور لطیفوں کا ذکر آبحیات مولانا آزاد اور یادگار غالب حالی میں موجود ہے علاوہ بریں مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کا بہت شوق تھا اور جب کبھی چوسر کھیلا کرتے تھے تو برائے نام کچھ بد کر کھیلا کرتے تھے اسی چوسر کی وجہ سے ۱۲۶۴ھ ۱۸۴۷ء میں کوتوال شہر کی دشمنی سے مرزا کو کچھ دنوں قید کی سختی بھی برداشت کرنی پڑی۔

مرزا ایک تو اس زمانے میں بیمار اور کمزور تھے دوسرے ایک معزز اور خاندانی آدمی کیلئے اس طرح جیل میں جانا انتہائی توہین اور بے آبروئی تھی ان پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ چنانچہ مولوی کریم الدین تذکرۃ الشعراء میں لکھتے ہیں۔

"ان دنوں سرکار کی طرف سے ان پر ایک بڑا حادثہ گذرا ہے جسکے سبب انہیں رنج لاحق ہے۔"

اور تفتہ کے نام بھی انہوں نے ایک خط میں لکھا ہے کہ یہ بہت بڑا دھبّہ رہ گیا۔ قید کے زمانے میں انہوں نے ایک ترکیب بند لکھا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مصیبت کیوقت نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے ان کی بڑی مدد کی اور مرزا نے نواب مصطفےٰ خاں کی تعریف میں جو زبردست فارسی قصیدہ لکھا ہے اس میں بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے ؎

بشنود بے آنکہ باد آں را برد
نالہ گر در کنج زنداں مے زنم

مولانا حالی فرماتے ہیں کہ مرزا کو قید کی پوری میعاد بھگتنی نہیں پڑی اور قریباً تین مہینے کے بعد ہی رہا ہو گئے۔ رہائی کے بعد وہ بہادر شاہ کے مرشد کالے خاں صاحب کے مکان پر مقیم تھے اور انہیں کی سفارش سے دربار میں باریاب ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ باریابی سے پہلے وہ بہت سے قصیدے کسی کی معرفت دربار میں پیش کر چکے تھے اور وہاں سے انہیں تحفے تحائف بھی جاتے تھے لیکن ابھی باریابی کی نوبت نہ آئی تھی چنانچہ ایک فارسی قصیدے میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

خواہیم قرب شاہ ولیکن دریں مراد
عبرت ز نامرادیٔ سنجر گرفتہ ایم

بعض تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوق اور انکے معاونین مرزا کی کوششوں میں روڑے اٹکاتے تھے چنانچہ مرزا کا وہ فارسی قطعہ جس کا ذیل کا شعر بہت مشہور ہے اور جس میں سوائے ذوق کے اور کوئی مخاطب نہیں اسی زمانے کی یادگار ہے ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

دربار میں مرزا کے باریاب ہونے کی صحیح تاریخ لکھنا تو مشکل ہے لیکن اتنا یقینی ہے کہ یہ باریابی بہادر شاہ کے مرشد شاہ نصیر الدین عرف کالے شاہ کی وساطت سے ہوئی چنانچہ مرزا مہر نیمروز کے آغاز میں لکھتے ہیں:۔

"پس از پنجاہ سالہ آوارگی کہ تیزی رفتار من از سبحہ و بیت خانہ گرد انگیخت و خانقاہ و میکدہ بہ یک دگر زد بفروغ ازاں فرۂ ایزدی کہ فریدوں را بفرتاب دادگری دل افروخت و مرا فرہنگ سخن گستری آموخت۔ بداں در فرود آمدم کہ تو نیز چوں حلقہ چشمے بداں در داری و نوائی کہ دیدہ برداری۔ دیوار کاخ والا پایہ ہما سایہ بیدار دل دیدہ ور قدسی سرشت گہر جادہ شناس راہ سیر و سلوک راہ نمائے جادۂ فقر و فنا مشاہدہ شہود و شاہد یقین مولانا محمد نصیر الدین را نازم کہ ہر کہ بسایۂ آں دیوار ہمایوں آثار گام زند شگفت کہ در سایۂ خویش در فرودیں افگند نخست آیۂ رحمت کہ بر من از بالا فرود آمد رو دادن تجستگی زمیں بوس گیہاں خدیو خداداں بود و دولت روئے آورد بخت از خواب جست ــــــــ"

۱۸۵۰ء میں مرزا بادشاہ کے درباری مورخ کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اسکے کچھ عرصہ بعد ولیعہد شہزادہ فتح الملک نے انہیں اپنا استاد منتخب کیا اور چار سو روپیہ سالانہ مشاہرہ مقرر کر دیا۔ ولیعہد نے غالب کے قدیمی دشمن نواب شمس الدین کی بیوہ سے نکاح کیا تھا اور ظاہر ہے کہ مرزا کی ادبی شہرت بہت مستحکم ہو گئی ہو گی جو ولیعہد بہادر نے تمام پچھلے واقعات سے چشم پوشی کر کے مرزا کو اپنا استاد منتخب کیا۔

ولیعہد کی تعریف میں مرزا نے چند قطعات اور تین بلند پایۂ فارسی قصائد لکھے ہیں اُن میں سے ایک کی تشبیب میں "روز ازل" کی دلچسپ روداد لکھی ہے۔ دوسرا قصیدہ رودکی کے قصیدہ کی

بحر میں ہے۔ مرزا کا یہ اعزاز اور خوش نصیبی عارضی ثابت ہوئی کیونکہ دو سال بعد ولیعہد کا انتقال ہو گیا۔ ویسے مرزا کی زندگی اب نسبتاً آرام سے گزرتی تھی۔ مالی حالت قدرے بہتر تھی۔ قلعہ سے بھی تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ شاہزادوں میں کوئی نہ کوئی ہر ہفتے مشاعرہ منعقد کراتا۔ وہ اس میں اُردو غزلیں پڑھتے اور چونکہ ان کا موجودہ رنگ مقبول عام تھا تعریفیں ہوتیں۔ ذوقؔ سے بھی اب اُن کے تعلقات نسبتاً خوشگوار تھے۔ آہستہ آہستہ یہ مجلس بھی برہم ہوتی گئی۔

۱۸۵۲ء میں مومن خاں کا انتقال ہو گیا اور اُس کے دو سال بعد ۱۸۵۴ء اکتوبر میں ذوقؔ بھی چل بسے۔ مشہور شعراء میں صرف غالبؔ زندہ تھے۔ چنانچہ بادشاہ کے اشعار کی اصلاح ان کے سپرد ہوئی۔ بادشاہ کے اشعار کی اصلاح مرزا نے دو تین برس کی ہو گی۔ اس سلسلہ میں انہیں ملک الشعراء یا اس طرح کا کوئی اور خطاب نہیں ملا۔ مرزا بادشاہ کے اُستاد تو ہو گئے تھے۔ لیکن اب سلطنت کا شیرازہ ہی بکھر رہا تھا مرزا حکام رس تھے اور ان باتوں سے بے خبر یا غافل نہ تھے ۱۸۵۲ء میں جب بادشاہ بیمار تھے تو وہ اپنے مستقبل کی طرف سے متردد تھے چنانچہ اس زمانہ میں منشی ہیرا سنگھ کو لکھا: "از شب عید خاقان رنجور است۔ حالا دیگر چہ رو نماید و من کہ در سایہ دیوارش غنودہ ام چہ رود"

وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ بہادر شاہ کے بعد شاہی سلسلہ تو ختم ہو جائے گا اپنا مستقبل انگریزی حکام سے وابستہ کرنا چاہیئے چنانچہ انہوں نے فرمانروائے انگلستان ملکہ وکٹوریہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھ کر لارڈ کیننگ کی معرفت ولایت بھجوایا اور اُس کے ساتھ ایک عرضداشت تھی کہ روم و ایران کے بادشاہ شعراء پر بڑی بڑی عنایتیں کرتے تھے۔ اگر شہنشاہ انگلستان مجھے خطاب، خلعت اور پنشن سے سرفراز کرے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ مرزا کو اس عرضداشت کا جواب اخیر جنوری ۱۸۵۷ء میں مسٹر رسل برک کی طرف سے ملا کہ درخواست پر تحقیق کے بعد خطاب اور خلعت وغیرہ کے متعلق

حکم صادر ہوگا۔ مرزا کے لئے یہ جواب نہایت حوصلہ افزا تھا اور وہ معلوم نہیں امیدوں کے کیسے کیسے قلعے باندھ رہے تھے۔ کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو غدر ہوگیا۔ مرزا نے اپنے اُردو رقعات میں اپنے اور اپنے دوستوں پر جو اس پر آشوب دَور میں گزری اس کی داستان قدرے تفصیل سے لکھی ہے۔

شعر و سخن کے باب میں مرزا کو اپنے کمالِ فن پر بہت ناز تھا اور وہ خسرؔو اور فیضی کے سوا ہندی شعرا میں سے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے چنانچہ جس زمانہ میں مرزا اپنی پنشن کے سلسلے میں کلکتہ گئے ہیں اور وہاں کے بعض لوگوں نے انکے اشعار پر اعتراض کر کے مرزا قتیل کا قول سند پیش کیا تو آپ نے مثنوی "بادِ مخالف" لکھی جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:۔

اے تماشایانِ ژرف نگاہ ہاں بگوئید حسبۃً للّٰہ
دامن از کف کنم چہ گونہ رہا طالبؔ و عرفیؔ و نظیریؔ را
خاصہ روحِ روانِ معنی را آں ظہوریؔ جہانِ معنی را
فتنۂ گفتگوئے ایشانم مست لائے سبوئے ایشانم
آں کہ طے کردہ ایں مواقف را چہ شناسد قتیل و واقف را

وفات

مرزا نے تہتّر برس چار مہینے کی عمر پائی اور ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء ۱۵ فروری کو انتقال کیا۔ تجہیز و تکفین نواب ضیاء الدین احمدؒ خاں کی طرف سے ہوئی اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیا قدس سرہٗ میں دفن ہوئے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ مرزا کا مزار اپنے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کے پائین مزار واقع ہے۔

ع۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

پروفیسر محمدؒ عنایت اللّٰہ ایم۔ اے

مقدمہ

غالب کی شاعری

غالب کی شاعری کی عظمت کا اندازہ کچھ وہی لوگ پورے طور پر لگا سکتے ہیں جنہیں مبداءِ فیاض نے ذوق سلیم اور وجدان صحیح کا معتد بہ حصہ عطا کیا ہے۔ ایسے بابرکت نفوس میں فطرتی طور پر وہ تمام قوتیں موجود ہوتی ہیں جن کی امداد سے وہ اپنی کوششوں کو کارآمد اور عین ضروریات کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ غالب کے زمانہ تک شاعری ایک ہی طریق پر چلی آرہی تھی اور اس میں جدت کا ایک پہلو تقریباً مفقود ہو چکا تھا اور جو راگ ایک مدت سے الاپا جا رہا تھا اسے سن سن کر سامعین کی بے لطفی بیزاری کی حد تک پہنچ چکی تھی ایک ہی لقمہ تھا جو ہزاروں منہ میں چبایا جا چکا تھا اس میں ذائقہ مطلق نہ رہا تھا جس سے دماغ اور روح مسرت حاصل کر سکے۔ غالب کی دوربین نظروں نے شاید اس نقص کو پہلے ہی دریافت کر لیا تھا اور انہیں عامیانہ طرز سخن کی تقلید کی زنجیر توڑ ڈالنے کی ضرورت ابتدا ہی میں محسوس ہو چکی تھی اسلئے اپنے واسطے انہیں ایک نیا اور بالکل جداگانہ رستہ تلاش کرنا پڑا۔ پرانی لیک کا چھوڑنا کوئی معمولی بات نہ تھی اس کام میں انہیں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بایں ہمہ ان کی معنی آفریں طبیعت نے ان کے لئے بالآخر ایک ایسی شاہراہ پیدا کر دی جسے ہم صراط مستقیم خیال کر سکتے ہیں۔

ہم غالب کو اردو شاعری کا موجد تسلیم نہیں کرتے لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ وہ اردو شاعری کے مصلح اعظم تھے انہوں نے اردو شاعری کی قدیم خصوصیات قائم رکھنے کے ساتھ ہی اس میں وہ تغیرات پیدا کر دیئے جو کسی شے کی درستی اور اصلاح میں ظہور پذیر ہونا لابدی ہیں۔

بعض تذکروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالفوں نے کس کس طریق سے غالب کی چلتی گاڑی میں روڑے اٹکانے

کی فکریں کی ہیں لیکن مشاہیر کا خاصہ طبیعت بھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی چیز کو اپنے ارادہ میں سدِّ راہ نہیں ہونے دیتے غالب بھی دھن کے پکے تھے ورنہ انکی کوششیں عام مذاق کی خرابی کا انسداد نہ کرسکتیں۔ بہرکیف غالب کامیاب ہے اور عزم و استقلال کے ہاتھوں انہوں نے تاریخ اُردو میں عظمت و شہرت کے وہ پائدار نقوش چھوڑے ہیں جو ہمیشہ اپنی ضوفشانی سے ان کا نام چمکاتے رہیں گے۔

جب ہم غالب کی ابتدائی اور بے اصول تعلیم کا خیال کرتے ہیں اور پھر انکی طبع رسا کی جودت اور فکر عالی کی رفعت کا اندازہ کرتے ہیں تو کامل یقین ہوجاتا ہے کہ بے شبہ وہ ماں کے پیٹ سے ایک فلسفی شاعر پیدا ہوئے تھے۔ غالب کی فارسی زبان کی لیاقت ایک اجتہادی رتبہ کی تھی اور ہندوستان میں فارسی زبان کا ماہر لسان امیر خسرو اور فیضی کے بعد غالب کے پایہ کا شاید ہی نظر آئے۔ انہیں فارسی زبان پر جو عبور اور قدرت حاصل تھی اُس کا ایک کرشمہ انکے فارسی کلام سے ظاہر ہوسکتا ہے۔ الفاظ کا استعمال، محاورات کی صحت، زباندانی وغیرہ امور کے لحاظ سے وہ فارسی کے بہترین ادیب اور مستند ماہر کہے جاسکتے ہیں اور اسی دستگاہ کی جھلک اُنکے اردو کلام میں موجود ہے اور یہی وجہ تھی کہ بعض ناسمجھ اور کم علم لوگ انکے ابتدائی کلام کو دیکھ کر مہمل کہہ دیا کرتے تھے۔

غالب کے سوانح حیات اور انکے کلام پر تنقید کے سلسلے میں تین مستقل کتابیں لکھی گئی تھیں۔ یادگار غالب از حالی محاسن کلام غالب از ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اور ڈاکٹر لطیف کی کتاب۔ اب چوتھی کتاب مولانا غلام رسول مہر مدیر روزنامہ "انقلاب" نے لکھی ہے جہاں تک سوانحی حالات کا تعلق ہے مولانا حالی سے کوئی آگے نہیں بڑھا اور تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی غالب کی اُردو نثر اور فارسی نظم و نثر پر کوئی تبصرہ یادگار غالب سے بہتر نہیں البتہ مرزا کے اُردو کلام کے متعلق بہت کچھ لکھا جاچکا ہے یادگار کے بعد بقول فاضل مصنف "غالب نامہ" ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا مقدمہ ہے اور یہ بھی ایک قابل ذکر تصنیف ہے ایک نئی طرز تحریر اور زور عبارت کے نقطۂ نظر سے اور دوسرے کلام غالب کے کئی پہلوؤں پر جو تبصرہ انہوں نے کیا ہے وہ انکے وسیع مطالعہ پر مبنی معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر لطیف کی کتاب درحقیقت محاسن کلام غالب کا جواب ہے تاہم انہوں نے یہ کتاب لکھ کر اُردو ادب پر بہت احسان کیا ہے۔

چوتھی کتاب "غالب" مولانا غلام رسول مہر کی تالیف ہے یہ کتاب بھی دورِ حاضر کی بہترین کتابوں میں سے ہے اور مرزا غالب کی ایک مستند سوانحعمری ہے جو فاضل مؤلف نے خود مرزائے ممدوح کے کلام نظم و نثر سے اخذ کی ہے اور مرزا کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

مولانا حالی نے کلام غالب کی چار خصوصیتیں بیان فرمائی ہیں ایک تو جدت مضامین اور طرفگی خیالات اور ایسی تشبیہات کا استعمال جو نہ صرف نئی تھیں بلکہ اظہار مطالب کیلئے بھی موزوں تھیں۔ دوسری استعارہ کنایہ کا استعمال تیسری شوخی و ظرافت چوتھی خصوصیت جسے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے بہت پسند کیا ہے یعنی ایسے اشعار جنکے سمجھنے کیلئے ذہن پر زور دینا پڑے۔ مولانا حالی نے ان تمام خصوصیات کو مثالوں سے واضح کیا ہے ڈاکٹر بجنوری نے ان مثالوں میں اضافہ کیا ہے اور اپنی کتاب کے باب نہم میں ان تشبیہات کی مثالیں دی ہیں جو غائر مشاہدۂ فطرت پر مبنی ہیں۔

مرزا غالب درحقیقت تشبیہ و استعارہ کے بادشاہ تھے اور دنیا کے شاید ہی کسی شاعر کے کلام میں نئی اور موزوں تشبیہات اور استعارات کی وہ افراط ہو جو ان کے کلام میں ہے۔

غالب نامہ کے مصنف نے مرزا غالب کی شاعری کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے اور اسی تقسیم کے مطابق غالب نامہ میں دیوان غالب کو ترتیب دیا ہے۔ دور اول میں وہ اشعار ہیں جو مرزا نے پچیس برس کی عمر سے پہلے لکھے اور وہ قلمی نسخہ بھوپال کے متن میں درج ہیں۔ دور دوم میں وہ اشعار ہیں جو قلمی نسخہ بھوپال کے متن میں درج نہیں لیکن دیوان غالب کے پہلے مطبوعہ ایڈیشن میں موجود ہیں۔ دور سوم میں اس زمانہ کے اشعار ہیں جب مرزا کی توجہ بیشتر فارسی شعرگوئی کی طرف تھی ان اشعار کی تدوین کیلئے سب سے مفید دیوان غالب کا وہ قلمی نسخہ ہے جو لالہ چھجمل کے ہاتھ کا لکھا ہوا بانکی پور لائبریری میں ہے۔ دور چہارم مرزا کی شاعری کا درباری دور ہے اور دور پنجم میں وہ اشعار ہیں جو غدر کے بعد لکھے گئے ہیں۔

دور اول کی خصوصیات۔ پہلے دور میں فارسی الفاظ اور تراکیب کی کثرت سے زبان زیادہ ثقیل ہے مضامین بھی عجیب و غریب ہیں جو عام مشاہدہ اور دنیائے شاعری سے دور معلوم ہوتے ہیں اور جن کا سمجھنا آسان کام نہیں

دور دوم کی خصوصیات۔ دوسرے دور میں مرزا بیدل کی تقلید ترک کر چکے تھے اور زبان و خیال کے لحاظ سے انکے کلام میں وہ خصوصیات پیدا ہو گئی تھیں جو دوسرے دور کیلئے مابہ الامتیاز ہیں اس دور میں آئینہ طبیعت بہت

مجلی معلوم ہوتا ہے فارسی تراکیب بہت کم استعمال کی گئی ہیں اور خیالات بھی صاف اور خوشگوار ہیں کلام میں بیدل اور صائب کی بجائے عرفی اور نظیری کا رنگ غالب ہے تشبیہات نیچرل اور موزوں ہیں اور اس دور کی سب سے اہم خصوصیت نفسیات انسانی کے متعلق شاعر کی معلومات ہیں۔

دور سوم کی خصوصیات۔ تیسرے دور میں مرزا نے اپنا اردو دیوان منتخب کیا اور اشعار کی کمی بیشی کے علاوہ الفاظ اور تراکیب میں ترمیم کی یہ حک و اضافہ مرزا کی شاعری کے مطالعہ کے لئے بہت دلچسپ ہے۔ ان میں سے بیشتر اصلاحیں زبان کو سادہ بنانے کے لئے کی گئی ہیں۔ اور دقیق فارسی الفاظ یا تراکیب کی جگہ آسان الفاظ رکھ دیئے ہیں یا جن الفاظ میں خود شاعر کے اپنے خیال کے مطابق کچھ سقم تھا انہیں بدل دیا ہے۔

دور چہارم کی خصوصیات۔ چوتھا دور مرزا کی شاعری کا درباری دور ہے اس زمانے میں مرزا نے کئی فارسی قصائد لکھے اور ایک آدھ فارسی غزل بھی اس زمانہ کی یادگار ہے لیکن دربار سے تعلق استوار کرنے کیلئے اُنہیں درباری زبان کو اپنی زبان بنانا پڑا اور اس زمانہ کے اکثر اشعار اُردو میں بیشتر غزلیں وہ ہیں جو مرزا نے بادشاہ کو خوش کرنے یا قلعہ کے مشاعروں میں پڑھنے کیلئے لکھیں ان کے علاوہ بادشاہ کی تعریف میں کئی قصائد اور قطعات بھی ہیں لیکن ان دور کی صحیح یادگار اُردو غزلیں ہیں جہاں تک زبان کا تعلق ہے یہ دور مرزا کی پختگی کا دور ہے

دور پنجم کی خصوصیات۔ پانچواں دور مرزا کی شاعری کا آخری دور ہے جو ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں مرزا نے جو اشعار کہے ہیں وہ طرز نگارش اور خیالات کے لحاظ سے اُن کے درباری دور کے اشعار سے مشابہ ہیں۔ کلام میں سادگی اور شوخی ہے۔ دور از کار تشبیہات کی بھرمار نہیں۔ مرزا نے اس زمانہ کی جن اُردو و فارسی غزلیات کو اپنے خطوط میں درج کیا ہے وہ شاعرانہ نقطۂ نظر سے مرزا کے بہترین کلام کے ہم پایہ ہیں۔

غالب کی مقبولیت کے اسباب

غالب کی غیر معمولی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کا حیرت انگیز تنوع ہے جسے ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے نہایت نفیس طریقہ سے بیان کیا ہے "لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحات ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں موجود نہیں؟ کلام غالب میں نا

باتوں کا بیان نہیں بلکہ غالب کے دلی جذبات کا آئینہ ہے جو کچھ وہ خود محسوس کرتا ہے اسے صاف صاف بیان کر دیتا ہے اسی لئے اسکے کلام میں وہ خاص جوش و اثر پایا جاتا ہے جو کسی راستباز شخص کے بیان میں ہونا چاہیئے۔ غالب وحدت وجود کا قائل معلوم ہوتا ہے اسکے عقیدے میں حقیقی وجود صرف ایک ذات یا ہستی کا تھا جسکے پرتو و مظاہر کے مجموعہ کا نام عالم ہے اسی بنا پر دنیا کی شہرت و عزت و دولت و جاہ کی مطلق وقعت اسکے ذہن میں نہ تھی چنانچہ اپنے ایک عزیز شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں لکھتا ہے

"تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں بوعلی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بیفائدہ اور موہوم جانتا ہوں زیست بسر کرنے کو تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت، سلطنت، شاعری اور ساحری سب خرافات ہیں ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا کچھ معاش ہو اور صحت جسمانی باقی سب وہم ہے اے یار جانی۔ ہر چند کہ وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اس پایہ پر ہوں شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جاوے اور درجہ معیشت اور صحت و راحت سے گذر جاؤں عالم بیرنگی میں گزر پاؤں جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں، ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیئے جاتا ہوں یہ دریا نہیں ہے، سراب ہے ہستی نہیں ہے پندار ہے ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں مانا کہ حافظ و سعدی کے برابر مشہور ہوگئے انکو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہمکو تمکو ہوگا۔" لہ

ایک اور دوست کو جنہوں نے کسی رئیس کے متعلق لکھا تھا کہ وہ حکیمانہ اصول کے مطابق رہتا ہے غالب نے یوں مخاطب کیا ہے

"اینکہ گفتی فلانے روش حکیمانہ دارد و دنیا را کار آگاہانہ میگذارد ایں ہمہ ندو ستائی خندہ ام در گرفت و عناں ضبط خویش از کفم بدر رفت ندانی بر اسپاں بار رفتار نشستن و گروہا گروہ مردم اپیشا پیش دوانیدن۔ تن را بلباس رنگا رنگ بر آراستن و معدہ را بہ الوان خوردنی ممتلی گردانیدن نشہ را از اندازہ بیروں راندن غبار معصیت بر فرق افشاندن از حکما نیاید و بزرگاں را نشاید کار دانشوراں چیست جز از آبادی در بن کوہے نشستن و از شش جہت در بروئے خلائق بستن تن را بہ ریاضت فرسودن و جاں را بخردی پالودن ہر کہ حکیم خرد گزیں است کار و بارش ایں است۔"

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی زود فنائی، دنیا کی بے ثباتی موجودات عالم کی بے حقیقی یہ سارے خصوصیات ایک پختہ یقین یک قلبی اذعان ایک مستحکم عقیدہ کی طرح غالب کی عملی زندگی کے جزو لاینفک بنگئے تھے اور جنکی

جو ایک بیساختہ اسکی خاص نجی تحریروں میں بھی نظر آجاتی ہے یہی وجہ ہے کہ غالب کے یہاں آمد مضامین اسکے کلام کے چہرہ پر حسن و لطافت کے قدرتی خط و خال بنکر چمکتے ہیں لیکن انہیں مضامین کو جب دوسرے باندھتے ہیں تو وہ انکی صنعت سازیاں ظاہر ہونے لگتی ہیں مزید براں جو آمد بیساختگی اور تاثیر غالب کے کلام میں ہے، وہ اوروں کو نصیب نہیں اسلئے کہ یہ فطرت انسانی کا قانون ہے کہ جو باتیں دل سے نکلتی ہیں وہ دل ہی میں جاکر بیٹھتی ہیں۔

غالب جس شریعت کا راہبر ہے اسکی تلقین یہ ہے کہ عالم بذات خود کوئی مستقل ہستی نہیں رکھتا اس کا وجود جو کچھ ہے وہ محض ذہنی یا خیالی ہے وہ لکھتا ہے کہ جس طرح عنقا کا وجود ہم نے خواہ مخواہ فرض کر لیا ہے اسی طرح کائنات کا وجود موہوم ہے ؎

ز وہم نقش خیالی کشیدہ ورنہ　　　وجود خلق چو عنقا بدہر نایاب است

اسی طرح ایک غزل کے مسلسل اشعار میں کائنات کی مختلف موثر چیزوں مثلاً آسمان، سمندر، بیاباں، خزاں بہار، وغیرہ کو الگ الگ گنوا کر بتایا ہے کہ جو کچھ ہمیں نظر آرہا ہے سب اوہام کی کرشمہ سازیاں ہیں وہم نے آنکھوں میں خاک ڈالدی اسے بیاباں کہنے لگے ایک قطرہ پانی کی صورت میں بہا اسکا نام ہمنے سمندر رکھ لیا ورنہ خارج میں ان چیزوں کا کچھ وجود نہیں

دود سودائے تتق بست آسماں نامیدمش　　　دیدہ بر خواب پریشاں زد جہاں نامیدمش
وہم خاکے ریخت در چشم بیاباں دیدمش　　　قطرہ بگداخت بحر بیکراں نامیدمش
باد دامن زد بر آتش نو بہاراں خواندمش　　　داغ گشت آں شعلہ از مستی خزاں نامیدمش

ایک جگہ ایک لطیف تشبیہ کے ساتھ اس خیال کو ادا کیا ہے کہ عالم کے وجود وہمی و غیر حقیقی کو کبتک حقیقی تصور کیا جائے۔

عالم غبار وحشت مجنوں ہے سر بسر　　　کب تک خیال طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

اشعار ذیل میں مختلف اسلوب سے عالم کے وجود وہمی اور مافی العالم کی بے حقیقتی کو کس قدر دلنشیں پیرایہ میں بیان کیا ہے ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے　　　ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک　　　اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے
جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور　　　جز وہم نہیں صورت اشیا مرے آگے

ذیل کا شعر کسقدر رنگین ہے اور اسکے پڑھنے سے اثر کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اسکی نظیر خود غالب کے کلام میں نہیں ملتی۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد   عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

"عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے" اس مصرعہ کو معانی مختلفہ کے لحاظ سے بار بار پڑھو اور فیصلہ کرو کہ کیا برکلے کے متبع کو اس پر ایک نقطہ کے اضافہ کی بھی گنجائش ہے؟ کیا حکمائے مشککین اپنے سارے ادب میں کوئی بات اس سے زیادہ جامع اور اس سے زیادہ باوزن دکھا سکتے ہیں؟ اس مفہوم کو کئی جگہ پر اس سے بھی زیادہ صاف کر دیا ہے۔ مثلاً

یاں کھائیو مت فریب ہستی   ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب   آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

علاوہ ازیں غالب ایک نہایت ہی موثر انداز میں حیات انسانی کے سریع الزوال ہونے پر اسطرح توجہ دلاتے ہیں ؎

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غالب   گرمیٔ بزم ہے بس رقص شرر ہونے تک

سترھویں صدی عیسوی میں ایک انگریز فلاسفر برکلے نے یہ مذہب قائم کیا تھا کہ عالم مادی کوئی قائم بالذات شے نہیں مستقل ہستی صرف ذہن کی ہے بحر و بر، شجر و حجر آسمان و زمین جتنی اشیا ہم محسوس کرتے ہیں یہ سب ذہن آفریدہ ہستیاں ہیں یعنی ان سب کا وجود ذہن کے ساتھ وابستہ و مشروط ہے اور اگر ذہن فنا ہو جائے تو یہ تمام چیزیں بھی لباس وجود سے معرا ہو جائیں۔ غالب کے کلام کا جو نمونہ اوپر پیش کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حیثیت سے غالب برکلے کا ہمنوا ہے لیکن وہ اس امر کا قائل نہیں کہ مستقل قائم بالذات ہستی ذہن کی ہے اسکے عقیدہ میں جو واحد شے قائم بالذات ہے وہ نہ روح ہے نہ مادہ نہ جسم ہے نہ ذہن بلکہ ان تمام قیود سے معرا ایک ہستیٔ مطلق ہے جو خلق و فنا کے قوانین سے مستثنیٰ ہے جو ازلی و ابدی ہے اور اشیائے عالم تمام تر اسکے مظاہر ہیں جسطرح آفتاب کی شعاعیں کوئی علیحدہ ہستی نہیں رکھتیں اور نہ آفتاب سے خلق ہوئی ہیں بلکہ محض آفتاب کی ایک حالت ظہور کا نام ہیں اسی طرح یہ کائنات بھی ہستی مطلق کی ایک طرح کی جلوہ طرازی اور ایک حالت ظہور آرائی ہے یہ وہی عقیدہ ہے جسے صوفیہ کی اصطلاح میں وحدت وجود کہتے ہیں حکمائے یورپ میں سپینوزا اس کا ایک سربرآوردہ حامی ہو گزرا ہے غالب کے کلام میں اس عقیدہ کی تعلیمات مختلف پیرایوں میں موجود ہے ایک فارسی رباعی میں فرماتے ہیں ؎

اے کردہ بآرائش گفتار بسیچ   در زلف سخن کشیدہ راہ خم و پیچ
عالم کہ تو چیزے دگرش میدانی   ذاتے ست بسیط و منبسط دیگر ہیچ

ایک جگہ بطور تمثیل نصیحت کرتے ہیں کہ جس طرح قطرہ، موج، حباب فی نفسہ کوئی شے نہیں بلکہ سمندر یا دریا کے مختلف مظاہر ہیں اسی طرح اس عالم کی اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں کہ یہ بھی ذات بسیط کے مختلف مظاہر کا مجموعہ ہے ؎

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرۂ موج و حباب میں

وحدت میں کثرت نظر آنا عین وہم پرستی ہے اور حقیقت شناسی کے مذہب میں یہ کفر ہے ؎

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کر دیا کافر اس اصنام پرستی نے مجھے

بحر موجودات کا ایک ایک قطرہ بزبان حال پکار رہا ہے کہ ہم اس بحر بیکراں (ہستی مطلق) کے ایک جزو ہیں ؎

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اُسکے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

جس طرح ذرّہ کی چمک کا سہرا صرف نور آفتاب پر منحصر ہے اسی طرح ہمارا وجود ہستی مطلق کے وجود پر مبنی ہے ؎

ہے تجلی تری سامان وجود
ذرّہ بے پرتو خورشید نہیں

اگر انسان نگاہ نکتہ رس رکھتا ہو تو ممکن کہ اپنی بے حقیقتی اور وجود ہستی مطلق پر مبنی ہونے کا اُسے علم نہ ہو ؎

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہُوا دیدۂ بینا نہ ہُوا

چونکہ بجز ایک ذات بسیط کے اور کوئی شے موجود نہیں ہے اسلئے انسان دنیا کی دیگر مستقل ہستیوں میں جس قدر کھوج کرتا ہے اتنا ہی اصل حقیقت سے بیگانہ ہُوا جاتا ہے ؎

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

غالب کو اسپر حیرت ہے کہ جب سارے عالم میں ایک ہی ذات موجود ہے اور تماشا اور تماشائی دونو ایک ہیں تو مشاہدہ کے کیا معنی ہیں کیونکہ مشاہدہ دو چیزیں (شاہد و مشہود) چاہتا ہے ؎

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیران ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ایک اور موقع پر شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ اس عقیدہ میں اُسقدر غلو سے کام لیا ہے کہ وجود عالم سے قطعی انکار کر بیٹھے ہیں فرماتے ہیں کہ لوگ عالم کو معشوق حقیقی (شاہد ہستی مطلق) کی کمر قرار دیتے ہیں اور معشوق کی کمر چونکہ معدوم ہوتی ہے اسلئے یہ بھی معدوم ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ طرز تعبیر بھی درست نہیں اسلئے کہ یہ کہتے ہیں کہ "عالم معدوم ہے" ہم اس کیلئے لفظ "ہے" استعمال کرتے ہیں جو پھر بھی ایک کلمہ ایجاب ہے۔ حالانکہ ایک

معدوم محض شے کے متعلق اس حد تک بھی ایجابی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم　　　لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

نفس الامر کے لحاظ سے ہر شخص "انا الحق" کہہ سکتا ہے لیکن اس راز کو بر سر عام کہنا تنگ ظرفی ہے ؎

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن　　　ہم کو تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں

اگر ہم کو دنیا میں کسی شے سے وابستگی نہ ہو تو کسی چیز کے ترک کا غم بھی نہ ہو گا مرزا فرماتے ہیں کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ خزاں کا صدمہ نہ اٹھائیں تو بہار کی خوشی بھی چھوڑ دیں۔

شادی سے گذر کہ غم نہ ہووے　　　اردے (موسم بہار) جو نہ ہو تو دے (موسم خزاں) نہ ہووے

اس خیال کی تصدیق روزمرہ کے تجربات سے بھی ہوتی ہے ایک کام جو آغاز عمل میں نہایت تکلیف دہ ناگوار معلوم ہوتا ہے عادت ڈالنے سے رفتہ رفتہ خوشگوار محسوس ہونے لگتا ہے مرزا صاحب نے اس عام تجربہ کو سیدھے سادھے طور پر قلمبند کر دیا ہے ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج　　　مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اس کے ہم معنی یہ مصرعہ ہے ع "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا" اور ہماری زبان میں بطور ضرب المثل مستعمل ہے اس اصول کی بنا پر ایک دانشمند کا ترک لذات و خواہشات ہونا چاہیئے تاکہ ان کے بہم نہ پہنچنے کا رنج اسے کبھی نہ برداشت کرنا پڑے۔ مرزا اس طرز زندگی کو حقیقی جنت سے تعبیر کرتے ہیں۔

غالب روش مردم آزاد جدا است　　　رفتار اسیران رہ و زاد جدا است
ما ترک مراد را ارم مے دانیم　　　واں باغچہ ضبطی شداد جدا است

ترک لذت کا پہلا مقدمہ ترک تعلقات ہے انسان جس وقت تک اہل و عیال کی پابندیوں میں گرفتار ہے ممکن نہیں کہ علائق دنیوی سے آزاد ہو سکے غالب کے نزدیک انسان کا اپنے پاؤں سے اپنی بیڑیوں کا کاٹنا اصل منشاء عبادت ہے ؎

زانجا کہ دلم بہ ہیچ در بند نہ بود　　　با ہیچ علاقہ سخت پیوند نہ بود
مقصود من از کعبہ و آہنگ سفر　　　جز ترک دیار و زن و فرزند نہ بود

رنج و راحت دولت و افلاس دونوں چیزیں سب یکساں طور پر غیر حقیقی ثابت ہو چکیں تو امرا کی نخوت اور مفلسوں کی حسرت مساوی درجہ کی غلطیاں ہیں غالب کو ان دونوں کی حماقت پر ہنسی آتی ہے ؎

خندہ بر غفلت درویش و توانگر دارم　　　آں چرا در طرب و ایں ز چہ رو در تعب است

جبر دولت وغیرہ کی بنا پر تو غرور کرنا نہایت ہی کم ظرفی ہے لیکن اس سے اونچے درجہ کی چیز مذہب ہے مذہب کی آڑ میں اچھے اچھے تعلیم یافتہ و با اخلاق افراد مناقشات میں مصروف رہتے ہیں اور بجائے خود یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی یہ صف آرائیاں حمایت حق میں ہیں لیکن غالب کے اعلیٰ نقطہ خیال سے کفر یا دین کی پابندی بھی محض ایک عصبیت کا ثمرہ ہے جس سے آزاد ہونا ہی عین حقیقت ہے ؎

پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دین تو شود　　　کفر و دیں چیست جز آلایش پندار وجود

غالب کو اگرچہ دنیا کی بے ثباتی اور اشیائے عالم کے اضافی ہونے کا انتہائی یقین ہے تاہم وہ ترک دنیا کی تعلیم نہیں دیتا یہ سچ ہے کہ ان کے کلام میں کہیں کہیں بوئے رہبانیت آنے لگتی ہے لیکن ایسے اشعار اتفاقی طور پر ان کے کلام میں آ گئے ہیں ورنہ ان کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا ہی میں رہ کر علائق دنیوی سے آزاد ہونا چاہیئے دنیا میں جو لذتیں اور نعمتیں ہیں ان سے لطف اٹھاؤ مگر ان کے ہی ہو کر نہ رہ جاؤ۔ شکر پر بیٹھنے والی مکھی کا سا طریقہ رکھو کہ جب تک چاہتی ہے شکر کھاتی رہتی ہے اور جب چاہتی ہے اڑ جاتی ہے لیکن شہد پر بیٹھنے والی مکھی نہ بنو جس کے بال و پر اس میں پھنس جاتے ہیں اور اڑ نہیں سکتی ؎

بر قند نہ بر شہد نشیند مگس ما　　　در دہر فرو رفتہ و لذت نتواں بود

انسان کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہوا و ہوس کا اسیر رہنے سے اس کے نفس میں ایک ایسی کیفیت مستقلہ پیدا ہو جاتی ہے جو ہمیشہ اسے لذت کے اعادہ کی خواہش کرتی رہتی ہے اور انسان ہمیشہ انہی خیالات میں مستغرق رہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس لذت پر اور لذت کا اضافہ ہو جائے اور یہی وہ شے ہے جو سکون خاطر کیلئے زہر قاتل کا حکم رکھتی ہے اور اسی سے انسان رفتہ رفتہ نفس پرست اور نفس پرور ہو جاتا ہے مگر اس شخص کی زندگی قابل رشک ہے کہ جسے اپنے نفس پر اتنا قابو حاصل ہو کہ وہ جب چاہے لطف لذت سے بہرہ اندوز ہو اور اپنے آپ کو اس کا عادی نہ بنائے اور نہ ہی اس لذت کا ترک کرنا اس کے لیے ناگوار خاطر ہو اس قسم کا شخص جو چاہے کرے زیبا ہے مرزا صاحب کے خیال میں یہ بے تعلق زندگی کس قدر مسرت خیز ہے ؎

زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گذرد　　　اگر بہ دل نخلد ہرچہ از نظر گذرد

جو لوگ تعلق دنیوی سے تنگ آ کر خلوت نشین ہو جاتے ہیں غالب انہیں نصیحت کرتے ہیں کہ اگر تمہیں وحشت و بیگانگی ہی اختیار کرنا ہے تو اپنے نفس سے کیجیئے اور اگر بھاگنا ہی مد نظر ہے تو خود اپنی ذات سے بھاگیے۔

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں   اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہو

غالب کا فلسفہ اگرچہ بادی النظر میں نہایت آسان نظر آتا ہے لیکن اس پر عمل کرنا نہایت مشکل ہے غالب خود اس کا اقرار کرتے ہیں اور ایک جگہ بہ قبیل استعارہ فرماتے ہیں کہ میں نے جس وقت سے دنیا کی بے حیثیتی کو دیکھ پایا ہے اس وقت سے برابر ترک تعلقات میں مصروف ہوں لیکن صفائی باطن کی نظر سے دیکھا جائے تو ابھی ابتدائی منزل میں ہوں ؎

یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز   چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں پایا

غالب کا اصلی فلسفہ غم و مسرت اگرچہ یہی ہے جو بعض مثالوں سے واضح کیا جا چکا ہے لیکن اسکے ساتھ ہی وہ اس بات کا مقر ہے کہ انسان کیلئے یہ عمل بالکل ناممکن ہے کہ وہ اس عالم میں رہتے ہوئے غم و الم سے نجات حاصل کرے اور یہ قصور حوادثات عالم کا نہیں بلکہ خود حضرت انسان کا ہے جو اپنے لئے خود بخود ایسے اسباب مہیا کر لیتا ہے جو اس کیلئے رنج و غم کا سبب بنیں ؎

قفس و دام ز گناہے نیست   ریختن در نہاد بال و پر ماست

جس طرح کہ شمع کی روشنی اور اس کا جلنا لازم و ملزوم ہے اسی طرح عملی حیثیت سے حیات انسانی اور غم بھی مترادف ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ انسان زندہ تو رہے لیکن رنج و غم میں مبتلا نہ ہو غالب اس مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں   موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

اگرچہ انسان کی موجودہ زندگی گوناگون مصائب کا مجموعہ ہے اور طرح طرح کی انقلابات کی حامل ہے تاہم غالب مطمئن ہیں کہ آخر الامر حقائق اشیاء کے چہرے سے نقاب اٹھ کر رہیگا اور فنا کے کثرت سے وحدت کا ظہور ہوگا اس لئے حیات موجودہ پر مسرور ہونا چاہیئے اور اسے ہنسی خوشی گزار دینا ہی بہتر ہے۔

شاد باش اے دل دریں محفل کہ ہر جا نغمہ ایست   شیون رنج و فراق جان و تن خواہد شدن
ہم فروغ شمع ہستی تیرگی خواہد گزید   ہم بساط بزم مستی پر شکن خواہد شدن
گرد پندار وجود از رہگذر خواہد نشست   بحر توحید عیانی موجزن خواہد شدن

ان تمام امور کے مسلم ہو چکنے کے بعد کہ عالم ایک ہستی موہوم ہے۔ فانی ہے۔ غیر حقیقی ہے ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر مذہب کی کیا حقیقت ہے۔ ممکن ہے یہ آسمان یہ زمین یہ شجر و حجر، آفتاب و ماہتاب سب کے سب ذہنی وجود رکھتے ہوں لیکن

حشر و نشر، دوزخ و جنت، میزان و صراط جنکے خارج میں موجود ہونے پر مذہب کی مہر ثبت ہے نہیں کس طرح ذہنی خیال کیا جا سکتا ہے غالب نے اس سوال کا جواب نہایت سنجیدگی سے دیا ہے اور حد درجہ کی جرأت و آزادی کو کام میں لائے ہیں وہ یہی ایک سچے فلسفی شاعر سے توقع کیجا سکتی تھی وہ نہایت بیباکی اور پامردی سے کہتے ہیں کہ دوزخ سے یہ مراد نہیں کہ واقعی خارج میں اس کا کوئی وجود ہے جسمیں گنہگاروں کو دھکیلا جائیگا بلکہ اس سے جو غرض ہے وہ یہ کہ لوگوں میں تہذیب نفس پیدا کیجائے اور لوگ ان معتقدات مذہبی کے لحاظ سے مانیں وہ اسکے ڈر سے اخلاق کی حد سے متجاوز نہ ہوں ؎

اے دادہ بر باد عمر در لہو و فسوس　　زنہار مشو ز رحمت حق مایوس
ہش دار کز آتش جہنم حق را　　تہذیب غرض بود نہ تعذیب نفوس

اور یہی کیفیت بہشت کی ہے کہ اس کا اعتقاد رکھنے سے سکون قلب حاصل ہوتا ہے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت غالب　　دلکے خوش رکھنے کو لیکن یہ خیال اچھا ہے

معبود حقیقی کا وجود سرحد عقل سے نہایت دور و بعید ہے اور حواس و ادراک کی پرواز سے بہت ہی بلند و بالا ہے وہاں کعبہ وغیرہ جن کی پرستش کو عام لوگوں نے مقصود بالذات خیال کر رکھا ہے عقلمندوں کی نظر میں محض اسباب و آلات کی حیثیت رکھتے ہیں جنکی معرفت انسان عرفان حقیقت کی منزلوں کو طے کرتا ہے ؎

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود　　قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

بہشت و دوزخ کا عقیدہ اگرچہ عوام کو پابند اخلاق بنانے کیلئے ایک بہترین محرک ہے تاہم غالب کے نقطہ خیال سے اس میں نقص یہ ہے کہ اس اخلاق کی بنیاد بر خوف و لالچ پر رکھی گئی ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ یہ معیار اخلاق نہایت کمزور ہے اسلئے غالب کی رائے ہے اگر جنت کا اعتقاد فنا ہو جائے تو بہتر ہوگا۔ لوگوں کی نیت میں زیادہ خلوص اور سچائی پیدا ہو جائے اور ہوس حور و غلمان اور طلب جام کوثر اور آرزوئے عیش بالکل فنا ہو جائے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

غالب کے کلام میں خودداری و استغنا کی تعلیم بھی نمایاں طور پر موجود ہے وہ حریص زاہدوں اور طامع ملاؤں کی طرح لذائذ جنت کے خیال سے خوش نہیں ہوتے انکے فلسفیانہ نکتہ خیال نے بہشت کی جو تصویر پیش کی ہے وہ کلی طور پر اس تصویر کے برعکس ہے جو خشک اور باطن فریب زہاد نے عوام کی ذہنیت میں بٹھا رکھی ہے ؎

ستائش گر ہے زاہد اسقدر جس باغ رضواں کا   وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا!

غالب ان لوگوں سے سخت نفرت کا اظہار کرتے ہیں جنہوں نے عبادات وطاعات کو عیش و دوام کا ذریعہ ٹھہرا رکھا ہے غالب کی حقیقت شناس نظروں میں اس قسم کے تمام لوگ حد درجہ کے نفس پرست اور لالچی واقع ہوئے ہیں غالب کا نظریہ یہ ہے کہ تمام عبادات وطاعات محض تعمیل احکام ربانی کے خیال سے ہونی چاہئیں جزا کی توقع رکھنا اور صرف اس خیال سے عبادت کرنا سراسر کم فہمی اور جہالت ہے بلکہ سب سے بڑی معصیت جو نفس انسانی کے لئے ہو سکتی ہے وہ یہی توقع جزا ہے ۔

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی   پاداش عمل کی طمع خام بہت ہے

اسی مضمون پر حافظ علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس   در بند ایں مباش کہ نشنید یا شنید

علامہ اقبال علیہ الرحمتہ نے اس حقیقت کو یوں ادا فرمایا ہے

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے   اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

متصوفین کے نزدیک اپنی ہستی کا اقرار اور اپنے وجود کا موجود ہونا سمجھنا صانع حقیقی کی معرفت کے راستے میں سدِ مسدود ہے جب تک یہ حجاب اکبر دور نہ ہو حقائق و اسرار کا ظہور ناممکن ہے۔ ان کے نزدیک سب سے بڑا بت یہی ہے جس کا توڑنا ہر سالک راہ کیلئے لابدی و ضروری ہے غالب نے اس عقیدہ کی تلقین ان الفاظ سے کی ہے

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں   ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور

حضرت مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ اس خیال کو یوں ادا فرماتے ہیں

تا کہ مو باشد ز ہستی تو   در خیالات گم شود ہستی تو
تا کہ مو باشد ز تو پیش چشم   در خیالت گوہر باشد پشم
پشم را آنگہ شناسی از گہر   کز خیال خود کنی کلی گذر

دنیا کی بے ثباتی اور جہان کی زود فنائی کے متعلق بڑے بڑے شعراء نے نہایت موثر و عبرت خیز مضامین باندھے ہیں لیکن غالب نے اس قطعہ میں جس کا مطلع یہ ہے

اے تازہ واردانِ بساط ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ ناؤ نوش ہے

جس متنوع اور درد انگیز طریق سے اس جہان کون و فساد کی زود فنائی اور اسکے عیش و عشرت کے بے ثبات ہونے کو بیان کیا ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے ایک ایک شعر پڑھتے جائیے اگر آپ ذوقِ سلیم اور وجدانِ صحیحہ سے بے بہرہ نہیں تو انکے اثرات اپنے قلب و دماغ میں ملاحظہ فرمائیے۔

غالب کے عقیدہ کے مطابق انسان کا دل کبھی آرزو سے خالی نہ ہونا چاہیئے کیونکہ آرزو ہی ایک ایسی کیفیت ہے جس کے ذریعہ سے انسان اپنے تمام مقاصد کو چاہے وہ ادنیٰ ہوں یا اعلیٰ حاصل کر سکتا ہے اور آرزو ہی سے انسان کی طبیعت میں جوہر شجاعت و استقلال پیدا ہوتا ہے اور عدم آرزو کی صورت میں بزدلی و کم ہمتی۔ اور اگر سچ پوچھو تو تمام انسانی زندگی کا سرمایہ ہی آرزو ہے ؎

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

اشعار بالا کے علاوہ اور بہت سے اشعار ایسے ہیں جن کے مفہوم پر جس قدر غور کیجئے گا۔ اسی قدر ان کی خوبیاں دریافت ہوتی جائینگی اس کے علاوہ مرزا کا کلام شاعری کے عام محاسن کے اعتبار سے بھی ممتاز نظر آتا ہے عامیانہ مذاق اور مبتذل بازاری الفاظ نیز فحش اور ہجو سے مرزا کا کلام بالکل پاک ہے مرزا کی شاعری جہاں فلسفیانہ ہے وہاں عاشقانہ بھی ہے لیکن انکے نزدیک عشق کا مضمون بوالہوسی نہیں اس لئے ان کے خیالات میں دنائت اور پستی کے بجائے متانت اور شائستگی کی ایسی شان موجود ہے جس کی مثال مولانا حسرت کے نزدیک شعرائے لکھنؤ کے کلام میں ناپید اور متاخرین شعرائے دہلی کے کلام میں کمیاب ہے بقول ڈاکٹر عبدالرحمٰن "اس رباب پر دستِ قدرت نے سارے سُر ایک کر کے بجائے ہیں اور دیوانِ غالب انہیں سُروں کی صدائے بازگشت ہے۔"

زخمہ بر تار رگِ جاں مے زنم
کس چہ داند تا چہ دستاں مے زنم

(پروفیسر) محمد عنایت اللہ ایم۔ اے
لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا ۱ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ ۲ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے ۳ سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے ۴ مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

شرح: مصنفین عام طور پر آغازِ کتاب میں خدا کی تعریف کرتے ہیں لیکن اردو شاعری کے مجددِ اعظم میرزا غالبؔ نے اس دستورِ قدیم میں ایک خاص جدت پیدا کی ہے اور حمد و ثنا میں ایک عجیب شاعرانہ انداز اختیار کیا ہے اور ذاتِ باری کے لئے لفظ نقاش کا استعمال کیا ہے اور خالق و مخلوق کے رشتہ کو نہایت صفائی، خوبی اور فلسفیانہ طریقِ استدلال سے واضح کیا ہے معلوم ہوتا ہے حق تعالیٰ کی تعریف کا یہ انداز میرزا غالبؔ نے حضرت مولانا روم علیہ الرحمتہ کے تتبع میں اختیار کیا ہے۔ تصویر ایک ہی ہے صرف رنگ و روغن مختلف ہیں۔

"بشنو از نے چوں حکایت می کند   وز جدائی ہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند   از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

(مولانا روم ؒ)

شعر (۱) میرزا غالب ایک خط میں خود اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کرے جاتا ہیں شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے جو صورت تصویر ہے اس کا پیرہن کاغذی ہے یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہو موجب رنج و ملال و آزار ہے: (عود ہندی)

حاصل شعر کا یہ ہے کہ ہستی خواہ وہ کسی شے کی ہو باعث رنج و ملال ہے۔ حتیٰ کہ تصویر کہ جو صرف ایک ہستی محض ہے اپنے صانع کی بزبان حال شکایت کرتی ہے کہ مجھ کو ہیئت کر کے کیوں مبتلائے رنج ہستی کیا۔

شعر (۲) کاوکاو از کاویدن۔ کھودنا۔ تفحص و تجسس مراد تکلیف و محنت۔ یعنی شبہائے جدائی کا کاٹنا ویسا ہی مشکل ہے جیسا کہ فرہاد کیلئے جوئے شیر کا لانا تھا۔ صبح کی سفیدی اور جوئے شیر میں مشابہت ظاہر ہے۔

شعر (۳) جذبہ کشش۔ شوق۔ شوق قتل۔ دم شمشیر۔ تلوار کی دھار۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق کے شوق شہادت کی کشش کا اثر یہ ہے کہ دم شمشیر سینۂ شمشیر سے باہر نکلا پڑتا ہے۔

شعر (۴) آگہی، عقل، سمجھ، جستجو، مطلب یہ ہے کہ ہماری تقریر ایسی ہے کہ اس کے مفہوم تک عقل و فہم کا پہنچنا دشوار ہے اور عقل ہمارے مفہوم کے احاطہ سے قاصر ہے۔

شعر (۵) آتش زیر پا۔ محاورہ فارسی میں بیقرار ہونے کو کہتے ہیں۔ موئے آتش دیدہ۔ وہ بال جو آگ کی گرمی سے حلقہ دار اور کمزور ہو گیا ہو اور اس میں حلقۂ زنجیر کی مشابہت پیدا ہو گئی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ میں اسیری کی حالت میں بیقرار ہوں اس واسطے میرا حلقۂ زنجیر موئے آتش دیدہ کی مانند کمزور ہو گیا ہے۔ یعنی حلقہ ہائے زنجیر کی مضبوطی کی بھی کچھ ہستی نہیں۔

(۶) جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار ۱ صحرا اگر بہ تنگیٔ چشم حسود تھا
آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست ۲ ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ ۳ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز ۴ لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا
ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی ۵ میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
۶ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

شعر (۱) قیس، لیلیٰ کا عاشق جو مجنوں کے لقب سے مشہور ہے۔ بروئے کار آنا۔ ظاہر ہونا، نمایاں ہونا۔ بہ تنگیِ چشمِ حسود۔ حاسد کی آنکھ کے مانند تنگ۔ چشمِ حاسد کی تنگی مشہور ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شاید صحرا بھی چشمِ حاسد کی مانند تنگ تھا۔ کہ سوائے مجنوں کے صحرا نوردیِ عشق کا کوئی مردِ میدان نہ نکلا۔

شعر (۲) آشفتگی۔ پریشانی۔ سویدا۔ دل پر ایک سیاہ داغ۔ سویدا کو داغ سے اور آشفتگی کو دود (دھواں) سے تشبیہ دی ہے۔ مقصودِ شاعر یہ ہے کہ جس طرح دھوئیں سے داغ پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح پریشانی کے دھوئیں سے دل میں داغِ سویدا کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

شعر (۳) شاعر کہتا ہے میرا خیال عالمِ خواب میں تجھ سے کچھ معاملہ کر رہا تھا لیکن آنکھ کھلتے ہی وہ تمام طلسم ٹوٹ گیا نہ نقصان باقی رہا نہ فائدہ۔

شعر (۴) غمِ دل بمعنی غمِ عشق۔ مطلب یہ ہے کہ مکتبِ غم میں میرا سبق یہ ہے کہ رفت گیا اور بود تھا یعنی زمانۂ عیش کبھی تھا اور اب جاتا رہا۔ (طباطبائی)

مولانا حسرت اس شعر کے معنی یوں بیان فرماتے ہیں: یعنی ہنوز مبتدی ہوں جس طرح لڑکے پہلے آمد نامہ پڑھتے ہیں کہ رفت کے معنی گیا اور بود کے معنی تھا وغیرہ۔ لطف یہ ہے کہ رفت و بود دونوں ماضی کے صیغے ہیں جس سے مطلب یہ ہے کہ دل عیش و فراغت سے بالکل محروم ہے۔

شعر (۵) یعنی موت ہی نے عیبِ برہنگی کو مٹایا ورنہ میں ہر لباس میں ننگِ ہستی و وجود تھا ننگِ وجود ہونے کو برہنگی سے تعبیر کیا ہے۔ داغِ عیوبِ برہنگی سے مراد فقدانِ محاسن ہے۔

شعر (۶) سرگشتہ ۔ حیران ۔ تیشہ ۔ کلہاڑی ۔ مطلب یہ ہے کہ کوہکن یعنی فرہاد (عاشق شیریں) تیشہ مارکر مرا یہ موت حقیقی نہیں اگر اس کی محبت کامل ہوتی تو وہ خودکشی کا مرتکب نہ ہوتا بلکہ وفور غم ہی اسے اس کی موت ہو جاتی عشق میں مصنوعات کا دخل خامئ عشق کی دلیل ہے۔ کلہاڑی مارنا ایک رسمی فعل ہے اس لئے فرہاد کو سرگشتۂ رسوم و قیود کہا۔

(۳) کہتے ہو نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا ۱ دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا ۲ درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا
دوست دار دشمن ہے اعتماد دل معلوم ۳ آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا
سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری ۴ حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل ۵ خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا
حال دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی ۶ ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا
شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا ۷ آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

شعر (۱) یہ کہتے ہو کہ اگر تمہارا دل کہیں پڑا ہم کو مل گیا۔ تو پھر ہم نہ دینگے۔ ہمارے پاس دل کہاں ہے جو ہم اس کو گم کریں ہم آپ کا مطلب سمجھ گئے کہ آپ نے ہمارا دل پالیا ہے اور یہ باتیں کہ ہم دل پالیں گے تو نہ دینگے یہ دل پا لینے کے بعد کی ہیں اور یہ تمام گفتگو میرے چھیڑنے کی غرض سے ہے۔

شعر (۲) زندگی بغیر عشق کے بے کیف تھی اس سے مجھے کیف زندگی نصیب ہوا یہ میرے درد کی دوا ہے مگر یہ (عشق) خود درد لا دوا ہے "مرحبا اے عشق خوش سودائے ما۔ اے طبیب جملہ علتہائے ما۔ (روم)

شعر (۳) ہمارا دل دشمن (معشوق) کا دوست ہے اسلئے اس کی ہر آہ بے اثر اور نالہ نارسا ہے۔

شعر (۴) غالب کا یہ شعر شاعری کی جان ہے حضرت بیخودؔ اس شعر کے متعلق تحریر فرماتے ہیں: "اس بیان جیسے شستہ الفاظ کی تعریف نہیں ہو سکتی" مطلب شعر یہ ہے کہ اہل حسن کی بظاہر سادگی سے غرض

ہوتی ہے کہ عشاق کی جرأت کا امتحان کریں اور عشاق کا دل دیکھیں اس قسم کی سادگی کہ در حقیقت پرکاری (ہوشیاری)، اور بیخودی یا غفلت کہ ہشیاری خیال کرنا چاہیئے۔

شعر (۵) غنچہ اور دل کی تشبیہ عام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا دل جو خون ہو کر آنکھوں کے راستے ٹپک گیا تھا اور اس کا کہیں نشان نہ ملتا تھا آج ہم نے اسی دل کو پا لیا یعنی یہ غنچۂ گل جو فصلِ بہار میں شگفتہ ہوا ہے ہمارا دل ہی تو ہے جو موسمِ خزاں میں خون ہو گیا تھا۔

شعر (۶) ہم اپنے دل کی حالت سے واقف نہیں صرف اس قدر معلوم ہے کہ ہم نے اس کو اکثر ڈھونڈا، لیکن ملا نہیں مگر برخلاف اس کے تم نے اسے بارہا پایا لیکن کچھ پروا نہ کی۔

شعر (۷) ناصح کے شورِ نصیحت نے میرے دکھے زخموں پر خوب نمک چھڑکا۔ کوئی آپ یعنی ناصح سے پوچھے کہ آپ کو اس نمک چھڑکنے سے کیا مزہ حاصل ہوا۔ شور، نمک، مزہ وغیرہ میں تناسب لفاظ بھی ہے۔

(۴) دل مرا سوزِ نہاں سے بے تحابا جل گیا ۱ آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا
دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں ۲ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا ۳ میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں ۴ کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
دل نہیں تجھکو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار ۵ اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
۶۔ دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

شعر (۱) میرا دل سوزِ نہاں (آتشِ عشق) سے چپکے چپکے اس طرح جل گیا کہ کسی کو خبر تک نہ ہوئی جیسے کہ آتشِ خاموش یعنی سلگتی ہوئی آگ آہستہ آہستہ جل جایا کرتی ہے۔ بعینہٖ دل کی یہی حالت ہوئی۔ سوزِ نہاں اور آتشِ خاموش نہایت مناسب لفظ ہیں اور "بے محابا" سے مراد بلا پس و پیش بیخوف مجازاً ایک لخت۔

شعر (۲) آگ سے مراد آتشِ عشق ہے۔ جس نے دل و جگر کو جلا ڈالا اب نہ ذوقِ وصل باقی ہے نہ یادِ دوست۔ مولانا طباطبائی آگ سے آتشِ رشک مراد لیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ رشکِ رقیب کی آگ ایسی تھی کہ معشوق کو دل سے بھلا دیا اور اس کا غیر سے ملنا دیکھ کر ذوقِ وصل جاتا رہا۔ گھر سے مراد دل ہے۔

شعر (۳) اپنی نیستی کی حالت کو رنگ آمیزی سے بیان کیا ہے مطلب یہ ہے کہ میں اب عدم سے بھی آگے ہوں۔ ورنہ جب میں فنا کے عالم میں تھا تو بارہا میری آتشیں آہوں سے بازوئے عنقا جل گیا۔ اس شعر میں غافل سے مراد وہ لوگ ہیں جو انسانی مراتب کی ترقی سے واقف نہیں۔

شعر (۴) عرض کیجیے۔ پیش کیجیے۔ جوہرِ اندیشہ مراد خیال و فکر۔ گرمی، سوز و گداز۔ مطلب یہ ہے کہ میں اپنے خیال و فکر کی گرمی کہاں بیان کر سکتا ہوں۔ فقط دشت نوردی کا ذرا خیال ہی کیا تھا کہ صحرا میں آگ لگ گئی۔ وحشت کی حالت میں صحرا نوردی کی نوبت ضرور آتی ہے لیکن ارادۂ وحشت میں اس بلا کی حدت مستور تھی کہ خیالِ وحشت سے صحرا جلنے لگا۔

شعر (۵) کارفرما منتظم بنایا ہے اور دل کے داغوں کی تشبیہ چراغاں سے دی ہے مطلب یہ ہے کہ دل ہی جو داغہائے عشق کی بہار کا کارفرما تھا نہیں ہے ورنہ اگر وہ ہوتا تو میں تمکو داغوں کی بہار دکھاتا

شعر (۶) افسردگی، مایوسی۔ طرزِ تپاک، برتاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ دنیا کا سلوک دیکھ کر بجائے شگفتہ خاطر ہونے کے روکھے پن اور مایوسی کی طرف دل مائل ہے کیونکہ اہلِ دنیا کا برتاؤ دوستانہ نہیں بلکہ منافقانہ ہے یہ شعر سوسائٹی کی تنقید ہے۔

(۵) شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا ۱ قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب ۲ تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا
بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل ۳ جو تیری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا
دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد ۴ کام یاروں کا بقدرِ لبِ دنداں نکلا

اے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند ۵ سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا
دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ
۶ آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

شعر (۱) شوق بمعنی عشق۔ رقیب۔ دشمن۔ مطلب یہ ہے کہ عشق ہر حالت میں سر و سامان کا دشمن ہے دیکھو قیس (مجنوں) کی تصویر بھی عُریاں (ننگی) ہی کھینچی۔

شعر (۲) میرزا غالب اپنے اس شعر کے معنی اپنے ایک خط میں یوں تحریر فرماتے ہیں "یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نکالی ہے جیسا کہ اس شعر میں ہے

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

یعنی زخم تیر کی توہین بسبب ایک رخنہ ہونے کے اور تلوار کے زخم کی تحسین بسبب ایک طاق کے کُھل جانے کے زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یعنی تنگیٔ دل کو دور نہ کیا۔ پُرافشاں بمعنی بھاگا اور یہ لفظ تیر کے کنائے حال کے معنی یہ کہ تیر تنگیٔ دل کی داد کیا دیتا۔ وہ تو خود ضیق مقام سے گھبرا کر پرافشاں و سراسیمہ نکل گیا۔ [illegible]

شعر (۳) تیری محفل سے جو کوئی بھی نکلتا ہے وہ پریشان ہو کر نکلتا ہے۔ پھول کی خوشبو۔ دل کی فریاد اور شمع کی محفل کا دُھواں وغیرہ ہوا سے پریشان نہیں ہوئے ہیں بلکہ تیرے دردِ محبت کی بنا پر سرگرداں ہیں

شعر (۴) مائدہ بمعنی دسترخوان۔ لذتِ درد۔ لطفِ عشق۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دردِ دل کے دسترخوان یعنی میرے اشعار سے بقدرِ ذوق و فہم احباب کو لطف نصیب ہوتا ہے۔ "بقدرِ لبُ و دنداں" سے مراد استعداد و اہلیت ہے۔

شعر (۵) ہمتِ دشوار پسند موصوف اور نو آموزِ فنا اس کی صفت ہے شاعر اپنی ہمت سے مخاطب ہے اور کہتا ہے اے ہمتِ دشوار پسند، درسِ فنا نہایت مشکل تھا مگر تو نے بہت آسانی سے اس سبق کو حاصل کیا گویا تیرا سبق اول درسِ فنا ٹھہرا حالانکہ درسِ فنا آخری سبق ہوتا ہے اب تیرے لئے فنا سے بھی بالاتر کوئی مرتبہ

چاہیئے کیونکہ فنا میرے لئے ایک آسان مرحلہ ثابت ہُوا۔

شعر (۶) مطلب یہ ہے کہ رونے میں جو میں نے کچھ ضبط سے کام لیا تھا اور کوئی قطرہ میری آنکھوں میں) باقی رہ گیا تھا وہ قطرہ دل میں پھر ایک شور برپا کر رہا ہے گویا نہ نکلنے والا قطرہ ایک طوفان ہے۔

(۶) دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا ۱ عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہُوا ۲ مرنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں ۳ مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا
دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب ۴ اس رہگزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا
جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی ۵ دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا
احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے ۶ زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
۷ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شعر (۱) باب نبرد یعنی لائق نبرد۔ مرد میدان عشق۔ عشق نبرد پیشہ جو ہمت و شجاعت کا طالب ہے مطلب یہ ہے کہ جو شخص مردِ میدان عشق نہ تھا وہ عشق کی ابتدائی دشواریوں کو بھی برداشت نہ کر سکا۔ عشق نبرد پیشہ کو تو مرد میدان (عاشق جانباز) کی ضرورت تھی۔

شعر (۲) میں زندگی میں بھی موت کے ڈر سے خالی نہ تھا۔ میرا رنگ اُڑ کر موت ہی کے وقت زرد نہیں پڑ گیا بلکہ اس سے پہلے بھی زرد تھا۔ مراد یہ کہ میری موت اور زندگی کی حالت یکساں تھی میں فنا ہونے سے پہلے ہی فنا ہو چکا تھا۔

شعر (۳) یعنی ابتدا ہی سے میں بندۂ عشق و وفا ہوں جب کہ ابھی خیالات میں پختگی اور تسلسل بھی پیدا نہ ہُوا تھا۔

شعر (۴) دل سے جگر تک اب ایک دریائے خون ہے یعنی ہجوم پریشانی و مایوسی ہے ایک زمانہ تھا کہ اس رہگزر میں وہ بہاریں تھیں کہ اس کے آگے جلوۂ گل بھی کچھ حیثیت نہ رکھتا تھا یعنی طبیعت میں رنگینی و رعنائی تھی۔ اس شعر میں گذشتہ پر بہار اور موجودہ پر افکار زندگی کا مقابلہ کیا ہے۔

شعر (۵) رنج و غم عشق کی کشمکش سے رہائی ناممکن ہے اگرچہ اب دل نہیں رہا مگر درد دل یعنی دل کے جلنے کا غم موجود ہے۔ حاصل شعر یہ کہ کسی حالت میں بھی آرام نہیں۔

شعر (۶) چارہ سازی۔ علاج وحشت و دیوانگیٔ عشق۔ مطلب یہ کہ دوست و احباب میری دیوانگی کا علاج نہ کر سکے۔ وحشت و دیوانگی سے باز رہنے کیلئے مجھے قید کیا مگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی اور قید خانہ میں بھی میرا خیال اسی طرح دشت پیما رہا جس طرح میں خود اس قید سے پہلے عالم وحشت میں صحرا گرد تھا۔

شعر (۷) شعر کا مطلب صاف ہے لاش کے بے کفن ہونے کو اپنی آزادی کی دلیل ٹھہرایا ہے۔

(۷) شمارِ سبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا ۱ تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا
بہ فیضِ بیدلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے ۲ کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
ہوائے سیرِ گل۔ آئینہ بے مہریِ قاتل ۳ کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا
جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغِ جگر ہدیہ
۴ مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

شعر (۱) شمارِ سبحہ۔ تسبیح کے دانوں کا گننا۔ بت مشکل پسند۔ معشوق جس کو مشکلات پسند ہوں۔ مرغوب آیا۔ پسند آیا۔ بیک کف بُردن صد دل۔ ایک ایک وار میں سو سو دل قابو میں لانا۔ حاصل شعر یہ ہے کہ مشکل پسند معشوق کو تسبیح کے دانے شمار کرنے پر رغبت ہوئی۔ اسلئے نہیں کہ وہ تسبیح پڑھنا پسند کرتا ہے بلکہ اسواسطے کہ ایک جھپٹے میں سو دلوں کو لے جانے کی ترکیب ہاتھ آگئی جس طرح زاہد تسبیح کے سو دانوں کو سمیٹ کر مٹھی میں لے لیتا ہے اسی طرح معشوق ایک ہی مرتبہ سو دلوں پر قبضہ کر لیتا ہے۔

شعر (۲) بیدلی۔ مایوسی یعنی دنیا کی طرف سے جو مایوسی ہمیں ہے اسکی بدولت نومیدی جاوید یعنی ہمیشہ کی ناامیدی) کا برداشت کرنا آسان ہو گیا ہے۔ ہمیں دنیا پر خود رغبت نہیں کشود کار کی امید ہو تو کیا اگر ناامیدی ہو تو کیا۔ یہ پہلے مصرعہ کا مفہوم تھا دوسرے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا عقدۂ مشکل کشائش کو پسند آگیا ہے یعنی اب کبھی بھی اسکی کشائش نہ ہوگی اس سبب سے کہ کشائش کو اس کا عقدہ ہی رہنا پسند ہے اور پسند اس سبب سے ہے کہ ہمیں پروا نہیں پھر ایسی بے نیازی کشائش کو کیوں نہ پسند آئے۔ (طباطبائی)

شعر (۳) ہوا یعنی خواہش۔ آئینہ بمعنی دلیل استعمال کیا ہے۔ بخون غلطیدن بسمل بسمل کا خون میں تڑپنا اور لوٹنا۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق کو پھولوں کا حسن دیکھنا مقصود نہیں بلکہ وہ تو صرف ان پھولوں کو دیکھنا چاہتا ہے جو زمین پر گر کر ہوا کے جھونکوں سے کروٹیں بدل رہے ہیں اور وہ انہیں تماشائے رقص بسمل خیال کرتا ہوا فرحت محسوس کرتا ہے۔ یہ تشبیہ نہایت عمدہ ہے رنگ گل سے مراد اور ہوا سے پھولوں کا ہلنا بسمل کا خون میں لوٹنا ہے۔

شعر (۴) جراحت۔ زخم۔ الماس۔ ہیرے کی کنی۔ ارمغان تحفہ یا نذرانہ۔ حضرت بیخود اس شعر کی شرح یوں لکھتے ہیں "ایک یہ کہ میرا غمخوار جو دوست کو سمجھانے اور مجھ سے ملاقات پر آمادہ کرنے کیلئے گیا تھا وہ وہاں سے تحفہ میں زخم، ہیرے کی کنی۔ داغ جگر لے کر واپس پھر آیا یعنی وہ خود عاشق ہو گیا۔ دوسرے معنی یہ نکلتے ہیں کہ حضرت عشق یہ تمام ساماں خرابی لے کر اسد اللہ خاں غالب کی ملاقات کو تشریف لائے۔

(۸) دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا ۱ ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا ۲ یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ جفا سے چھوٹوں ۳ وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی ۴ گر نفس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی ۵ گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے ۶ ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

شعر (۱) اگرچہ زمانہ میں نقش وفا موجود ہے مگر یہ باعث تسلی نہ ہو سکا یعنی وفا کر کے بھی جب تسلی نہ ہوئی تو لفظ وفا بے معنی و مہمل ٹھیرا اور عاشقوں کی وفاداری ایک بے معنی بات ہو گئی۔ مراد یہ کہ وفا کا اصلی مفہوم معدوم ہے۔

شعر (۲) افعی۔ سانپ۔ اژدہا۔ کاکل۔ زلف۔ سر کے لٹکتے ہوئے بال۔ سبزہ خط کو زمرد سے اور کاکل کو افعی سے تشبیہ دی ہے مطلب یہ ہے کہ اگرچہ یہ مشہور ہے کہ زمرد کے سامنے سانپ اندھا ہو جاتا ہے مگر تیرا سبزہ خط کیسا زمرد ہے کہ افعی زلف کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا یعنی خط نکل آنے پر بھی زلف کی دلکشی و سرکشی میں کچھ فرق نہ آیا۔

شعر (۳) میں نے چاہا تھا کہ مر جاؤں تاکہ وفا کے رنج و غم سے نجات ہو جائے لیکن وہ ستمگر یعنی معشوق میرے مرنے پر رضامند نہ ہوا اس خیال کی بنا پر کہ میری موت اس کی بدنامی کا سبب ہوگی۔

شعر (۴) گزرگاہ، راستہ، جادہ، راستہ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر نفس راہ منزل۔ پرہیزگاری نہ بن سکا تو کچھ پرواہ نہیں، میرا دل گزرگاہ جام و شراب تو ہو سکتا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اگر تقویٰ نہیں تو رندی ہی سہی

شعر (۵) منت کش۔ احسان اٹھانے والا۔ گلبانگ۔ آواز۔ مطلب یہ ہے کہ میں تجھ سے ہر حال میں خوش ہوں یعنی اگر تو وصل کا وعدہ کرتا تو جب بھی خوش تھا اس وجہ سے کہ وہ عین مقصود ہے اور اگر تو وعدہ نہیں کرتا تو اس پر بھی خوش ہوں کہ میرے کان پر آواز تسلی کا احسان نہ ہوا۔

شعر (۶) محرومیِ قسمت، بدنصیبی، مطلب یہ ہے کہ میں اپنی بدنصیبی کی شکایت کس سے کروں جینے سے تنگ آ کر موت کی خواہش کی تھی کہ موت ہی آ جائے لیکن وہ بھی پوری نہ ہوئی۔

شعر (۷) دمِ عیسوی کا اعجاز مشہور ہے کہ اس سے مردے زندگی اور بیمار شفا حاصل کرتے تھے لیکن غالب فرماتے ہیں کہ میرے معاملہ میں ابھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منہ سے کوئی لفظ بھی نہ نکلا تھا وہ صرف ابھی لب کو

جنبش ہی ہوئی تھی کہ میں اس جنبشِ لب کے صدمہ کو برداشت نہ کرسکا اور مر گیا انتہائی ضعف و ناتوانی کا اظہار کیا ہے۔

(۹) ستائش گر ہے زاہد اسقدر جس باغِ رضواں کا ۱ وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا
بیاں کیا کیجئے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا ۲ کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا
نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو ۳ لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا
دکھاؤں گا تماشہ دی اگر فرصت زمانے نے ۴ مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا
کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوہ نے ۵ کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ۶ ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا
اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر ۷ مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں ۸ چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا
ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے ۹ دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا
بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ ۱۰ سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا
نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا ۱۱ قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیرے مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا **غالبؔ**
۱۲- کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

شعر (۱) ستائش گر۔ تعریف کرنیوالا۔ باغِ رضواں۔ مراد بہشت۔ گلدستہ طاقِ نسیاں۔ وہ گلدستہ جسے ہم کسی طاق پر رکھ کر بھول گئے ہوں۔ طاقِ نسیاں محاورہ ہے مطلب یہ ہے کہ زاہد جس بہشت کی اسقدر تعریف کرتا ہے وہ دراصل ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا ایک گلدستہ ہے جسکو ہم کہیں بھول گئے اور اب اسکی پرواہ تک نہیں ؎

دوزخ و جنت یقیں بشنو کہ چیست؟
جز فراق و جز وصالِ دوست نیست!

شعر (۲) کاوشہائے مژگاں یعنی مژگاں کی کھٹک۔ تسبیحِ مرجاں، مونگے کی مالا۔ خون کے ہر قطرہ کو جو آنکھوں سے بہا مونگے کے دانہ سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مژگاں کی کھٹک نے ہر آنسو کو قطرۂ خون بنا دیا ہے جنہوں نے مسلسل جمع ہو کر تسبیحِ مرجاں کی شکل اختیار کر لی ہے۔

شعر (۳) سطوت بمعنی رعب۔ ریشۂ نیستاں یعنی "نے"۔ "دانتوں میں تنکا لینا فارسی محاورہ ہے "خس بدنداں" کا ترجمہ ہے۔ مطلب یہ کہ قاتل کا رعب بھی میرے نالوں کو روک نہ سکا اور اظہارِ عجز کے لئے جو تنکا میں نے دانتوں میں لیا تھا وہ بھی "نے" ہو گیا اور اس سے نالہ کی آواز پیدا ہو گئی۔

شعر (۴) تخم ہے سروِ چراغاں کا یعنی ایسے سرو کا بیج ہے جس پر چراغ ہی چراغ نظر آئیں۔ مطلب یہ کہ داغِ عشق ابھی تخم یا بیج کی صورت میں ہے اگر عشق کی راہ میں کوئی بات بطور سدِ راہ واقع نہ ہوئی یعنی اگر زمانہ نے فرصت دی تو یہی داغ سروِ چراغاں کی صورت اختیار کر لینگے اور وہ تماشا قابلِ دید ہوگا۔

شعر (۵) آئینہ خانہ یعنی وہ کمرہ یا مکان جس میں آئینے ہی آئینے آویزاں ہوں۔ شبنمستاں یعنی چمن یا وہ جگہ جہاں شبنم پڑی ہو۔ سورج کی روشنی سے شبنم غائب ہو جاتی ہے اور طلوعِ آفتاب سے پہلے ہر قطرۂ شبنم "انا الشمس" کا دعویدار رہتا ہے لیکن جہاں آفتاب نے ظہور کیا تو شبنم کے وہ قطرے جو پتوں پر موجود رہتے ہیں ستاروں کی طرح غائب ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے جلوے کے سامنے کسی کو قیام نہیں۔ وہ برقِ طور سے بھی بڑھ کے ہے جس طرح قطراتِ شبنم آفتاب کی گرمی سے اڑ جاتے ہیں اسی طرح تیرے حسن کی گرمی سے آئینے پانی ہو کر بہہ جاتے ہیں۔

شعر (۶) تعمیر، عمارت یا ساخت مراد وجود۔ مضمر ہے بمعنی پوشیدہ ہے۔ خرابی بمعنی فنا۔ ہیولیٰ بمعنی مادہ۔ لیکن اس مقام پر یہ لفظ بمعنی "سبب" استعمال ہوا ہے۔ برقِ خرمن یعنی خرمن (کھلیان) کو جلا دینے والی بجلی۔ خونِ گرم ذی حیات کا خون جو گرم ہوتا ہے وہ دست و پا کی حرکت کا ذریعہ ہے یہاں اس کے معنی سرگرمی و مشغولیت کے ہونگے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے وجود میں فنا کی ایک صورت موجود ہے بالکل اسی طرح جیسے کہ دہقان کی سرگرمی و محنت خود اس کے کھلیان کی تباہی و بربادی کی موجب ہے۔ دہقان تخم ریزی، آبپاشی اور نگرانی کر کے کھلیان جمع کرتا ہے

بجلی گرتی۔ مفہوم یہ ہے کہ خود حیات ہی موت کا پیغام ہے۔

شعر (۷) سبزہ سے مراد سبزۂ بیگانہ ہے جو ایک خالی گھر میں پیدا ہو جاتا ہے اور ویرانی اس سبزہ زار کا تماشا کیا کرتی ہے۔ گھر کے نگہبان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ اس "سبزۂ خود رو" کو یعنی سبزۂ بیگانہ کو جو خود بخود اُگ آیا ہے اور جس سے کسی قسم کی تفریح مقصود نہیں اُکھاڑ کر پھینک دے۔ اس شعر میں اسی خیال کو ظاہر کیا گیا ہے۔

شعر (۸) گھر کا چراغ اگر گل ہو جائے تو اندھیرے سے گھبرا کر گھر والے اُسے فوراً جلا دیتے ہیں۔ گورِ غریباں کا چراغ اگر بجھ جائے تو اُسے کون روشن کرے اُسکے بجھتے ہی اس کی آرزوؤں کا خون ہو جاتا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ میری خاموشی میں لاکھوں حسرتیں پوشیدہ ہیں۔ میں گورِ غریباں کا ایک بجھا ہوا چراغ ہوں ؎

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستان میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زبان میری
(اقبال مرحوم)

الفاظ خموشی۔ نہاں۔ مردہ۔ بے زبان اور گورِ غریباں میں صنعت مراعاۃ النظیر ہے۔

شعر (۹) پرتو یعنی عکس۔ افسردہ یعنی مایوس۔ حجرۂ یوسف یعنی دل جس میں کبھی کسی حسین صورت کا خیال رہتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ باوجود مایوسی کے ابھی تک اُن کی یاد باقی ہے۔

شعر (۱۰) تبسم ہائے پنہاں یعنی پوشیدہ مسکراہٹ جو کسی پوشیدہ عیاری کی طرف اشارہ کرے آپ معشوق سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں شاید آج آپ کسی غیر کے پہلو کی زینت بنے ہوئے ہیں اور میرے جلانے کے واسطے خواب میں آ کر یہ عیارانہ مسکراہٹ ہے۔

شعر (۱۱) لہو پانی ہوا ہوگا یعنی لہو پانی کی طرح بہا ہوگا۔ مژگاں کا سرشک آلودہ ہونا یعنی پلکوں کا آنسوؤں سے تر ہونا۔ مطلب ہے اب تو اپنے مظالم یاد کر کے غمگین ہو رہا ہے اور یہ غمگینی اس بات کی دلیل ہے کہ تو نے عشاق پر بہت ظلم کئے ہیں۔

شعر (۱۲) جادہ بمعنی راستہ۔ شیرازہ بمعنی لڑی۔ اجزائے پریشان یعنی دنیا اور اُس سے متعلق باتیں۔ مطلب

ہے کہ میں نے موت کو فراموش نہیں کیا جو دنیا کے تمام مختلف اجزا کو ایک ہی لڑی میں منسلک کرنیوالی ہے۔

(۱۰) نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا ۱ حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا
محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے ۲ کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

شعر (۱) یک بیاباں ماندگی یعنی کثرت ماندگی بہت تھک جانا۔ ذوق۔ ذوق صحرا نوردی نقش قدم کو حباب اور رفتار کو موجہ قرار دیا ہے مطلب ہے کہ خواہ میں کیسا ہی تھک جاؤں لیکن جس طرح حباب موج کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور کبھی نہیں تھکتا اسی طرح میرا ذوق صحرا نوردی بھی کسی طرح کم نہیں ہوگا اور میں منازل عشق کو طے کرتا رہوں گا

شعر (۲) مطلب یہ ہے کہ انقلاب زمانہ سے وہ محبت جو مجھے چمن سے تھی اب نفرت سے بدل گئی ہے بوئے گل جو پہلے میرے لئے باعث مسرت و خوشی تھی اب اس سے میرا ناک میں دم ہے یعنی اب وہ مجھے بھلی نہیں معلوم ہوتی۔

(۱۱) سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی ۱ عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
بقدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی ۲ جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

شعر (۱) مطلب یہ ہے از سرتاپا مبتلائے عشق ہوں لیکن ساتھ ہی مطابق فطرت انسانی الفت ہستی بھی ہے یعنی اپنی جان کو بھی عزیز رکھتا ہوں برق عشق کی پرستش کرتا ہوں اور خرمن ہستی کے جل جانے کا بھی اندیشہ ہے جس سے میرے کمال شوق فنا میں کسی قدر نقص پیدا ہو گیا ہے۔

شعر (۲) ساقی کو دریائے شراب اور خود کو شاعر نے خمیازہ ساحل یعنی کنارۂ دریا قرار دیا ہے اور ساحل باوجود قرب دریا کے ہمیشہ خشک رہتا ہے مطلب یہ ہے کہ اگر شراب پلانے میں ساقی دریا دل ہے تو میں بھی اسی کی نسبت سے عالی ظرف یعنی دریا نوش ہوں۔

لفظ خمیازہ کے لفظی معنی انگڑائی کے ہیں لیکن یہاں مجازاً ساحل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے نیز قاعدہ ہے کہ شراب خوار کو نشہ کے اتار کے وقت انگڑائیاں آنے لگتی ہیں اور اُسے پھر نئے سرے سے شراب کی طلب ہوتی ہے۔

(۱۲) محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ۱ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگ پریدہ صبح بہار نظارہ ہے ۲ یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا
تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز ۳ میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا
صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا وگرنہ میں ۴ طعمہ ہوں ایک ہی نفس جانگداز کا
ہیں بسکہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے ۵ ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا

شعر (۱) محرم بمعنی واقف۔ نواہائے راز بمعنی پوشیدہ بھیدوں کی آوازیں یعنی پوشیدہ بھید۔ حجاب بمعنی پردہ یا آڑ۔ پردۂ ساز یعنی باجے کا پردہ جس سے آواز پیدا ہوتی ہے اس دوسرے پردے اور حجاب کے معنی میں تجنیس لفظی کا پردہ ہے مطلب یہ ہے کہ راز کے نغموں سے تو خود ہی ناآشنا ہے ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجاب نظر آتے ہیں وہ بھی بج رہے ہیں اور پردۂ ساز کی طرح بول رہے ہیں اور اسرار الٰہی ظاہر کر رہے ہیں۔ (یادگار غالب)

مفہوم یہ ہے کہ اہلِ بصیرت کیلئے دنیا کا ہر حجاب پردۂ ساز ہے اور ہر مجاز حقیقت کی طرف رہبر ہے

شعر (۲) رنگ پریدہ۔ اڑا ہوا رنگ۔ اردو میں منہ پر ہوائیاں اڑنا اور ایسی ہی حالت کو شاعر نے نظارۂ صبح بہار کہا ہے مطلب یہ ہے کہ موسم بہار کی صبح کو طرح طرح کے پھول کھلا کرتے ہیں اسلئے وہ وقت ایک خاص کیفیت لئے ہوئے ہوتا ہے اور چونکہ میری پریشانی دوست کی خوشی اور شگفتہ خاطری کا باعث ہے یعنی جب میں پریشان ہوتا ہوں تو وہ اور بھی ناز و انداز دکھاتا ہے اس لئے میرے منہ پر ہوائیاں اڑنا ان کے گلہائے شیوہ و ناز کے کھلنے کی [illegible] ہے۔ اسی وجہ سے میرا رنگ پریدہ نظارۂ صبح بہار ہے۔

شعر (۳) نظر ہائے تیز تیز یعنی گھور گھور کر دیکھنے والی نگاہیں۔ مژہ ہائے دراز بمعنی لمبی لمبی پلکیں (لمبی پلکیں خوبصورت سمجھی جاتی ہیں) مطلب یہ ہے جب تم غیر کو گھوری نگاہوں سے دیکھتے ہو تو وہ نگاہیں میرے دل پر رشک و حسد کے نشتروں کا کام [illegible] مجھے بھی نظر بھر کر دیکھ لیتے اور میرے ارمان نکل جاتے یہاں تمنا عاشقانہ شعر بطور تمثیل بیان ہوگا

ہنس کے غیروں سے گفتگو کرنا
مدعا ہے جلا کرے کوئی

رشک کا سبب یا تو یہ ہے کہ تمہاری تیز نگاہیں مجھے بسمل کر دیتی ہیں مگر اغیار پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یا یہ کہ اغیار ان نگاہوں سے لطف اٹھاتے ہیں اور میں محروم ہوں۔

شعر (۴) صرفہ یعنی قابو۔ ضبط یعنی برداشت۔ طعمہ بمعنی لقمہ۔ نفس جانگداز بمعنی جان کو گھلا دینے والی آہ۔ یہ استعارہ قابل غور ہے انسان کا جسم شمع تصور کیا گیا ہے اور "آہ" اس کی لو یا شعلہ۔

مطلب یہ ہے اگر مجھ میں صبر و ضبط کی قوت نہ ہوتی تو ایک ہی آہ آتشیں میرے جسم کو شمع کی طرح پگھلا کر بہا دیتی یا یہ کہ دنیا کی کوئی ایک ہی مصیبت مجھے مٹانے کے لئے کافی ہوتی۔

شعر (۵) بادہ بمعنی شراب یعنی شراب محبت، شیشہ بمعنی بوتل۔ بساط بمعنی پھیلاؤ یا فرش۔ شیشہ باز بمعنی بازیگر یا مداری یا بھانتی کو کہتے ہیں جو تماشہ کرتے ہوئے بوتل کو اچھال کر کبھی سر پر رکھ لیتا ہے کبھی سینہ پر اسی طرح سب کو اپنے کرتب دکھاتا ہے۔ یہاں شیشوں کے اچھلنے کے سبب سے بزم عیش کے گوشۂ فرش کو شیشہ باز کے سر سے تشبیہ دی ہے مطلب یہ ہے کہ موسم بہار نے شراب میں ایسا جوش پیدا کر دیا ہے کہ جہاں جہاں فرش کے کونوں پر شراب سے بھرے ہوئے شیشے رکھے ہیں وہ اپنی اپنی جگہ اس طرح اچھل رہے ہیں کہ فرش کا ہر گوشہ بازیگر یا رقاص کا سر معلوم ہوتا ہے جس کے سر و دوش پر شیشہ اچھلتا ہے لیکن گرنے نہیں پاتا۔

شعر (۶) کاوش بمعنی کاہش۔ ہندی محاورہ "کھود کرید" تقاضا بمعنی مطالبہ مانگ۔ ناخن پہ گرہ نیم باز کا قرض یعنی ناخن نے چونکہ صرف آدھی گرہ کھولی ہے اسلئے آدھی بے کھلی گرہ ابھی بطور مطالبہ باقی ہے اور یہی بقایا قرض ہے۔ مطلب یہ کہ جب کوئی کام ادھورا رہ جاتا ہے تو دور اندیش لوگوں کے دل اس کو پورا کرنے کا تقاضا ہر وقت کیا کرتے ہیں کہ بقیہ کام کو بھی انجام دینا چاہیئے۔ مفہوم یہ ہے کہ دور اندیش لوگوں کے دل کسی کام کو بغیر پورا کئے ہوئے قرار نہیں لیتے۔

(۱۳) بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا ۱ رکھیو یا رب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا
شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا ۲ اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا
گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب ۳ آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا
گو نہ سمجھوں اسکی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید ۴ پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا
ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال ۵ خلد کا اک در ہے میری قبر کے اندر کھلا
منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں ۶ زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے رخ پر کھلا
در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا ۷ جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہُوا بستر کھلا
کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول ۸ آج اُدھر ہی کو رہیگا دیدۂ اختر کھلا
کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال ۹ نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا
اسکی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا ۱۰

شعر (۱) قلعہ معلّٰی میں بہادر شاہ ظفر کے زمانۂ حکومت میں ہفتہ وار مشاعرے ہُوا کرتے تھے۔ بزمِ شاہنشاہ کو گنجینۂ گوہر کہا ہے۔ مطلب یہ ہے، شاہنشاہ کی محفل میں پھر مشاعروں کا دَور شروع ہو گیا ہے گویا دفترِ سخن کھل گیا ہے دوسرا مصرعہ دعائیہ ہے جس میں مرزا دعا کرتے ہیں کہ یہ گنجینۂ گوہر یعنی موتیوں کا خزانہ ہمیشہ کھلا رہے۔

شعر (۲) انجمِ رخشندہ یعنی چمکتے ہوئے تارے مراد اشعار۔ تکلف بمعنی خوبی۔ بتکدے کا در کھلا۔ قاعدہ ہے کہ بتکدے کا دروازہ کھلنے پر جو عموماً شام کو کھلتا ہے، آرتی دکھائی جاتی ہے (آرتی دکھانا ہنود کے ہاں جزوِ عبادت ہے) آرتی میں ستاروں کی طرح چمکتے ہوئے گھی کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔ یہاں بتکدے سے مراد بزمِ مشاعرہ ہے اور بتوں سے شعرا جو "انجمِ رخشندہ" یعنی اشعار سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے رات ہونے پر مشاعرہ شروع ہُوا اور اشعار کے تارے چمکنے لگے۔

شعر (۳) دشنہ بمعنی چھری۔ دیوانوں کی فصد لی جاتی ہے تو جنون جاتا رہتا ہے مطلب یہ ہے کہ دوست جو فصد لینے کے لئے بظاہر ہاتھ میں نشتر لئے معلوم ہوتا ہے آستین میں چھری چھپائے ہوئے ہے تاکہ موقع پاکر قتل کرے۔ شعر کا دوسرا مصرعہ محاورہ مارِ آستین کی تشریح ہے مفہوم یہ ہے کہ دوست نما دشمن کا اعتبار نہیں۔

شعر (۴) پری پیکر۔ پری کا سا جسم رکھنے والا یعنی نازک اندام معشوق کھلا یعنی بے تکلف ہوا۔ علم عروض میں اس قسم کی ردیف کو معمولہ کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ باوجود معشوق کی باتیں نہ سمجھنے اور اُس کا بھید نہ پانے کے میرے لئے یہی کیا کم ہے کہ وہ مجھ سے بے تکلف ہوا اور ہنسنے بولنے لگا۔ مفہوم یہ ہے کہ دوست کا بے تکلف ہونا ہی بڑی بات ہے۔

شعر (۵) خیال حسن حسن کا تصور۔ یہاں حُسن سے مراد حقیقی حسن ہے۔ حسن عمل سعادت یعنی عبادت یعنی کارِ خیر۔ خلد کا ایک در گور کے اندر کھلا ہے یعنی نجات حاصل ہو گئی ہے (اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے کہ عبادت گذار لوگوں کی قبر میں جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جائیگا جس سے بہشت کے مناظر نظر آئینگے) مطلب یہ کہ خدا جو خالقِ حسن ہے اور سب سے بڑھ کر حسین ہے اس کا خیال اور عبادت میرے لئے ذریعہ نجات بن گیا۔ مفہوم یہ ہے کہ حقیقی حُسن کا خیال عبادت یا ذریعہ نجات ہے۔

شعر (۶) نقرہ "دیکھا ہی نہیں" تعریف کا پہلو لئے ہوئے ہے یعنی "واہ واہ" کیا کہنا۔ نقاب۔ پردہ۔ اب دلّی والے بالاتفاق نقاب کو مونث استعمال کرتے ہیں (حضرت بیخود) قاعدہ ہے کہ گورے گالوں پر سیاہ زلفیں اچھی معلوم ہوتی ہیں مگر مرزا صاحب کہتے ہیں کہ حسنِ حقیقت نہ دیکھنے پر بھی ایسا دلفریب ہے نہ رخسار پر زلفوں کے بکھرنے سے زیادہ پر لطف معلوم ہوتا ہے ع

"وہ ہر تصور سے دُور رہ کر بھی ہر تصور میں آ رہے ہیں"

مفہوم یہ ہے کہ حُسن حقیقی کی تجلیات کا ظہور باوجود پردوں کے جو قلب عشاق پر ہو رہا ہے۔ ایسا ہے کہ اس کی صفت بیان ہو ہی نہیں سکتی۔

شعر (۷) پھر گیا یعنی مکر گیا۔ مطلب ہے کہ ہم فقیروں کی طرح اپنا بستر باندھے ہوئے اسکے در پر گیا اور دو پڑ رہنے کی خواہش قبول ہوئی لیکن جیسے ہی تعمیل کیلئے بستر کھولا تو بدگمانی کیوجہ سے مکر گیا اس شعر میں معشوق کی شوخیِ طبیعت اور تلون مزاجی بیان فرمائی ہے مفہوم یہ ہے کہ وعدہ کیا لیکن میری آمادگی دیکھکر پھر خلاف ہو گئے

شعر (۸) شبِ غم مصیبت کی رات، فراق کی رات۔ نزول۔ نازل ہونا، وارد ہونا، اُترنا۔ اختر۔ تارے مطلب سوال و جواب میں ہے یعنی سوال شبِ غم اندھیری کیوں ہے؟ جواب بلاؤں کے نزول کیوجہ سے۔ ستارے آج آسمان کی طرف بلاؤں کے اُترنے کا تماشہ دیکھ رہے ہیں دنیا کی طرف دیکھتے تو روشنی ہوتی مفہوم یہ ہے کہ شبِ فراق نہایت تیرہ و تار ہے اور شبِ غم کی تاریکی بلاؤں کے نزول کی دلیل ہے۔

شعر (۹) غربت بمعنی مسافرت، پردیس میں رہنا، حوادث، اندوہناک واقعات، دوسرے مصرعہ میں ایک رسم کی طرف اشارہ ہے کہ جس خط میں کسی کی موت کا واقعہ لکھا جاتا ہے تو اس خط کے ایک کونے کو سیاہ کر دیتے ہیں یا کتر دیتے ہیں اور لفافہ کو آدھا کھلا ہوا رکھتے ہیں مطلب یہ ہے کہ وطن کی تکلیفوں سے بچنے کیلئے مسافرت اختیار کی تھی لیکن حوادث کی یہ حالت ہے کہ گھر سے جو خط آتا ہے وہ کھلا ہوا ہوتا ہے یعنی کسی نہ کسی عزیز کی موت کی خبر ہوتی ہے اس حالت میں یہاں بھی خوش نہیں رہا جا سکتا مفہوم یہ ہے کہ غربت میں بھی حوادث بےچین رکھتے ہیں۔

شعر (۱۰) امت یعنی ملت۔ شہ مخفف ہے شاہ کا۔ اشارہ ہے جنابِ خاتم النبیین محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ آپ ایک مرتبہ رات کو آسمان پر تشریف لیگئے اور حضورِ حق میں پہنچے اس رات کو شبِ معراج کہا جاتا ہے۔ گنبدِ بے در وہ گنبد جس میں کوئی دروازہ نہ ہو یعنی آسمان۔ اس شعر میں الفاظ بند اور کھلا جو پہلے اور دوسرے مصرعوں کے آخر میں ہیں صنعتِ تضادِ معنوی رکھتے ہیں ایسے صنائع لانا مرزا صاحب کا حصہ ہے یہ مقطع نعتیہ ہے شبِ معراج کا قصہ نہایت خوبی سے بیان فرمایا ہے مطلب صاف ہے۔

(۱۴) شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا ۱ شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا
(۱۵) واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام ۲ گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال ۳ یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا
جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو ۴ یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا
یاں سرِ پرشور بیخوابی سے تھا دیوار جو ۵ واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا
یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی ۶ جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا
فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا ۷ یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا
ناگہاں اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا ۸ دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا
نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا ۹ تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا
مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے ۱۰ خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا
نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں ۱۱ پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا
کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں ۱۲ ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا
آج کیوں پرواہ نہیں اپنے اسیروں کی تجھے ۱۳ کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا
یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا ۱۴ انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
۱۵- اُس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

شعر (۱) زہرہ آب تھا یعنی ابر کا پتہ پانی ہُوا جاتا تھا۔ شعلہ جوالہ جلدی سے گرد اگرد پھرنے والا شعلہ۔ مطلب یہ ہے کہ رات میں اس قدر بیتاب تھا کہ میرے سوزِ دل کی بجلی سے ابر کا پتہ پانی ہو رہا تھا اور پھر بھی میرے عقدۂ دل کا اثر یہ تھا کہ پانی میں جو حلقۂ گرداب یعنی بھنور پڑتا تھا وہ ایک شعلہ جوالہ بنا جاتا تھا۔

شعر (۲) عنان گیر خرام ہونا۔ چلنے سے روکنا۔ پنبہ بمعنی روئی۔ کف سیلاب بمعنی پانی کی جھاگ۔

شعر (۳) یہاں شاعر اپنی اور معشوق کی حالت کا نقشہ کھینچتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ تو عذرِ بارش کی وجہ سے یہاں تک نہ آئے اور یہاں

فرقت میں ہم اس قدر روئے کہ تکیہ کی روئی کف سیلاب یعنی پانی کی جھاگ بنی ہوئی ہے۔

شعر (۳) خود آرائی بمعنی آرائش جمال۔ اشک بمعنی آنسو اور تار نگہ سے استعارہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی آرائش جمال یعنی بناؤ سنگار کے لئے موتی پرو رہے تھے اور یہاں انتظار میں ہجوم اشک اس قدر تھا کہ تار نظر بھی گم ہوگیا تھا مفہوم یہ ہے کہ معشوق کی خواہش تھی کہ زیبائش میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے اور عاشق کا شوق اس امر کا متقاضی کہ وصل کی گھڑی جلد آجائے۔

شعر (۴) آب جو۔ نہر کا پانی۔ خون ناب۔ خون خالص۔ مطلب یہ ہے وہاں تو جلوۂ گل کے عکس سے نہر کے پانی میں چراغ روشن نظر آتے تھے اور یہاں اشک آلود آنکھوں کی پلکوں سے خون خالص بہ رہا تھا۔

شعر (۵) دیوار جو بمعنی دیوار کا متلاشی۔ فرق بمعنی سر۔ بالش بمعنی تکیہ۔ اس پورے قطعہ میں شاعر نے اپنی محرومی اور معشوق کی بے پروائی کا حال مختلف انداز میں مقابلہ کرکے دکھایا ہے اس شعر میں بھی شب جدائی کا نقشہ کھینچا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ادھر ہم شب فراق میں بعالم بیخودی سر ٹکرانے کیلئے دیوار تلاش کر رہے تھے اور وہ انتہائی بے پروائی سے اپنے فرق ناز کو بالش کمخواب پر رکھے محو آرام تھے۔

شعر (۶) نفس بمعنی گرم آہیں۔ بساط بمعنی فرش۔ احباب بمعنی دوست۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں ہماری بیخودی کی محفل میں گرم آہ کی شمع روشن تھی اور وہاں صحبت احباب کے لئے پھولوں کا فرش بچھا ہوا تھا یعنی رقیبوں سے بیٹھے ہوئے سرگرم گفتگو تھے۔

شعر (۷) اس شعر کے پہلے مصرعہ میں شاعر نے معشوق کی حالت بیان کی ہے اور دوسرے مصرعہ میں اپنی کیفیت ظاہر فرمائی ہے۔ فرش سے تا عرش بمعنی زمین سے آسمان تک، طوفان موج رنگ بمعنی طوفان عیش و مسرت۔ سوختن بمعنی جلنا۔ مطلب یہ ہے کہ وہاں تو زمین سے آسمان تک عیش و مسرت کا طوفان برپا تھا اور یہاں فرقت محبوب یا ناکامی و نامرادی یا رشک رقیب و جوش اضطراب سے آگ لگی ہوئی تھی۔

شعر (۸) (نوٹ) یہ شعر گریز کا ہے اور جو کچھ پہلے بیان کر چکے ہیں اس کے بعد فرماتے ہیں۔
یکایک اس طرح سے دل میں امنگ پیدا ہو گئی کہ دوسری غزل اس زمین میں اور لکھنی چاہیئے اسکا ان الفاظ

میں بیان کیا ہے:" وہ دل جو کاوشِ ناخن سے لذت یاب ہو چکا تھا اس رنگ سے خونِ نابہ ٹپکانے لگا۔ یعنی اس طور پر غزل سرا ہوا۔ یہ اس غزل کے دوسرے حصّہ کی طرف اشارہ ہے۔

شعر (۹) سپند بمعنی کالا دانہ جو اکثر بچّوں پر سے نظرِ بد اُتارنے کی غرض سے جلا کر دھونی دیتے ہیں مطلب یہ ہے کہ رات میرے نالۂ دل میں کوئی اثر نہ تھا اگرچہ میں اس نالہ سے بیتاب ہو کر جل رہا تھا لیکن میرا جلنا بزمِ غیر کے لئے کالا دانہ کا کام کر رہا تھا یعنی بزمِ غیر کو نظرِ بد سے بچا رہا تھا شاعر نے نالہ کی بے اثری کو ایک نئے انداز میں بیان کیا ہے اسی خیال کو ایک دوسرے مقام پر اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

دُور چشمِ بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہے گر نالہ بھی میرا جائے ہے

ایسا ہی ایک مضمون اور ہے ؎

اُف اثر کا مری آہوں سے ہوا ہو جانا
جاتے جاتے ترے کوچہ میں صبا ہو جانا

شعر (۱۰) مقدم بمعنی آنا۔ نشاطِ آہنگ بمعنی مسرور۔ سازِ صدائے آب بمعنی جلترنگ جو سات پیالوں میں پانی بھر کر ایک چھوٹی نے کے ذریعہ بجایا جاتا ہے مطلب یہ ہے عشاق کو راہِ عشق میں اپنی بربادی اس قدر مرغوب ہوتی ہے کہ اپنے مکان میں سیلاب کے آنے سے وہ اس درجہ مسرور ہیں کہ گویا جلترنگ سن رہے ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ عاشق اپنی ویرانی کے سامان کو سامانِ طرب سمجھتا ہے اور اپنی بربادی سے خوش ہوتا ہے۔

شعر (۱۱) نازش بمعنی فخر و ناز، غرور و تکبّر۔ اندیشہ بمعنی خیال۔ سنجاب ایک جانور چوہے سے بڑا جس کی پوستین بناتے ہیں مطلب یہ کہ ہماری خاک نشینی کے زمانہ کی کیفیتیں نہ پوچھ کہ ہم خاک نشین بسترِ خاک کو مسندِ سنجاب خیال کرتے تھے۔

شعر (۱۲) جنونِ نارسا بمعنی عشقِ ناتمام۔ روکش بمعنی مقابل۔ اس شعر کی شرح شارحین نے مختلف طریق

پرکی ہے۔ مولوی حیدر علی صاحب فرماتے ہیں کہ جنوں نارسا نے کچھ نہ کیا یعنی اکتساب فیض اور استمداد معشوق سے محروم رکھا ورنہ ایک ایک ذرہ نے ایسا اکتساب نور کیا تھا کہ رشک دہِ آفتاب تھا۔

مولانا حسرت فرماتے ہیں یعنی اگر عشق ناتمام نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ ذرہ آفتاب کے برابر ہو جاتا۔ لیکن نارسائی جنون نے اکتساب فیض سے محروم رکھا۔ اور ایسا نہ ہونے پایا۔

میرے خیال میں اس شعر میں شاعر نے اپنے عشق کی نارسائی پر اظہار افسوس کیا ہے اور اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ محبوب حقیقی تک پہنچنے کیلئے کوئی رکاوٹ موجود نہیں، اگر ہم اس تک نہیں پہنچ سکے تو اسکی وجہ ہمارے عشق کی ناتمامی ہے ورنہ اس جہان کا ہر ذرہ خورشید عالمتاب کا مقابل بن سکتا ہے اگر ہم اکتساب فیض سے محروم ہیں تو اس میں ہمارا اپنا قصور ہے۔

شعر (۱۳) اس شعر میں شاعر معشوق کو گذشتہ زمانے کی یاد دلا کر مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آج تجھے اپنے ایرانِ محبت کی پروا ہی نہیں کل تک تو تیرے دل میں بھی محبت تھی اور تیرا دل مہر وفا کا دروازہ بنا ہوا تھا۔

شعر (۱۴) یہ شعر پہلے شعر کی تائید میں ہے۔ فرماتے ہیں کیا تجھے وہ دن یاد نہیں جبکہ تیرے دام کا ہر حلقہ شکار کے انتظار میں دیدۂ بیخواب بنا ہوا تھا اس شعر میں مرزا نے معشوق کے دیدۂ بیخواب کو حلقۂ دام کہا ہے۔ جو نیند نہ آنے کی وجہ سے ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ تو بھی اپنے عشاق کے لئے بیقرار رہا کرتا تھا اور ان کے انتظار میں تجھے نیند نہ آیا کرتی تھی۔

شعر (۱۵) فرماتے ہیں رات میں نے غالب کو رونے سے روکا ورنہ اس کا طوفان اشک بلند ہو کر آسمان کو جھاگ بنا دیتا۔

(۱۵) ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب ۱ خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا
اب میں ہوں اور ماتم اک شہر آرزو ۲ توڑا جو تم نے آئینہ تمثال دار تھا
گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں ۳ جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ حال پوچھ ۴ ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا
کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو —— مگر
۵- دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

شعر (۱) ودیعت بمعنی امانت۔ فرماتے ہیں آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے کہ گویا جگر میں جتنا خون تھا وہ مژگانِ یار کی امانت تھا اور اس لئے اس کے ایک ایک قطرے کا حساب اسی طرح دینا پڑیگا جس طرح امانت کا حساب دینا پڑتا ہے۔ (یادگارِ غالب)

شعر (۲) شہرِ آرزو سے ہجومِ تمنا مراد ہے۔ آئینہ تمثال دار سے مراد وہ آئینہ ہے جس میں تصویریں ہوں یہاں اس سے مراد عاشق کا دل ہے۔ مطلب ہے کہ تو نے میرے آئینہ دل کو توڑ کر مجھے ایک مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے کیونکہ میرا دل ایک ایسا آئینہ تھا جس میں آرزوؤں اور تمناؤں کی بہت سی تصویریں تھیں جو اس کے مٹنے کے ساتھ مٹ گئیں اور اس طرح مجھے ایک دل کے ساتھ ایک شہر کا ماتم کرنا پڑا۔

شعر (۳) ہوا بمعنی آرزو۔ رہگذار سے مراد معشوق کی رہگذار ہے یہ شعر نہایت بلیغ ہے مطلب یہ ہے کہ میری زندگی رہگذرِ معشوق کی آرزو میں ختم ہوئی ہے اور میرے اس انجام کا صلہ مجھے یہ ملنا چاہیئے کہ لوگ میری نعش کو گلیوں میں کھینچتے پھریں۔ اس شعر میں جو مفہوم پنہاں ہے وہ یہ ہے کہ عاشق کو معشوق کی گلی کا پتہ نہیں جس کی آرزو میں اس نے جان دی ہے۔ لہٰذا تاکید یہ ہے کہ میری نعش کو گلیوں میں کھینچے پھرو تاکہ رفتہ رفتہ عاشق کی نعش معشوق کی گلی میں پہنچ جائے اور یوں مدعائے دل حاصل ہو جائے۔

شعر (۴) سراب اس مقام کو کہتے ہیں جہاں کسی مسافر کو پانی کا دھوکہ ہو جائے اور اکثر یہ ریت میں ہوتا ہے مطلب ہے کہ دشتِ وفا کا حال مجھ سے نہ پوچھو۔ میں کیا بیان کروں صرف اتنا بتا دیتا ہوں کہ دشتِ وفا موجِ سراب کی طرح دھوکا دینے والا ہے جس طرح موجِ سراب پانی کا دھوکا دیکر مسافر کو ہلاک کر دیتی ہے اسی طرح دشتِ وفا میں کوئی حقیقت نہیں اس کا ہر ذرہ جوہرِ تیغ تیز ہے جہاں قدم رکھا وہیں ہلاک ہوا۔ مفہوم یہ ہے کہ میں آرام و

محبت کا ایک پیاسا مسافر تھا اور معشوق کی وفا کی صورت پر جو دراصل وفا نہ تھی بلکہ سراب وفا تھا مجھے وفا کا دھوکا ہوا اور اسکی تسکین باطل اور وعدہ خلافی نے مجھے مار ڈالا۔ اس شعر میں فریب وفا کے لحاظ سے استعارہ نہایت موزوں ہے

شعر (۵) مطلب یہ ہے غم عشق کو ہم بھی اوروں کی طرح نہایت معمولی اور کم تصور کیا کرتے تھے لیکن جب اس میں مبتلا ہوئے تو حقیقت حال سے خبردار ہوئے اور معلوم ہوا کہ یہ کم ہو تو پھر بھی ساری دنیا کے غم سے کچھ زیادہ ہی ہے

(۱۶) بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا ۱ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی ۲ در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو ۳ آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا
جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے ۴ جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا
عشرتِ قتل گہہ اہلِ تمنا مت پوچھ ۵ عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط ۶ تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا
عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا ۷ لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ۸ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
۹- جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

شعر (۱) انسان ہونا۔ شرف انسانیت سے سرفراز ہونا۔ (انسانیت کے خواص میں سب سے زیادہ نمایاں اور اہم خاصہ جذبات کو قابو میں رکھنا ہے۔ اگر جذبات پر قابو رکھنے میں آدمی کامیاب ہو جائے تو بیشک وہ صحیح معنوں میں انسان ہے۔

مطلب یہ ہے دنیا کا ہر کام آسان نہیں کہا جا سکتا جیسے کہ ہر آدمی انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے "یادگار غالب" میں مولانا حالی نے اس شعر پر تبصرہ کیا ہے: "شاعر کا دعوٰے یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی

دشوار ہے اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو عین انسان ہے اُس کا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں ہے بلکہ شاعرانہ استدلال ہے جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کر سکتا۔" مفہوم یہ ہے کہ نہ ہر کام آسان ہے اور نہ ہر آدمی انسان ہے۔

شعر (۲) گریہ بمعنی رونا۔ کاشانہ بمعنی گھر۔ در و دیوار سے بیابان ہونا ٹپکتا ہے یعنی ویرانی برس رہی ہے رونے میں آنسو ٹپکنے کی مناسبت سے لفظ "ٹپکے ہے" پر غور کیجئے تو صنعت مراعاۃ النظیر کا حسن پنہاں معلوم ہوگا۔ مطلب یہ ہے رونا میرے گھر کی خرابی کی دلیل ہے کیونکہ جو گھر ماتمکدہ ہو جائے وہ جلد ویران ہو جاتا ہے۔

شعر (۳) "دیوانگیِ شوق" یعنی ذوق و شوق کے غلبہ کا حد سے متجاوز ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ میں آپے سے باہر ہو کر دوست کی طرف جاتا ہوں اور پھر آپ ہی حیران ہوتا ہوں کہ میں یہاں کیوں آیا اور خیال کرتا ہوں کہ میں کہاں اور اُس کا دیدار کہاں۔ مفہوم یہ ہے کہ وفورِ اشتیاق سے آدمی از خود رفتہ ہو جاتا ہے ؎

یہ شوق تھا کہ جنوں تھا کہ تیرے کوچہ میں
ہزار بار گئے ہم ہزار بار آئے

اُس کی حسرت ہے جسے دل سے مٹا بھی نہ سکوں
ڈھونڈنے اس کو چلا ہوں جسے پا بھی نہ سکوں (امیرؔ)

شعر (۴) جلوہ بمعنی ظہور۔ "تقاضائے نگہ کرتا ہے" یعنی اس بات کا متقاضی ہے کہ "مجھے دیکھو"۔ یا یہ کہ مجھے صرف نگہ والے ہی دیکھ سکتے ہیں ہر کس و ناکس کی مجال نہیں۔ "جوہر آئینہ مژگاں ہونا چاہتا ہے" یعنی ہمہ تن چشم ہونا چاہتا ہے یا یہ کہ آئینہ کے قوسی رنگ اس لئے مژگاں ہونا چاہتے ہیں تاکہ آئینہ کو سوائے جلوہ یار کے اور تمام جلوؤں سے محفوظ رکھ سکیں اور آئینہ جو ہر وقت چشم حیرت بنا رہتا ہے ہر قسم کی آلائش سے پاک رہ سکے۔

مطلب یہ ہے جلوۂ دوست کا نظارہ عام ہے جس کا جی چاہے دیکھے۔ اس عمومیت کی بنا پر آئینہ ہمہ تن چشم بنا چاہتا ہے یا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جلوۂ دوست اہلیت رکھنے والی نگاہوں کا خواہاں ہے۔ ہر کس ناکس کی نگاہوں سے اسے پردہ ہے اسلئے وہ آئینہ بھی ہمہ تن چشم ہونے کے باوجود اہلیت پیدا کرنے کیلئے اپنے جوہر کو بطور مژگاں استعمال کرنا چاہتا ہے تاکہ سوائے جلوۂ یار کے اور کوئی جلوہ نہ دیکھے۔ دوسرا مطلب شعر سے زیادہ مواقفت رکھتا ہوا معلوم ہوتا ہے مفہوم یہ ہے کہ ان کا جلوہ ہر شے کو چشم حیرت بنا دیتا ہے۔

شعر (۵) عشرت بمعنی خوشی۔ قتل گاہ یعنی مشاہدہ جمال کی جگہ۔ اہل تمنا یعنی ذوق محبت رکھنے والے (عشاق) "عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا" یعنی عشاق کے لئے معشوق کی تلوار کا برہنہ ہونا عید کے چاند کا نکلنا ہے کہا جاتا ہے کہ رمضان المبارک کا چاند دیکھکر بطور فال تلوار دیکھا کرتے ہیں یہاں عریانی شمشیر کو ہلال عید کی طرف منسوب کرنا میرزا غالب کی جدت ہے نیز شمشیر سے مطلب یہاں ابروان یار ہیں جنکو ہلال سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے۔

مطلب یہ ہے ذوق محبت رکھنے والے یعنی عشاق کیلئے ابروئے یار کی جنبش یا عریانی شمشیر عید نظارہ ہے ؎

آؤ تم سے بھی گلے مل لیں ہم آج اے حسرتو!
ہے ہلال عید جو خنجر کف قاتل میں ہے

شعر (۶) "داغ تمنائے نشاط" یعنی حسرت نشاط یا خوشی کی آرزو جو پوری نہیں ہوتی۔ "بصد رنگ گلستاں ہونا" یعنی گلستاں کے صدہا پھولوں کی طرح شگفتہ ہونا۔ مطلب یہ ہے ہم تو داغ تمنائے نشاط لیکر اس دنیا سے رخصت ہوئے اب تم اکیلے عیش و عشرت کا لطف اٹھاؤ اور پھولو پھلو۔

شعر (۷) زخم تمنا یعنی حرماں نصیبی۔ ریش بمعنی زخم۔ غرق نمکداں ہونا یعنی خلش کا زیادہ ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ ارمان جیسے دل کے دکھنے اور زخم خوردہ جگر کی خلش میں بڑا لطف ہے۔ اس شعر پر حضرت بیخود نے اس طرح تبصرہ کیا ہے۔ "یہ شعر دو لخت ہے اور دو لخت شعر میں اکثر فعل محذوف ہوتا ہے اس خوبی کے ساتھ دونوں مصرعوں کو کاٹ کی قول تام ہونا مرزا ہی جیسے کامل فن کا کام ہے معنی شعر کے یہ ہیں کہ دل کے دکھنے یا پکنے کا زخم تمنا

کھانا باعث عشرت و شادمانی ہے اور زخم جگر کا نمکدان میں سرتاپا ڈوبا ہونا لذت عشق حاصل کرنیکی دلیل ہے۔

شعر (۸) زود پشیمان بمعنی جلد پشیماں ہونیوالا۔ مگر یہاں مرزا صاحب نے بطور طنز استعمال کیا ہے مفہوم اصل معنی کے خلاف ہے یعنی کار از دست رفتہ پر پشیمان ہونا ہے مطلب یہ ہے اگر میری زندگی میں وہ جفا سے توبہ کرتے تو میری جان کیوں جاتی اب میرے قتل کے بعد شرمندہ ہونا کار از دست رفتہ پر پشیماں ہونا ہے ؎

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ!
صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا؟ (اقبالؔ)

شعر (۹) فرماتے ہیں عاشق کا گریبان جس کو ہر حالت میں پھٹ کر تار تار ہونا ہے اسکی قسمت پر افسوس ہے کیونکہ عالم وحشت میں جنون کے ہاتھوں سے، ہجر یار میں وارفتگی اور بےچینی کی وجہ سے اور وصل میں یار کی دست درازیوں سے گریبان کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں اور وہ عاشق و معشوق دونوں کی چیرہ دستیوں کا شکار ہوتا ہے (مرزا صاحب کے اس اظہار عبرت میں ایک قسم کا معنوی تعلیل ہے۔ اس غزل کا مطلع اور مقطع دونوں اردو ادب میں بطور ایزاد و تمثیل مستعمل ہیں)۔

(۱۷) شب خمار ذوق ساقی رستخیز اندازہ تھا ۱ تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا
یک قلم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا ۲ جادۂ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
مانع وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے ۳ خانۂ مجنون صحرا گرد بے دروازہ تھا
پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن ۴ دست مرہون حنا، رخسار رہن غازہ تھا

نالۂ دل نے دیئے اوراق لخت دل بباد
۵۔
یادگار نالہ اک دیوان بے شیرازہ تھا

شعر (۱) خمار بمعنی نشہ کا اتار۔ ذوق ساقی۔ شراب کی آرزو جو ساقی سے وابستہ ہے۔ رستخیز یعنی مردوں کے اٹھنے کا دن یعنی قیامت۔ محیط بادہ یعنی وہ محیط جس میں شراب تھی اشارہ ہے بوتل یا ساغر کی طرف، صورت

خانہ بمعنی وہ شے جس میں صورت نظر آئے (جیسے تصویر کا چوکھٹا) صورت خانہ خمیازہ تھا یعنی اس میں جمائی کی صورت نظر آرہی تھی۔ مطلب یہ کہ رات کو ساقی کی توجہ کے انتظار نے حشر و نشر کی کیفیت پیدا کردی تھی۔ ہر چیز اٹھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ہاتھ انگڑائی سے اٹھ رہے تھے۔ شراب جوش کھا کر بوتل یا ساغر سے نکلی پڑتی تھی اور ہر طرف بے چینی کا اظہار ہو رہا تھا۔

شعر (۲) یک قدم وحشت بمعنی جنون محبت کی پہلی منزل یا محبت کا پہلا ہی قدم۔ درس بمعنی سبق یا نتیجہ۔ دفتر امکان و اثبات عالم ظاہر۔ لفظ "جادہ" کو "دشت" سے ملانا چاہیئے یعنی جادۂ دشت بمعنی صحرائے وحشت میں قدم رکھنا، اجزائے دو عالم یعنی رموز ظاہر و باطن جو مکان و لامکان سے وابستہ ہیں شیرازہ بمعنی رشتہ، اتحاد۔
مطلب یہ ہے جنون محبت کی پہلی ہی منزل نے درمحبت کے پہلے ہی قدم نے ہر دو عالم کی حقیقت سے واقف کردیا گویا صحرائے وحشت میں قدم رکھنا، رموز ظاہر و باطن کے (جو ہر دو عالم سے وابستہ ہیں) اتحاد و اجتماع کا باعث تھا مفہوم یہ ہے کہ جوش عشق سے دونوں عالم کی حقیقت منکشف ہوگئی۔

شعر (۳) مانع بمعنی منع کرنے والا۔ وحشت خرامی بمعنی بیساختگی سے چلنا۔ خانۂ مجنوں صحرا گرد یعنی جنگل میں پھرنے والے مجنوں کا گھر یہاں مراد جنگل سے ہے۔
مطلب یہ ہے لیلیٰ کیلئے جو مجنوں کی کشش محبت سے مجبور ہو کر گھر سے مجنوں کی ملاقات کیلئے محمل میں سوار ہو کر جنگل میں گئی تھی اور بخوف غمازی ساربان یا بہ پاس عصمت مجنوں سے مل نہ سکی تھی شاعر اس قصہ کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے کہ مجنوں کا گھر (جنگل) بے دروازہ تھا اور لیلیٰ کو روکنے والا وہاں کوئی دربان نہ تھا پھر کیا سبب مانع ہوا کہ لیلیٰ باوجود کشش محبت کے مجنوں تک نہ جاسکی۔

شعر (۴) انداز استغنا بمعنی لاپروائی اور مستغنی ہونے کا انداز۔ مرہون بمعنی احسانمند۔ غازہ بمعنی وسمہ یا پوڈر۔ مطلب یہ ہے کہ حسن بھی دراصل بالکل آزاد نہیں وہ بھی آرائش و زیبائش کا غلام ہے یہ حسن کی رسوائی نہیں تو کیا ہے استغنا کی شان تو یہ تھی کہ اسے کسی دوسری چیز کی ضرورت نہ ہوتی۔

شعر (۵) نالۂ دل یعنی اشعار۔ اوراقِ لختِ دل یعنی جذبات قلب. بباد دادن فارسی محاورہ میں برباد کرنے کو کہتے ہیں مگر یہاں ہوا میں پھیلانا یعنی مشہور کرنا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے مطلب یہ ہے یادگار نالہ یعنی اشعار کی یادگار ایک دیوان بے شیرازہ" اشارہ ہے "دیوان غالب" یعنی خود اپنے اشعار کی طرف کیونکہ اشعار ادھر اُدھر سے لیکر جمع کر لئے گئے ہیں، مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میرے جذبات قلب جو بذاتِ خود میرے قلب کی شکست کی آوازیں اور جو بیساختہ میرے دل سے نکل گئے ہیں وہ دیوان بے شیرازہ کی صورت میں بطور یادگار دنیا میں پھیل گئی ہیں

(۱۸) دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا ۱ زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائینگے کیا
بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک ۲ ہم کہینگے حالِ دل اور آپ فرمائینگے کیا
حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ ۳ کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائینگے کیا
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں ۴ عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا
گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی! ۵ یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائینگے کیا
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں ۶ ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائینگے کیا

ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ اُلفت اسدؔ
۷
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائینگے کیا

شعر (۱) دوست میری غمخواری میں کیا کوشش کرینگے۔ اب میرے ناخن تراش کر مرہم لگا دیا ہے اور اپنی تدبیر پر نازاں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جب تک میرا یہ زخم بھریگا میرے ناخن بھی بڑھ جائینگے اور میں پھر زخم کو گہرا کر دونگا

شعر (۲) شاعر اپنے معشوق سے مخاطب ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہاری بے نیازی اور استغنا کی کوئی حد ہونی چاہیئے میرا حال متوجہ ہو کر نہیں سُنتے اور ہر بار تجاہل عارفانہ سے کہتے ہو کہ کیا کہا۔ اس شعر میں کیا محل حکایت ہے جس طرح کسی دوسرے مقام پر کہا ہے ؎

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا   کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا؟

شعر (۳) اگر حضرت ناصح تشریف لاتے ہیں تو نہایت شوق سے لائیں لیکن ان کا تشریف لانا بالکل عبث اور بے سود ہوگا کیونکہ میرا عشق ایک ایسے درجہ تک پہنچ گیا ہے جہاں نصیحتوں کا کچھ فائدہ نہیں!

شعر (۴) تیغ و کفن ہر دو چیزیں موجود ہیں۔ دیکھیں آج میرے قتل کرنے میں کیا عذر کرینگے؟

منم آں سیر ز جاں گشتہ کہ با تیغ و کفن
تا در خانہ جلاد غزل خواں رفتم! (عرفی شیرازی)

شعر (۵) اگر ناصح نے قید کر دیا تو اچھا ہی سہی مگر کیا اس قید سے جنون عشق جاتا رہے گا (دوسرے مصرعہ میں استفہام انکاری و استعجابی ہے)

شعر (۶) ہم زلف محبوب کے غلام خانہ زاد ہیں زنجیر سے کیا بھاگیں گے اور حکم گرفتاری سے کیا گھبرائیں گے کہ وفا کے پابند ہیں جو قید سے بھی زیادہ ہے۔

شعر (۷) معمورہ بستی۔ مجازاً دہلی مطلب یہ ہے جبکہ دہلی میں غم الفت و محبت کا قحط ہے یعنی ایسے معشوق نہیں ہیں جن سے محبت کی جائے اور ہم جو غم الفت کے کھانے کے خوگر ہیں یہاں دہلی میں رہکر کیا کھائینگے؟

(۱۹) یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا ۱ اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا ۲ کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا ۳ کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو ۴ یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح ۵ کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا
رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا ۶ جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے ۷ غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے ۸ مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا ۹ نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا ۱۰ جو دوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالبؔ
۱۱۔ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا!

شعر (۱) ہماری قسمت میں وصالِ یار نہ تھا اچھا ہُوا موت آ گئی اگر زندہ رہتے تو اسی طرح انتظارِ یار میں بسر ہوتی۔

شعر (۲) معشوق سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں اگر تیرے وعدہ کرنے پر ہم زندہ رہے تو یہ سمجھ کہ ہم نے تیرے وعدہ کو جھوٹا سمجھا۔ اگر ہمیں اعتبار ہوتا تو مارے خوشی کے مرجاتے یعنی شادی مرگ ہو جاتی۔

شعر (۳) چونکہ تو نازک ہے اسلئے تیرے عہد کو بھی نازک ہی سمجھا ورنہ اگر وہ مضبوط ہوتا تو تجھ جیسا نازک انسان کبھی اس عہد کو نہ توڑ سکتا کیونکہ نازک انسان سے ایسا اہم کام نہیں ہو سکتا۔ پس تیرے عہد کی کمزوری ہی سے تیری نزاکت ظاہر ہے۔

شعر (۴) تیرِ نیم کش۔ وہ تیر جس کے لئے کمان پُوری نہ کھینچی گئی ہو یعنی آہستہ سے لگایا گیا ہو مطلب یہ ہے کہ تیرے تیرِ نیمکش کی لذت کوئی میرے دل سے پوچھے یعنی اسکی لذت سے بس میرا ہی دل واقف ہے اور اگر وہ جگر کے پار ہو جاتا تو یہ لُطف خلش جو مجھے حاصل ہے باقی نہ رہتا کیونکہ عشاق طبعاً تکلیف پسند ہوتے ہیں اس لئے جگر میں رہ جانے والے تیر کو پار ہو جانے والے تیر پر ترجیح دی ہے۔

شعر (۵) یہ کہاں کی دوستی ہے کہ دوست ناصح بن کر ترکِ عشق کی فرمائش کرتے ہیں اگر دوستی کا دعویٰ تھا تو میرے دردِ دل کا علاج کیا ہوتا میری غمگساری کی ہوتی۔

شعر (۶) شرار (چنگاری) پتھر میں پنہاں ہوتا ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں اگر شرارِ سنگ شرارِ غم کی نند ہوتا تو رگِ سنگ سے بھی لہو ٹپکتا کہ پھر بند نہ ہوتا۔ یعنی پتھر پر بھی اس غم کا اسقدر اثر ہوتا کہ اس کا جگر لہو ہو جاتا۔ دل میں آگ چھپ سکتی ہے مگر غم نہیں چھپ سکتا۔

شعر (۷) غم اگرچہ جان کا گھلا دینے والا ہے مگر اس سے کوئی شخص بچ نہیں سکتا اس لئے کہ دل موجود ہے اور دل کا خاصہ رنج و غم ہے اور وہ اس سے کبھی خالی نہیں رہ سکتا اسلئے غم عشق ہی غنیمت ہے کیونکہ اگر یہ نہ ہوتا تو دنیا کے دیگر افکار کا رنج لاحق ہوتا۔

شعر (۸) کس سے کہوں اور کیا کہوں کہ شب غم کیا شے ہے اس گھڑی کے مرنے سے تو یہ بہتر ہے کہ ایک مرتبہ مر کر اس عذاب سے نجات پا جاتا۔

شعر (۹) جنازہ اُٹھنے اور مزار بننے نے بدنام کر دیا اگر ڈوب مرتے تو کیا اچھا ہوتا۔

غرقۂ بحریم مارا از دیار ما مپرس
لقمۂ کام نہنگیم از مزار ما مپرس

شعر (۱۰) اگر ذات واحد میں دوئی ہوتی تو کہیں نہ کہیں وہ کسی کو ضرور دکھائی دیتا۔ اس شعر میں حضرت غالبؔ نے مسئلہ وحدتِ خداوندی کو شاعرانہ اور فلسفیانہ حیثیت سے ثابت کیا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ ذات باری ہر لحاظ سے بےمثل و یکتا اور بے چون و چگون ہے اس لئے اس کو کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ اگر اس میں دوئی کا شائبہ بھی ہوتا تو ضرور کہیں نہ کہیں نظر آتا۔

شعر (۱۱) غالبؔ تو نے جو یہ مسائل تصوّف بیان کئے ہیں۔ یہ ایسے ہیں کہ اگر تو شراب خوار نہ ہوتا تو یقیناً ہم تجھے ولی تصوّر کرتے۔

(۲۰) ہوَس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ۱ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
تجاہل پیشگی سے مُدّعا کیا ۲ کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا
نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں ۳ شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں ۴ تغافل ہائے تمکیں آزما کیا
فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے ۵ ہوَس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

نفس مَوجِ محیطِ بیخودی ہے ۶ تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا
دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے ۷ غمِ آوارگی ہائے صبا کیا
دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ۸ ہم اُسکے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
محابا کیا ہے میں ضامن اِدھر دیکھ ۹ شہیدانِ نگہ کا خونبہا کیا
سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن ۱۰ شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا
کیا کس نے جگرداری کا دعویٰ ۱۱ شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا
یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں ۱۲ یہ کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا

بلائے جاں ہے غالب اُسکی ہر بات
۱۳۔ عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

شعر (۱) نشاط۔ امنگ: نشاطِ کار۔ کام کرنے کی اُمنگ۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے یہ انسان کی ایک طبعی خصلت ہے کہ جسقدر فرصت قلیل ہوتی ہے اسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام دیتا ہے اور جسقدر زیادہ مہلت ملتی ہے اسی قدر کام میں تاخیر اور سہل انگاری زیادہ کرتا ہے پس اگر موت نہ ہوتی اور ہمیشہ زندہ رہنا ہوتا تو جینے کا لطف جاتا رہتا کیونکہ نہ تو یہ جوش و سرگرمی ہوتی اور نہ دنیا میں رونق نظر آتی۔ (یادگارِ غالب)

شعر (۲) یعنی میرا حال سُن کر تم کب تک کیا کیا کہہ کر ٹالنے کی کوشش کروگے۔ آخر اس تجاہلِ عارفانہ سے تمہارا مطلب کیا ہے؟

شعر (۳) نوازشہائے بیجا۔ جو رقیب پر ہوں۔ شکایت ہائے رنگین وہ شکایات جو بہ لہجۂ محبت ادا کی جائیں مطلب ہے کہ آپ جو رقیب پر بیجا عنایتیں فرماتے ہیں اور میں انہیں دیکھ کر شکایت کرتا ہوں تو آپ مجھ سے گلہ کیوں کرتے ہیں جب رقیب پر التفات ہو تو میری شکایت سے کیوں بُرا مانو۔ نہ گلہ کرو۔

شعر (۴) نگاہِ بے محابا۔ نگاہِ بے تکلف و بے حجاب۔ تغافل تمکین آزما۔ ایسا تغافل (چشم پوشی،) جس سے ارباب شوق کے صبر و استقلال کا امتحان لیا جائے۔ مطلب ہے کہ میں چاہتا ہوں آپ مجھ پر بے تکلفانہ نظر ڈالیں مگر آپ تغافل سے کام لیکر میرے صبر و تحمل کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔

شعر (۵) ہوس کو عشق کاذب۔ اور ناپائدار ہونے کی بنا پر شعلۂ خس سے تشبیہ دی ہے جسکی روشنی دم بھر سے زیادہ قائم نہیں رہ سکتی۔ مطلب یہ کہ رقیب کا عشق، عشق نہیں ہوس ہے اسکی محبت شعلۂ خس کی طرح بے ثبات ہے بھلا اس بوالہوس کو ناموسِ وفا کا کیا خیال ہو سکتا ہے یہ شعر رقیب پر طنزاً کہا ہے

شعر (۶) ہماری ہر سانس دریائے بیخودی کی ایک موج ہے یعنی ہر لمحہ بیہوشی کا دورہ ہوتا ہے اگر ساقی عطائے شراب میں تغافل کرتا ہے تو ہم کو کیا شکایت ہو سکتی ہے ہمیں تو اسکی صورت دیکھکر بیخودی ہو جاتی ہے

شعر (۷) عطر پیراہن سے مراد عطر پیراہن معشوق ہے مطلب یہ ہے کہ گر صبا کی آوارگی کے سبب پیراہن یار کے عطر کی خوشبو پریشان ہو جاتی ہے تو ہمیں اس کا کیا غم یعنی غم تو اس حالت میں ہو سکتا تھا۔ جب کہ ہم کو اس کے سونگھنے کا دماغ ہوتا۔

شعر (۸) انا البحر۔ میں دریا ہوں۔ ہمارا پوچھنا کیا؟ یعنی ہم بہت بڑی چیز ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر قطرے کے دل سے انا البحر (میں دریا ہوں) کا نغمہ نکل رہا ہے چونکہ پانی کا ہر قطرہ دریا میں ملکر دریا بنجاتا ہے اس بنا پر ہر قطرہ دریا ہونے کا دعوے کر رہا ہے اسی طرح ہم کو بھی اپنے مبدا کے ساتھ عینیت کا دعویٰ ہے کیونکہ ہم اسی بحر بیکراں (ہستی نامحدود الہٰی) کے ایک جزو ہیں۔

شعر (۹) تجھے ڈر ہے کہ اگر تو میری طرف دیکھے گا تو میں مرجاؤنگا مگر نہیں تجھے خوف نہ کرنا چاہیئے۔ میری طرف دیکھ اگر میں شہید نگاہ ہو گیا تو ذمہ لیتا ہوں کہ تجھے خونبہا نہ دینا پڑیگا کیونکہ قتل نگاہ کا خونبہا نہیں ہوتا

شعر (۱۰) غارتگر جنس وفا۔ بیوفا۔ بے مہر یہاں وفا کی بیقدری کرنیوالا مراد ہے یعنی تو جو یہ کہتا ہے کہ ہمیں شکست دل کی خبر نہیں تو کہیں شکست دل میں آواز بھی ہوتی ہے جو تجھے سنائی دے شکست رنگ شکست

قیمت دل سے تعبیر کیا ہے اور اسلئے جنس و غارت اسکے مناسبات ذکر کئے ہیں۔ دوسرے معنی اسکے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ شکست دل کی صدا تجھے اچھی معلوم ہوتی ہے تو دل شکنی کئے جا۔ بھلا دل کی اور صدائے شکستِ دل کی حقیقت کیا ہے۔ ہمیں تو تیری خوشی منظور ہے۔

شعر (۱۱) جگرداری، صبر استقلال۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ تمہاری فرقت میں صبر کرسکوں گا یا مجھے چین آجائے گا ؎

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا   کس کو ہے دعویٰ شکیبائی کا؟ (حالی)

شعر (۱۲) او قاتل! تو ایسا وعدہ کیوں کرتا ہے جس میں میرے ضبط کا امتحان ہو تیرے نزدیک تو یہ ایک وعدہ صبر آزما ہے مگر میرے لئے یہ ایک فتنۂ طاقت رُبا ہے۔ (طاقت کو زائل کرنے والا)

شعر (۱۳) اے غالبؔ اس کی ہر بات بلائے جان ہے۔ خواہ عبارت ہو خواہ اشارت و ادا ہو۔ جان لینے میں یہ سب ایک درجہ پر ہیں ؎

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ مے نگرم!
کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست! (نظیری)

(۲۱) درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا ۱ پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم ۲ اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا ۳ روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا
کم نہیں نازشِ ہم نامیٔ چشمِ خوباں ۴ تیرا بیمار بُرا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا
سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا ۵ خاک کا رزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا
نام کا میرے ہے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا ۶ کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا
ہر بُنِ مُو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوناب ۷ حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل ۸ کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا
تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے
۹- دیکھنے ہم بھی گئے تھے یہ تماشا نہ ہوا!

شعر (۱) درخور قہر و غضب، معشوق کے قہر و غضب کا سزاوار۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہمارے برابر کسی پر قہر و غضب نہیں کیا گیا تو پھر ہمارا کہنا کیا غلط ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا (یعنی ہم عشق میں یکتائے زمانہ ہیں)

شعر (۲) ہم عبادت و بندگی میں بھی آزاد منش و خوددار ہیں اگر خانہ کعبہ کا دروازہ بند دیکھا تو وہاں سے واپس چلے آئے، اس شعر میں شاعر نے اپنی آزادگی اور خودداری کے پردے میں کعبہ کی عظمت و بزرگی بیان کی ہے کہ وہ ایسی بارگاہ رفیع ہے کہ اس کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا اور جس کا باب فیض ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔

شعر (۳) بت۔ معشوق۔ آئینہ سیما۔ بت کی صفت ہے۔ سیما یعنی پیشانی۔ مطلب یہ ہے کہ تیرا مقابل کوئی نہ ہو سکا اور ہر ایک نے تیری یکتائی حسن کے دعوے کو تسلیم کر لیا۔ (اس شعر میں وحدت وجود کو بیان کیا ہے)

شعر (۴) چشمِ خوباں (معشوقاں) کی بھی صفت "بیمار" ہے پس بیمار عشق ہونے میں فخر ہمنامی کا حاصل ہونا ظاہر ہے۔ (چشم معشوق کو نرگس بیمار اور چشم بیمار کہتے ہیں)

شعر (۵) سینہ کا داغ ہے، باعث ننگِ سینہ ہے خاک کا رزق ہے یعنی رائگاں ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو قطرۂ آب دریا تک نہیں پہنچتا وہ جذب خاک ہو کر ضائع ہو جاتا ہے اور مٹی پر ایک داغ پیدا کر دیتا ہے اسی طرح جو نالہ لب تک نہیں آتا اس کے ضبط کرنے سے سینہ میں داغ پڑ جاتا ہے۔

شعر (۶) محبت کا وہ دکھ جو کسی کو نہ ملا میرے لئے مخصوص کر دیا گیا اور وہ فتنہ جو دنیا میں نہیں اٹھا میرے واسطے مصیبتیں جمع کر رہا ہے یعنی میرے درپے ہے۔

شعر (۷) اس شعر میں استفہام انکاری ہے یعنی عشق کا تذکرہ کیا جائے اور آنکھوں سے خون نہ ٹپکے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے اگر ایسا ہو تو یوں کہئے کہ وہ افسانہ عشق کا ہے کو ہے داستان امیر حمزہ ہے (داستان امیر حمزہ

واقفیت نہیں رکھتی اس لئے اس کے رزم بزم اثر سے خالی ہیں۔

شعر (۸) دیدۂ بینا یعنی نگاہِ عارف۔ کچھ لڑکوں کا کھیل نہیں ہے کہ اُسے قطرہ میں دریا اور جزو میں کُل دکھائی نہ دے یعنی دیدۂ عارف ضرور جزو میں کُل کا ملاحظہ کرے گا۔

شعر (۹) مشہور خبر تھی کہ غالب کو سزا دی جائے گی اور اُس کے ٹکڑے اُڑا دیئے جائینگے۔ یہ تماشا دیکھنے ہم بھی گئے تھے مگر افسوس یہ تماشا نہ ہوا۔

(۲۲) اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سرپنجۂ مژگانِ آہو پُشت خار اپنا

شعر (۱) جنوں جولاں، جنون رکھنے والا۔ جولاں۔ کودنا۔ پشت خار۔ ایک آلہ جس میں ہاتھی دانت یا لوہے کا پنجہ کسی پتلی گول لکڑی یا لوہے پر لگاتے ہیں۔ مطلب ہے کہ مجھ میں اتنی وحشت ہے اور میں ایسا بے سروسامان مجنون فقیر ہوں کہ میرے پاس پشت خار تک نہیں جس سے میں اپنی پیٹھ کھجلا سکوں چونکہ میں جنوں میں دوڑا دوڑا پھرتا ہوں اور اس دوڑ میں ہرن بھی مجھ سے پیچھے رہ جاتے ہیں اور ان کا سرپنجۂ مژگاں میری پُشت کو لگتا ہے اور وہی پشت خار کا کام دیتا ہے پنجہ میں اور مژگاں میں اور پشت خار میں جو وجہ شبہ ہے وہ ظاہر ہے یعنی شکل تینوں کی ایک سی ہے۔ مژگاں کو پہلے پنجہ سے تشبیہ دی پھر پنجہ کو پُشت خار سے۔

(۲۳) لیے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا ۱ بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا
نہ ہو حُسن تماشا دوست رسوا بے وفائی کا ۲ بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا
زکوٰۃِ حُسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا ۳ چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا
نہ مارا جان کر بیجرم قاتل تیری گردن پر ۴ رہا مانندِ خونِ بیگنہ حق آشنائی کا
تمنائے زباں محوِ سپاس بے زبانی ہے ۵ مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا
وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے ۶ چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

؛ ہانِ ہرزت بیغارہ جو زنجیبیدہ رسوائی ۷ عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا
نہ دے نامہ کو اتنا طول **غالب** مختصر لکھ دے
۸ کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہائے جدائی کا

شعر (۱) بخشش الہی کی نذر کے واسطے ہمارے پاس صرف شرم نارسائی کا تحفہ ہے۔ دوسرے مصرعہ میں تحفہ کی تشریح کر دی ہے یعنی ہمارے پاس اس دعویٰ پارسی کا تحفہ ہے جو سو رنگ سے خون میں غلطیدہ ہے یعنی سو مرتبہ گناہوں کے ہاتھ مجروح ہو چکا ہے۔

شعر (۲) حسن تماشا دوست۔ وہ حسن جسے یہ پسند ہو کہ لوگ اسے دیکھیں مطلب یہ ہے کہ اگر یار کو میرے علاوہ دوسروں کو بھی اپنا نظارگی حسن بنانا پسند ہے تو اس پر شکست عہد و بیوفائی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ اسکے دیکھنے والوں کی نظر میں تو گویا مہریں ہیں جن سے اسکی پارسائی کا دعویٰ ثابت ہوتا ہے مولانا طباطبائی اس شعر میں طنز کا پہلو نکالتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ شاعر معشوق آوارہ مزاج پر طعن کرتا ہے کہ بھلا تمہیں کون بیوفا کہہ سکتا ہے اگر سو آدمیوں کی آنکھ تم پر پڑی تو گویا سو مہریں ہو گئیں کہ تم پارسا ہو اس طعن کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ تماشا دوست ہو کر دو راغیار سے تانک جھانک کرکے پارسائی کجا اور خیانت و بیوفائی کی رسوائی و بدنامی سے کہاں بچ سکتے ہو"

شعر (۳) جلوہ بینش مراد معشوق۔ مہر آسا۔ مانند آفتاب۔ مطلب یہ ہے کہ اے معشوق زکوٰۃ حسن ادا کر تاکہ فقیر کا کاسہ گدائی ایسا چراغ بنجائے جو ہمسر آفتاب ہو۔ مولانا طباطبائی کے نزدیک کاسہ گدائی دل سے استعارہ ہے" کہتے ہیں۔ اے جلوہ بینش! میرے کشکول دل کو زکوٰۃ عرفان دیکر روشن کر دے کہ فقیر کیلئے وہ چراغ ہدایت ہو جائے اور آفتاب کی طرح شب تار جہالت کو دن کر دے۔

شعر (۴) حق آشنائی۔ دوستی و محبت کا حق۔ مطلب یہ ہے کہ تو نے ایک مشتاق قتل کو بے جرم سمجھ کر قتل نہ کیا اور خیال کیا کہ یہ بیگناہ ہے اس کا خون کون اپنی گردن پر لے مگر یہ نہ سمجھا کہ حق آشنائی اسی طرح تیری گردن پر رہے گا جس طرح خون بے گناہ گردن پر رہ جاتا ہے۔

شعر (۵) تمنائے زباں یعنی آرزوئے عرضِ مدعا۔ محوِ سپاس، ثنا خواں، بے زبانی۔ خاموشی بے دست و پائی بے سروسامانی، مطلب یہ ہے کہ زبان کی تمنا اس شکر میں مشغول ہے کہ اسکو نعمت بے زبانی عطا ہوئی۔ کیونکہ بے زبان ہونے کی وجہ سے بے سروسامانی کے شکوے کے تقاضے سے نجات مل گئی اور درجہ تسلیم و رضا نصیب ہوا

اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زبان کی تمنا اسبات کا تقاضا کر رہی تھی کہ بے سروسامانی کا شکوہ کر کے انکو رحم کی ترغیب دی جائے مگر چونکہ انکو میری بے سروسامانی دیکھ کر خود بخود رحم آگیا اسلئے تمنائے زبان بے زبانی کا شکریہ ادا کر رہی ہے کیونکہ اسکی وجہ سے اس کا مقصد پورا ہو گیا۔

شعر (۶) نفس یعنی غزل سرائی۔ نکہتِ گل، پھولوں کی خوشبو۔ مطلب یہ ہے کہ رنگینیٔ چمن اور جوشِ بہار سے میرے دل میں شاعری کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور یہی ایک چیز نکہتِ گل کا بھی سبب ہے حاصل یہ ہے کہ میرا نفس نکہتِ گل سے کم نہیں کیونکہ علت دونوں کی ایک ہے۔ جلوۂ چمن سے مراد فصلِ بہار اور جوشِ گل ہے۔

شعر (۷) پیغارہ۔ لعن طعن، ہر بت پیغارہ جو یعنی ہر وہ معشوق جو لعن طعن کرنا چاہتا ہے۔ زنجیرِ رسوائی۔ سلسلۂ بدنامی یعنی ایک زبان سے دوسری زبان تک بدنامی کی کڑی ملتی جلتی چلی جاتی ہے۔ عدم معشوق کا دہن۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے جور و ستم کا ہر ایک حسین کے منہ میں شکوہ ہے اور ہر ایک حسین کا دہن گویا ایک حلقہ ہے اور بہت سے حلقوں سے زنجیر بنتی ہے تو اس طرح گویا ایک زنجیرِ رسوائی بن گئی ہے جو تیری نیکنامی کے پاؤں میں پڑ گئی ہے دوسرے مصرع میں شاعر اپنے خیال کو اور بلند کرتا ہے اور کہتا ہے کہ معشوق کا منہ معدوم ہے اور تیرا شکوہ ہر ایک معشوق کے ذہن میں ہے تو لازم ہوا کہ تیری بیوفائی کا چرچا عدم تک ہے۔

شعر (۸) اے غالب نامہ کو اتنا طول نہ دے اور مختصراً اتنا لکھ دے کہ تمہارے فراق بیان کرنے کی حسرت دل میں رکھتا ہوں حسرت سنج ہوں یعنی حسرت رکھتا ہوں۔

(۴۲) گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا ۱ بے تکلف داغِ مہ مُہرِ دہاں ہو جائیگا
زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب ۲ پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا

لے تو لوں سوتے میں اُسکے پاؤں کا بوسہ مگر ۳ ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا
دلکو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا ۴ یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائیگا
سبکے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہُوا ۵ مُجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائیگا
گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط ۶ شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا
باغ میں مجھکو نہ لیجا ورنہ میرے حال پر ۷ ہر گلِ تر ایک چشمِ خونفشاں ہو جائیگا
وائے گر میرا تیرا انصاف محشر میں نہ ہو ۸ اب تلک تو یہ توقع ہے کہ وہاں ہو جائیگا
فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ ۹ دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا

شعر (۱) اندوہ - رنج و غم - مُہرِ دہاں - مُہرِ خاموشی - داغِ ماہ کو باعتبار سیاہی و شباہت مُہر سے تعبیر کیا۔ مطلب ہے کہ اگر شبِ ہجر کا سوز و غم بیان کر سکوں تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ چاند کا داغ میرے لئے گویا مُہرِ خاموشی بنگیا تھا

نوٹ:۔ اس شبِ فرقت کے اندوہ کی طرف اشارہ ہے جو شبِ ماہ میں تھی اور عشاق کے لئے یہ شب محرکاتِ جذبات میں سے ہے۔

شعر (۲) زہرہ آب ہونا - پتہ پانی ہونا مطلب ہے کہ شامِ ہجر کی ماہیت ہر ایک کا پتہ پانی کر دیتی ہے، تو کیا عجب ہے کہ چاندنی کا پتہ بھی پانی ہو جائے اور صورتِ سیلاب اختیار کر کے میرے گھر کو بہا لیجائے مفہوم یہ ہے کہ شامِ جدائی میں وہ چیزیں جو نشاط افزا ہوتی ہیں وہ بھی باعثِ تکلیف بن جاتی ہیں۔

شعر (۳) اس شعر میں شاعر اپنی محبت کی بے لوث اور بے غرض ثابت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ معشوق خوابِ راحت میں ہے اور اس حالت میں مَیں اسکے پاؤں کا بوسہ لے تو سکتا ہوں۔ لیکن ڈر ہے کہ کہیں وہ مجھ سے بدگمان نہ ہو جائے اور مجھے بوالہوس خیال کرے۔

شعر (۴) فرماتے ہیں ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ دل کو راہِ وفا میں صرف کرینگے۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ یہ پہلے ہی معشوق کے امتحان کی نذر ہو جائے گا۔

شعر (۵) فرماتے ہیں ہر ایک دل میں تیری جگہ ہے، تمام عالم تجھ سے محبت کرتا ہے اگر صرف تو مجھ سے راضی ہو گیا تو سارا زمانہ مجھ سے راضی ہو جائے گا یہ شعر تصوف کے رنگ میں ہے اور شاعر نے اس میں اس محاورہ کی وجہ وجیہہ بیان کی ہے "خدا مہربان تو سب مہربان" ؎

سائیں اکھیاں پھیریاں تو بیری ملک جہان
ٹک اک جھولا مہر کا تو لاکھوں کریں سلام (آسی)

شعر (۶) نگاہ گرم بمعنی نظر عتاب، خس بمعنی گھاس۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کی نظر عتاب اسی طرح ضبط نالہ وزاری کی تعلیم دیتی رہی جیسے کہ مجھ کو دے رہی ہے تو اس کا اثر یہ لازمی ہے کہ شعلۂ آتش خس و خاشاک میں اس طرح پوشیدہ ہو جائے جس طرح خون رگوں میں چھپا ہوا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ عشق مانند شعلہ ہے اور دل مثل خس ہے محض تیری نگاہ عتاب کی تعلیم ضبط سے میں اس شعلہ (عشق) کو دل (خس) میں چھپائے ہوئے ہوں ؎

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

شعر (۷) فرماتے ہیں میرا حال ایسا خراب ہے اور میری حالت ایسی زار ہے کہ اگر تو مجھے باغ میں لیجائیگا تو ہر پھول میری حالت کو دیکھ کر خون کے آنسو بہائے گا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سیر باغ بجائے تفریح کے بے لطف ہو جائے گی۔

شعر (۸) فرماتے ہیں اب تو میں اس توقع پر تیرے ظلم و جور کو برداشت کر رہا ہوں کہ حشر کے دن میرا تیرا انصاف خدا کے سامنے ہوگا اور میری مظلومی کی داد مل جائیگی۔ اگر خدانخواستہ وہاں بھی نہ ہوا۔ تو پھر مجھ پر قیامت گزر جائے گی۔

شعر (۹) فرماتے ہیں۔ اسد! تو بھی تو خود دانا ہے خیال کر آخر اس دوستی میں کیا فائدہ ہے مثل مشہور ہے "نادان کی دوستی جی کا زیان"

(۲۵) دردِ منّت کشِ دوا نہ ہُوا ۱ میں نہ اچھا ہُوا بُرا نہ ہُوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو ۲ اک تماشہ ہُوا گِلا نہ ہُوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں ۳ تو ہی جب خنجر آزما نہ ہُوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب ۴ گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہُوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی ۵ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہُوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ۶ بندگی میں مرا بھلا نہ ہُوا
جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی ۷ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما ۸ کام گر رُک گیا روانہ ہُوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے ۹ لے کے دل دلستاں روانہ ہُوا
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
۱۰۔ آج غالبؔ غزل سرا نہ ہُوا

شعر (۱) منت کش ہونا۔ احسان مند ہونا۔ فرماتے ہیں میں نہ اچھا ہُوا تو کچھ بُرا نہ ہوا اگر میں اچھا ہو جاتا تو مجھے دوا کا احسان مند ہونا پڑتا حالانکہ کسی کا احسان میری طبع غیور کو پسند نہیں۔ ؎

نہ پکڑیں دامنِ الیاس گردابِ بلا میں ہم
کہ بدتر ڈوب مرنے سے ہے جینا اس سہارے کا

شعر (۲) فرماتے ہیں میں آپ سے آپ کی بے اعتنائی کا گلہ کرتا ہوں تو آپ رقیبوں کو کیوں جمع کرتے ہیں میرا گلہ گلہ نہ ہُوا بلکہ ایک تماشا ہو گیا۔

شعر (۳) ہم اپنے مقدر کی آزمائش کرنے کہاں جائیں جب تو نے ہی اپنے خنجر کو ہماری گردن پر نہ آزمایا یعنی ہماری خواہش شہادت کو پُورا نہ کیا۔

شعر (۴) فرماتے ہیں۔ تیرے لب بہت میٹھے ہیں کہ رقیب کی گستاخی پر تو نے اُسے گالیاں بھی دیں مگر وہ اُن سے بے مزہ یعنی ناراض نہ ہُوا۔ شیریں کھانا۔ مزہ وغیرہ نہایت مناسب الفاظ ہیں جو ایک شعر میں جمع کر دیئے ہیں اور اسی کا نام حُسن شاعری ہے۔

شعر (۵) فرماتے ہیں۔ آج ان (معشوق) کے آنے کی خبر گرم تھی لیکن میری بے سر و سامانی کی یہ کیفیت ہے کہ اور دن خیر بوریا تو ہوتا تھا آج بوریا بھی نہیں ہے۔

شعر (۶) مرزا صاحب نے اس شعر میں عجیب شوخی برتی ہے جو کہیں دیکھنے میں نہیں آئی یہ شعر اور اسکے بعد کا شعر دونوں بیت الغزل ہیں فرماتے ہیں میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھ کو سوائے نقصان کے کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں بلکہ عبدیت ہے۔ بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے (یادگارِ غالبؔ)

شعر (۷) فرماتے ہیں اگر میں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی تو اس میں کون سی فخر کی بات ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم اس کا حق کچھ بھی ادا نہ کر سکے ؎

سمجھے تھے جن کو لوگ ہمارا اُنہیں کا تھا
کچھ غُل مچا تو یہ بھی اشارا اُنہیں کا تھا
(اکبرؔ)

شعر (۸) فرماتے ہیں۔ کام جب رُک جاتا ہے تو روا نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے زخم کے دب جانے پر چاہیئے تھا کہ لہو بھی رواں نہ ہوتا لیکن یہاں ایسا نہیں ہُوا اور زخم کے دب جانے پر بھی لہو جاری ہے۔ (اس شعر میں اپنی بدنصیبی کا اظہار نہایت سادگی سے فرمایا ہے)

شعر (۹) فرماتے ہیں یہ اندازِ رہزنی ہے یا طریقِ دلستانی (دلربائی) کہ معشوق دل لیتے ہی غائب ہو گیا۔ اس شعر میں شاعر نے قافیہ معمولہ استعمال کیا ہے اسے متقدمین نے عیوب شعر میں شمار کیا تھا لیکن فصحائے متاخرین کے نزدیک یہ حُسن شعر ہے۔

شعر (۸) کہا جاتا ہے کہ ایک مشاعرہ قلعہ معلیٰ میں کسی شاہزادہ کے محل پر منعقد ہوا تھا۔ مرزا صاحب نے حُسن اتفاق سے طرح میں غزل نہ لکھی تھی جب احباب کا اصرار حد سے متجاوز ہو گیا تو یہ غزل غیر طرح پڑھ دی۔ مقطع پہلے سے اس مضمون کا کہہ لیا تھا۔

(۲۶) گلہ ہے شوق کو بھی دل میں تنگیٔ جا کا ۱ گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب ۲ مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا
حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی ۳ دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیشِ دنیا کا
غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو ۴ مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا
ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہوں ۵ کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا
دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے ۶ ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا
نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے ۷ مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا
فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ
۸
جفا میں اس کی ہے انداز کار فرما کا

شعر (۱) فرماتے ہیں۔ میرا شوق اتنا زیادہ ہے کہ وہ میرے دل میں نہیں سما سکتا اور تنگی جا کی شکایت کرتا ہے حالانکہ میرا دل اتنا وسیع ہے کہ دونوں عالم اس میں سما سکتے ہیں اور یہ واقعہ ایسا ہے کہ جیسے ایک موتی میں دریا کا تمام اضطراب (طوفان) سما جائے گہر کو دل سے اور شوق کو اضطراب دریا سے مشابہ کیا ہے۔

شعر (۲) پاسخ مکتوب یعنی جواب خط۔ خامہ فرسائی یعنی لکھنا، تحریر کرنا۔ فرماتے ہیں کہ میں جانتا ہوں کہ تو مجھے جواب خط نہ دیگا لیکن کیا کروں ذوق خامہ فرسائی سے مجبور ہوں یعنی چار و ناچار لکھنا ہی پڑتا ہے۔

شعر (۳) بہار کو بوجہ رنگینی و زود فنائی حنائے پائے خزاں سے تشبیہ دی، فرماتے ہیں اگر بہار ایسی ہی زود فنا اور ناپائدار ہے تو بہار ہی کیا ہے جس کی رنگینی رنگِ حنا کی طرح چند روز میں زائل ہو جاتی ہے۔ دوسرے مصرع

کا مفہوم یہ ہے کہ عیشِ دُنیا فانی اور رنج و تکلیفِ خاطر دائمی ہے۔

شعر (۴) فرماتے ہیں کہ میں اس وقت غمِ فراقِ محبوب میں مبتلا ہوں۔ مجھ کو اسوقت سیر باغ کیلئے مجبور نہ کرو۔ کیونکہ مجھ کو پھولوں کی بیجا ہنسی اچھی معلوم نہیں ہوتی۔

شعر (۵) محرمی حُسن یعنی حسن حقیقی تک رسائی، ہر بُنِ مُو یعنی رونگٹا رونگٹا۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ میرا ہر بُنِ مو یعنی رونگٹا رونگٹا چشم بینا کا کام کر رہا ہے لیکن باوجود اسکے میری رسائی ابھی تک کُنہ ذات تک نہیں ہے یعنی حُسن حقیقی کی معرفت سے محروم ہوں۔ نیز ہر بُن مو کو چشم بینا اس لئے کہا ہے کہ جب ہر شئے آئینہ ظہورِ الٰہی ہے تو بُن مو بھی اس میں شامل ہے ؎

در ہر بن مو کہ می نہی گوشش فوّارۂ فیض اوست چہ گوشش

شعر (۶) فرماتے ہیں۔ ابھی ان کی طرف سے ناز و ادا کا آغاز بھی نہیں ہُوا تھا کہ ہمنے اپنا دل انکی نذر کر دیا۔ ہم تقاضائے حُسن کو برداشت نہیں کر سکتے۔ مطلب یہ کہ ادا و ناز کو ہم دل نہ دیتے تو حُسن ہم سے دل لینے کا تقاضا کرتا مگر ہم نے اس تقاضا سے بچنے کیلئے پہلے ہی اپنا دل انکی نذر کر دیا تاکہ تقاضا کی نوبت ہی نہ آئے۔

شعر (۷) فرماتے ہیں۔ اے دوست! یہ نہ کہہ کہ میں حسرتِ دل کے مطابق رو رہا ہوں، یہ بات ہرگز نہیں ہے میری نگاہ میں دریا کا جمع و خرچ ہے یعنی جسقدر آنسو میں نے بہائے ہیں اُس سے کہیں زیادہ رونے کی حسرت میرے دل میں موجود ہے۔ نیز آسی صاحب کے نزدیک یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ میں اس قدر رو چکا ہوں کہ اتنی مجھے حسرت بھی نہ تھی۔ (دریا دل سے استعارہ ہے)

شعر (۸) فرماتے ہیں۔ جب میں آسمان کو دیکھتا ہوں تو مجھے وہ یاد آتا ہے اسلئے کہ آسمان جو ظلم و ستم کرتا ہے اسی کے حکم کے مطابق کرتا ہے۔ (کار فرما یعنی حاکم حقیقی)

(۲۷) قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہُوا ۱ خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہُوا
اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا ۲ غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہُوا

شعر (۱) اس شعر کی شرح شارحین کلام غالب نے مختلف طریق پر کی ہے لیکن قابل توجہ شرح وہ ہے جو حضرت طباطبائی اور مولانا حسرت نے فرمائی ہے، طباطبائی صاحب فرماتے ہیں "گرفتگی، دلبستگی، تنگی و ضبط نفس حیرت کے لوازم ہیں اور جب ہر قطرے میں حیرت کے سبب یہ صفات پیدا ہوئے تو وہ موتی بن گیا اور پیالہ میں جو لکیر تھی وہ عقد مروارید بن گئی اس بیان سے صرف حیرت کی شگرف کاری کا اظہار مقصود ہے لیکن یہ مضمون کہ یہ حیرت حسن ساقی کو دیکھ کر پیدا ہوئی مصنف کے ذہن میں رہ گیا۔

حسرت صاحب فرماتے ہیں، جب ساغر مے لب یار سے ملا تو قطرہ ہائے مے فرط حیرت سے منجمد ہو گئے اور گوہر بن گئے اور خط جام رشتۂ گوہر کی مانند ہو گیا۔

آسی صاحب کی رائے ہے کہ طباطبائی صاحب نے اس شعر کی شرح میں بالکل بعید از قیاس معنی پہنا کر مصنف کو "المضمون فی بطن الشاعر" کا الزام دیا ہے اور کئی الفاظ بیکار چھوڑ دیئے اور حسرت صاحب کی شرح میں بھی وہ باتیں ہیں جن کا ثبوت الفاظ شعر سے نہیں ملتا۔ آسی صاحب فرماتے ہیں "میرا خیال یہ ہے کہ مصنف یہ کہنا چاہتا ہے" قطرہ مے کا کام حیران کرنا ہے اور وہ حیرت نفس پرور اور روح پرور ہے خط جام مے کو اس کی روح پروری نے رشتۂ گوہر بنا دیا ہے اس سے فقط مدح شراب مقصود ہے۔

میرے خیال میں آسی صاحب نے جو اعتراض طباطبائی اور حسرت پر کیا ہے وہ نقص خود ان کی اپنی شرح میں بھی موجود ہے مولانا حسرت کی شرح نہایت قرین قیاس ہے۔ اور آسی صاحب کا اعتراض درست معلوم نہیں ہوتا سید وحید الدین بیخود دہلوی نے اس شعر کی شرح خود مرزا غالب کے ایک خط سے نقل کی ہے مرزا صاحب فرماتے ہیں "قطرہ جو ٹپکنے میں بے اختیار ہے افراط حیرت سے ٹپکنا بھول گیا اور برابر بوندیں جو جم کر رہ گئیں تو پیالے کا خط اس تاگے کی صورت بن گیا جس میں موتی پروئے گئے ہوں۔"

شعر (۲) فرماتے ہیں معشوق کو میرے عشق صادق کا یقین ہے اور اس قدر اعتبار ہو گیا ہے کہ اگر غیر بھی کبھی کوئی آہ کرتا ہے تو معشوق خوف رسوائی سے مجھ پر خفا ہوتا ہے اور غیر کی طرف اس کا گمان بھی نہیں جاتا۔

(۲۸) جب بہ تقریب سفر یار نے محمل باندھا ۱ تپش شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا
اہل بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخی و ناز ۲ جوہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا
یاس و امید نے اک عربدہ میداں مانگا ۳ عجز ہمت نے طلسم دل سائل باندھا
نہ بندھے تشنگیٔ شوق کے مضمون غالب
۴ گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

شعر (۱) فرماتے ہیں جب یار نے سفر کا ارادہ کیا اور اونٹ پر محمل کسا اور باندھا تو ہمارا دل نہایت بیقرار ہوا اور ہمارے شوق نے خاک کے ہر ذرہ پر ایک دل باندھ دیا تاکہ سفر کے خاتمہ تک یار کے ساتھ ساتھ رہے۔ مفہوم یہ ہے کہ عاشق چاہتا تھا کہ وہ اس سفر میں دوست کے ہمرکاب ہونے کی سعادت حاصل کرے لیکن جب ایسا نہ ہو سکا تو عاشق نے اپنے دل کے ٹکڑوں کو خاک کے ہر ذرہ پر باندھ دیا اور اس طرح محمل کے ساتھ ہی دل تپاں بھی رخصت ہوا۔

شعر (۲) اہل بینش بمعنی دیکھنے والے، حیرت کدہ بمعنی آئینہ جس میں عکس یار بہ صد شوخی و ناز جلوہ گر ہے طوطی بسمل سے مراد آئینہ یار کے جوہروں کی وہ سبزی جو متحرک معلوم ہوتی ہے نیز آئینہ سے مراد فولادی آئینہ ہے جس میں جوہر ہوا کرتے ہیں اور فولاد کا رنگ سبز ہوتا ہے اور سبز رنگ کو ہمیشہ طوطی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ دیکھنے والوں کے نزدیک جوہر آئینہ کی سبزی جو اطراف و جوانب سے متحرک معلوم دیتی ہے طوطی بسمل ہے جیسے یار نے شوخی و ناز کی چھری سے بسمل کر دیا ہے اور وہ تڑپ رہی ہے۔

شعر (۳) عربدہ بمعنی میدان، میدان جنگ و پیکار، یاس بمعنی ناامیدی، دل سائل کو ایک طلسم و جنگ گاہ امید و یاس قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص کچھ کرنے کی ہمت نہیں رکھتا وہ سائل بن کر امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے حاصل یہ ہے کہ سوال کرنا ایک مذموم شے ہے اور یہ کم ہمت لوگوں کا کام ہے اور اکثر اس کی محرک پست ہمتی ہوتی ہے جو سائل کے دل کو ایک طلسم یاس و امید بنا دیتی ہے۔

شعر (۴) اے غالب میں اپنے ذوق کی تشنگی کے مضمون کو کما حقہ ادا نہیں کر سکا اگرچہ میں نے دریا کو بھی

ساحل باندھا یعنی میرے ذوق میں وہ تشنگی ہے کہ میں نے دریا کو بھی ساحل قرار دیا لیکن یہ بھی کم ہے۔ میں ابھی اپنے ذوق و شوق کی تشنگی کی حالت کو اچھی طرح بیان نہیں کرسکا۔

(۲۹) میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں ۱ گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا
ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں ۲ وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا
درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا ۳۔

شعر (۱) فرماتے ہیں۔ مقام حیرت ہے مجھ جیسا شرابی بزم شراب سے یوں پیاسا چلا آئے یہ مانا کہ میں نے توبہ کرلی تھی اس لئے ساقی سے سوال نہ کیا مگر ساقی نے مجھے بے طلب کیوں نہ پلادی؟ ؎

من اگر توبہ ز مے کردہ ام اے سرو سہی
تو خود ایں توبہ نہ کردی کہ مرا مے ندہی
(دلگ بیگی دختر جلایئر)

شعر (۲) فرماتے ہیں۔ وہ دن گئے جب اپنا دل اور جگر الگ الگ تھے اب تیرے تیر نظر نے دونوں کو چھید ڈالا ہے ؎

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
(غالب)

شعر (۳) اس شعر میں مشکل گرہ کا استعارہ اور تدبیر ناخن کا استعارہ ہے جب رشتہ بے گرہ تھا سے مراد جب کوئی مشکل نہ تھی، ناخن گرہ کشا تھا سے مراد رفع مشکل پر قدرت تھی مطلب یہ ہے کہ درماندگی اور عاجزی کی حالت میں اگر کوئی تدبیر ہوسکے تو جانوں ورنہ جب کوئی مشکل نہ تھی تو سب تدبیریں خیال میں آتی تھیں۔

(۳۰) گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا ۱ بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
تنگیٔ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے ۲ کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا
بعد یک عمر ورع بار تو دیتا بارے ۳ کاش رضواں ہی در یار کا درباں ہوتا

شعر (۱) ہوگا۔ کہتے ہیں کہ ہمارا گھر کثرتِ گریہ یعنی رونے سے ویران ہوگیا ہے مگر ہم کہتے ہیں کہ یہ گھر جو کثرت گریہ سے سمندر بن گیا ہے اگر دریا نہ ہوتا تو ویرانہ ہوتا غرضیکہ ویرانی بہرحال باقی رہتی۔

شعر (۲) فرماتے ہیں۔ ہم اپنی تنگیٔ دل کی شکایت کیا کریں اگر ہمارا دل تنگ نہ ہوتا تو اسکی واشدگی و شگفتگی اتنی ہوتی کہ پریشانی کے درجہ تک پہنچ جاتی۔ اس شعر میں بھی مرزا غالب نے شعر بالا کی طرح فلسفیانہ استدلال سے بتایا ہے کہ ہمارے نصیبوں میں راحت و آرام نہیں۔

شعر (۳) ورع بمعنی عبادت، رضوان۔ داروغہ یا دربان بہشت، فرماتے ہیں۔ درِ معشوق کا دربان آشنا سنگدل ہے کہ عمر بھر التجائیں کرنے کے بعد بھی یار کی محفل میں جانے کی اجازت نہیں دیتا کاش اسکے گھر کا دربان بجائے اسکے رضوان ہوتا تو عمر بھر عبادت کرنے کے بعد اسکی محفل میں جانے کی اجازت تو دے دیتا مگر یہاں تو ہنوز روزِ اول کا مضمون ہے۔

(۳۱) نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ۱ ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا ۲ نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا
ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
۳۔ وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

شعر (۱) فرماتے ہیں جب دنیا میں کچھ نہ تھا تو خدا تھا اور اگر موجوداتِ عالم کا وجود نہ ہوتا تو تب بھی خدا ہی ہوتا پس میری ہستی نے ظاہر ہو کر مجھ کو ایک شے دیگر قرار دیکر ڈبو دیا اور کھو دیا اگر میں پیدا نہ ہوتا اور عالمِ وجود میں نہ آتا تو خیال کرنا چاہیئے کیا ہوتا ظاہر ہے کہ خدا ہوتا کیونکہ یہ پہلے ہی بتا دیا گیا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہی ہوتا۔

؎ درمیانِ من و دلدار حجاب است ہمسام
آنم امید کہ روزے زمیاں برخیزد

شعر (۲) فرماتے ہیں جب ہمارا سر شدتِ غم و الم سے بے حس ہو گیا تھا تو پھر اسکے کٹنے کا کیا غم ہے اگر نہ

گھٹنا تو شدتِ غم و الم کی وجہ سے اسے ہر وقت زانو پر رکھنا پڑتا بہتر ہوا کہ کٹ گیا۔

شعر (۳۳) فرماتے ہیں۔ غالب کو مرے ہوئے مدت گزر گئی مگر اب تک ہمیں وہ اور اسکی باتیں یاد آتی ہیں وہ ہمیشہ ہر بات پر کہا کرتا تھا کہ اگر اتفاقاً ایسا بھی ہوتا تو کیا ہوتا؟ ع

دُنیا ہیچ است و کار دنیا ہمہ ہیچ

(۳۲) یک ذرّہ زمیں نہیں بیکار باغ کا ۱ یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا
بُلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل ۲ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا
تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے ۳ تریاکیٔ قدیم ہوں دودِ چراغ کا
سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے ۴ پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا
بے مَے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی ۵ کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا
بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار ۶ یہ میکدہ خراب ہے مَے کے سراغ کا

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

شعر (۱) جادہ بمعنی راستہ یا سڑک لیکن یہاں باغ کی روشیں مراد ہیں، فتیلہ بمعنی بتی نیز اس سے وہ بتی بھی مراد ہو سکتی ہے جو زخم میں رکھتے ہیں، داغ بمعنی زخم۔ فرماتے ہیں اس سال بہار کچھ ایسے طریق سے آئی ہے کہ باغ کی زمین کا ایک ذرہ بھی بغیر سبزہ زار کے نہیں رہا۔ یہاں تک کہ باغ کی روشیں جن پر آمد و رفت مردم کی وجہ سے کچھ نہیں اُگتا وہ بھی بہ باعث جوشِ بہار گلہائے سُرخ کی کثرت سے لالہ کے داغ کا فتیلہ بنی ہوئی ہیں۔

شعر (۲) بلبل کے کاروبار یعنی بلبل کے حرکات یا حالات، خندہ ہائے گل، مراد پھولوں کی شگفتگی خللِ دماغ معنی فتورِ دماغ۔ فرماتے ہیں بلبل کے حال پر پھول خندہ زن ہیں اس سے ثابت ہوا کہ اطبا نے جو عشق کو فتورِ دماغ کہا ہے وہ صحیح ہے۔

شعر (۳) تریاکی یعنی افیونی۔ دودِ چراغ یعنی چراغ کا دُھواں۔ فرماتے ہیں۔ یہ نشۂ فکرِ سخن (شعر و شاعری) نیا نہیں بلکہ میں تو ایک پُرانا چراغ کے دھوئیں کی افیون کھانے والا ہوں مفہوم یہ ہے کہ میں نے مدتوں چراغ کے سامنے بیٹھ کر رات رات بھر فکرِ سخن کی ہے (اشعار لکھے ہیں)؛ ؎

دود چراغ خوردہ شب آوردہ ام بروز
معذورم ار نماندہ دماغ مرا تری

شعر (۴) فرماتے ہیں ہم عشق کی قید سے سو بار چھوٹے ہیں مگر کیا کریں ہمارا دل ہی فراغت کا دشمن واقع ہوا ہے وہ آپ گرفتار ہوتا ہے کیونکہ اُسے شوقِ اسیری ہے ؎

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں جو تیر خطا ہوتا ہے

شعر (۵) آشوب یعنی فتنہ، ہلچل۔ آگہی یعنی ہوشیاری، دانائی۔ ایاغ یعنی پیالہ شراب، فرماتے ہیں بے شراب پیے آشوبِ ہوشیاری برداشت کرنے کی کسے طاقت ہے اسی لئے میرے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کھینچ کر صفحۂ دلپذیر سے اُسے کاٹ دیا، خط کھینچ دینے کی بجائے خطِ ایاغ کھینچ دینا ایک لطیف معنی رکھتا ہے یعنی اسکے مقابلہ پر اسکو ترجیح دی اور جس چیز کی وجہ سے اسکو ترجیح دی اسی کے خط سے آشوبِ آگہی کو رد یا باطل کیا یعنی ہوشیاری کے مقابلہ پر میں نے بیہوشی کو اچھا سمجھا۔ دنیا میں بے عقل اور بیہوش بنکر رہنے کو شعرا اچھا جانتے ہیں۔ ع

دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند

شعر (۶) اس شعر میں شاعر نے آنکھ کو میکدہ اور خونِ دل کو شراب سے تشبیہ دی ہے اور فرمایا ہے جس طرح میکدہ بغیر شراب کے ویران ہوتا ہے اسی طرح میری آنکھوں میں خونفشانی کے بغیر گویا خاک اُڑ رہی ہے۔ یعنی یہ میکدہ تلاشِ شراب میں خراب ہو رہا ہے موجِ نگاہ کی تشبیہ غبار سے نہایت مناسب ہے اور میکدہ کے لئے خراب کا لفظ بھی کیفیت سے خالی نہیں۔

شعر (۷) فرماتے ہیں، میرے سرورِ دل کا موجب تیرے حُسن کا شگفتہ باغ ہے ابرِ بہار میری مستی کا سبب نہیں ہو سکتا۔ اس شعر کے معنی اس طرح بھی ہو سکتے ہیں کہ ابرِ بہار کسی کے دماغ کیلئے خمکدہ (میخانہ) ہو سکتا ہے لیکن صرف تیرے حُسن کا شگفتہ باغ ہی ہمارے دِل کی خوشی و مسرّت کا سبب بن سکتا ہے۔

(۲۳) وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا ۱ رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا
یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز ۲ چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ ۳ اسقدر تنگ ہُوا دل کہ میں زنداں سمجھا
بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام ۴ رُخ پہ ہر قطرۂ عرق دیدۂ حیراں سمجھا
عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا ۵ نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا
سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی ۶ ہر قدم سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا
تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ ۷ دفعِ پیکانِ قضا اسقدر آساں سمجھا

دِل دیا جان کے کیوں اسکو وفادار اسدؔ
۸۔ غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

شعر (۱) غمِ پنہاں بمعنی رنجشِ دلی۔ عنوان بمعنی پتہ۔ فرماتے ہیں میرے چینِ جبیں سے وہ میرے غمِ پنہاں کو سمجھ گیا اور پتہ کی بے ربطی سے اُس نے مضمونِ خط کو معلوم کر لیا۔ پہلے اور دوسرے مصرع کا مفہوم ایک ہی ہے۔ (چینِ جبیں کی تشبیہ عنوان سے بہت مناسب ہے)

شعر (۲) صیقل بمعنی صفائی، آئینہ سے مراد قلب ہے۔ فرماتے ہیں جب سے مینے اپنے آئینۂ دلکو گریبان سمجھ لیا ہے اسیوقت سے اُسے چاک کر رہا ہوں یعنی آئینۂ دلکو صیقل کر رہا ہوں مگر ابھی تک پورے طور پر صاف نہیں ہُوا یا یہ کہ جب سے مینے گریبان کی حقیقت سمجھی ہے اُسے چاک کرنے میں مصروف ہوں لیکن ہنوز صیقلِ آئینہ ایک الف سے زیادہ نہیں ہے تمام استعارات کو حذف کرنے کے بعد مفہوم یہ ہے کہ باوجود ترکِ تعلقات کے صفائی قلب پورے طور پر حاصل نہیں۔

شعر (۳) گرفتاری خاطر بمعنی دل گرفتگی۔ فرماتے ہیں میری دل گرفتگی کی شرح مجھ سے نہ پوچھ میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ مختصر یہ کہ ہجوم غم سے دل اسقدر تنگ ہو گیا ہے کہ میں اسے قید خانہ سمجھنے لگا ہوں :

زندگی کشمکشِ رنج و محن میں گذری!
(یاس)
چار دیوارِ عناصر کو میں زنداں سمجھا

شعر (۴) فرماتے ہیں۔ میری بدگمانی نے یار کا مصروف خرام (چلنا پھرنا) ہونا گوارا نہ کیا کیونکہ خرام سے اسکے رُخ پر جو قطرات عرق (پسینہ) نمودار ہوئے میں نے انہیں رقیب کے دیدۂ حیراں سمجھا یعنی میں یہ سمجھا کہ رقیب کی چشم حیراں اس کے چہرہ پر جمی ہوئی ہے۔

حضرت آسی نے اس شعر کے معنی اس طرح بھی بیان فرمائے ہیں: "میرا معشوق اسقدر بدگمان ہے کہ سرگرم خرام ہی نہیں ہوتا تاکہ چلتے وقت جو شرم یا حرکت سے اس کو پسینہ آتا ہے اس پسینہ کے قطرے قطرے کو دیدۂ حیران عاشق جانتا ہے۔

شعر (۵) میں نے اپنے عجز یا کمزوری سے یہ سمجھ لیا کہ وہ بدمزاج ہوگا گویا تنکا کی نبض دیکھ کر شعلہ کا حال معلوم کر دیا اپنی عاجزی کو نبضِ خس سے اور اس کی بدخوئی کو شعلۂ سوزاں سے تشابہ کیا۔

شعر (۶) فرماتے ہیں۔ جب سفر عشق میں تکان کے غلبہ نے راحت طلبی کا پہلو اختیار کیا تو میں نے اپنے ہی سایہ کو گھر سمجھ کر آرام لینا چاہا۔ قاعدہ ہے کہ جب کوئی مسافر راہ میں تھک جاتا ہے تو وہ آرام کا متلاشی ہوتا ہے شاعر کہتا ہے چونکہ میرا سفر سفرِ عشق تھا اور یہاں درخت یا دیوار کا سایہ مفقود تھا تو میں نے اپنے ہی سایہ کو آرام گاہ سمجھ لیا۔

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
(حفیظ جونپوری)
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

شعر (۷) پیکان بمعنی تیر۔ گریزاں ہونا بمعنی بھاگنا۔ فرماتے ہیں میں مرتے دم تک یار کی مژگاں سے بھاگتا رہا۔ حالانکہ یار کی مژگاں تیرِ قضا تھا جس کا روکنا اور جس سے بچنا ناممکن تھا۔ میں نے اپنی بیوقوفی سے تیرِ قضا

یہ دنیہ ایسا آسان سمجھا لیکن اس سے نہ بچ سکا۔

شعر (۸) فرماتے ہیں اے اسدؔ! اسکو وفادار سمجھ کر دل کیوں دیا یہ تمہاری غلطی ہے کہ تم نے ایک کافر کو مسلمان سمجھ لیا یعنی اگر دل کا دینا ہی مدنظر تھا تو اسے بیوفا سمجھ کر دیا ہوتا۔

(۱۳۴ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا ۱ دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ۲ پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا یعنی ۳ پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل ۴ نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا
زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی ۵ کیوں ترا راہ گذر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی ۶ گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں ۷ دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا
پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال ۸ دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ۹ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ ۱۰ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

شعر (۱) فرماتے ہیں۔ پھر میرے دل و جگر کو فریاد کی آرزو پیدا ہوئی اور اس تقریب سے پھر دیدۂ تر یاد آگیا کہ یہ تمنا رونے ہی سے پوری ہوگی۔ دوسرے مصرعہ میں مرزا صاحب نے فارسی محاورہ کے مطابق "ہوا" کی جگہ "آیا" استعمال کیا ہے۔

شعر (۲) فرماتے ہیں، دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گذری تھی اور جو اسکے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے اس میں جو کبھی کبھی وقفہ ہو جاتا ہے اسکو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا ہے ایسے بلیغ اشعار اردو زبان میں بہت کم دیکھے گئے ہیں جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گذرتی ہے ان دو مصرعوں میں

اُسکی تصویر کھینچ دی ہے جس سے بہتر کسی اسلوب بیان میں یہ مضمون ادا نہیں ہو سکتا۔ (یادگارِ غالب)

شعر (۳) نیرنگ بمعنی جادو۔ افسوں۔ فرماتے ہیں میری تمنائیں کتنی سادہ ہیں کہ اسی نیرنگِ نظر کو جس نے مجھے تباہ و برباد کر ڈالا تھا پھر یاد کرتی ہیں۔

شعر (۴) واماندگی بمعنی عاجزی کمزوری۔ فرماتے ہیں حسرتِ دل کا تقاضا تھا کہ نالہ کیا جائے۔ مگر مجھے اپنی کمزوری جگر یاد آ گئی۔ کیونکہ اس میں طاقتِ نالہ باقی نہ تھی۔

شعر (۵) فرماتے ہیں تیرا راہ گذر یاد آنے سے میری زندگی گزر گئی اور یہ بات اچھی ہوئی کہ میں زندگی سے بیزار تھا لیکن اس کے یاد آنے سے ایسا اندوہ و قلق ہوا کہ کاش کہ نہ یاد آیا ہوتا تو زندگی تو کبھی نہ کبھی طرح کٹ ہی جاتی۔ (طباطبائی)

حسرت صاحب اس شعر کی شرح یہ فرماتے ہیں "جب کامگاری ممکن ہی نہیں ہے تو تیرا رہگذر بیکار یاد آتا ہے یعنی جب وہاں بھی زندگی بحالت ناکامی بسر ہوگی تو اس کا یاد آنا عبث ہے یوں بھی زندگی کسی نہ کسی طور پر گذر ہی جاتی"

شعر (۶) فرماتے ہیں یعنی اس بحث میں کہ مکانِ یار بہتر ہے یا بہشت؟

شعر (۷) فرماتے ہیں دل میں جو پہلے فریاد کی جرأت تھی وہ اب نہیں رہی اس بنا پر اس سے تنگ آکر جدا ہوا تھا جس میں فریاد کی طاقت زیادہ تھی لیکن افسوس اب اس میں بھی یارائے فریاد نہیں۔

شعر (۸) فرماتے ہیں۔ پھر میرا خیال تیرے کوچہ میں چلا آیا ہے شاید دل گم گشتہ اسے پھر یاد آیا ہے جسے ڈھونڈنا چاہتا ہے۔

شعر (۹) فرماتے ہیں جس دشت میں میں جا نکلا ہوں وہ نہایت ویران ہے اسے دیکھ کر مجھے اپنا گھر یاد آ رہا ہے کہ وہ بھی ویرانی میں اس سے مشابہ ہے یا یہ کہ اس جنگل کی ویرانی دیکھ کر گھر لوٹ جانے کو جی چاہتا ہے

جو ہوں وحشت میں سوئے صحرا کیوں   کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی!   (مومن)

شعر (۱۰) اسد نے اپنے لڑکپن کے زمانے میں دوسرے لڑکوں کی دیکھا دیکھی مجنوں پر پتھر اٹھایا تھا یعنی مجھکو اپنا سر یاد آگیا کہ کبھی میں بھی بر بنائے شوریدہ سری اسی طرح نشانہ سنگِ طفلاں ہونگا۔

(۳۵) ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا ۱ آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ! ۲ اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں ۳ کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد ۴ ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریِ زنجیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا ۵ بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا
یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی ۶ گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا
دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا ۷ نالہ کرتا تھا ولے طالبِ تاثیر بھی تھا
پیشہ میں عیب نہیں رکھئے نہ فرہاد کو نام ۸ ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا
ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی ۹ آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق ۱۰ آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
۱۱- کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

شعر (۱) تاخیر بمعنی دیر۔ عناں گیر بمعنی روکنے والا۔ اس شعر میں وہ جامع الفاظ ہیں جن سے اس قدر عبارت کا پتہ چلتا ہے کہ معشوق دیر سے عاشق کے پاس پہنچا ہے اور عاشق اس کے دیر میں آنے کی شکایت کرتا ہے اور معشوق کہتا ہے کہ ہاں تاخیر ہوئی جس کے جواب میں عاشق پھر کہتا ہے کہ تاخیر ہوئی تو کچھ تاخیر کا سبب بھی تھا یا بلاوجہ تاخیر ہوئی پھر وہ جواب دیتا ہے کہ ہم آ رہے تھے اس پر عاشق پھر کہتا ہے کہ آتو رہے تھے مگر اس تاخیر سے جو باوجود عزمِ مصمم کے آپکے آنے میں ہوئی یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کوئی نہ کوئی آپکو روک بھی رہا تھا اور روکنے والے

سکے جس سے آپ کی بے تکلفی ہو کوئی نہیں ہو سکتا۔ (آسی)

ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ اتنی دیر سے آئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ راستہ میں وہ کسی کے یہاں ٹھہرے کیونکہ کوئی عنانگیر (روکنے والا) تو تھا نہیں جو آپکو ٹھہرنے سے منع کرتا کہ یہاں نہ ٹھہریئے سیدھے غالب کے پاس چلیئے۔

شعر (۲) فرماتے ہیں اگر میں تم سے اپنی تباہی کا گلہ کروں تو یہ بیجا ہوگا اس میں میری بدنصیبی بھی شامل تھی اس شعر میں شاعر نے حد ادب اور حد عشق دونوں کا خیال رکھا ہے۔

شعر (۳) فتراک بمعنی شکاربند۔ فرماتے ہیں اگر تونے مجھے فراموش کردیا ہے تو میں تجھے یاد دلاتا ہوں کہ میں وہی ہوں جسے کبھی شکار کرکے تونے اپنے شکاربند میں باندھا تھا۔

شعر (۴) فرماتے ہیں تیرے وحشی کو قید کی حالت میں بھی ہے زلف کی یاد ہے یعنی اسکے ساتھ ایک گونہ زنجیر کا غم تھا زیادہ نہیں کچھ یونہی سا۔ اس شعر میں قید زنجیر کی سختی کو قید زلف کے مقابلہ میں کم درجہ ثابت کیا ہے۔

شعر (۵) فرماتے ہیں میں صرف دیدار ہی کا مشتاق نہ تھا بلکہ مشتاق تقریر بھی تھا لہذا چاہیئے تھا کہ آپ کچھ بات بھی کرتے نہ یہ کہ دفعتہً آئے اور چلے گئے گویا ایک بجلی سی کوند گئی۔ اس شعر میں حضرت موسیٰ کے واقعہ کی طرف بھی اشارہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی التجا پر بجلی سی کوند گئی مگر معشوق حقیقی نے موسیٰ سے کوئی بات نہ کی۔

شعر (۶) فرماتے ہیں میں نے اسکو یوسف کہہ دیا اور اس نے مجھے کچھ نہ کہا بس یہ سمجھو کہ بڑی خیر ہوگئی اگر وہ ناراض ہو جاتا اور مجھے سزا دے دیتا تو بجا تھا مفہوم یہ ہے کہ اس کا حسن یوسف کے حسن سے زیادہ ہے میں نے اسے یوسف کہہ کر اسکی توہین کردی تھی اور وہ سن کر خاموش ہوگیا۔

شعر (۷) فرماتے ہیں غیر کو دیکھ کر میرا کلیجہ کیوں نہ ٹھنڈا ہوتا وہ نالہ بھی کرتا تھا اور اپنے نالوں کی تاثیر کا خواہاں بھی تھا مفہوم یہ ہے کہ معشوق رقیب کی آہ و زاری سے بھی متاثر نہیں ہوتا اور یہ چیز میرے لئے باعث مسرت ہے۔

؎ شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی
گو مشت خاک ما ہم برباد رفتہ باشد

شعر (۸) نام رکھنا یعنی بُرا بھلا کہنا۔ آشفتہ سر۔ عاشق۔ پریشان حال، میر ہونا کبھی کام کی ابتدا کرنا، فرماتے ہیں پیشہ میں عیب کوئی نہیں ہے اگر فرہاد نے کوہکنی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا تو چنداں قابل اعتراض نہیں اسلئے کہ وہ جوانمرگ بھی ہماری طرح ایک پریشان حال عاشق تھا اور پیشہ عاشقی میں کوہکنی کی اُسنے ابتدا کی تھی۔

شعر (۹) ہم تو مرنے کیلئے اسکے سامنے جا کھڑے ہوئے تھے اگر وہ ہمارے قریب نہیں آ سکتا تھا اور اسلئے اپنی کسر شان سمجھتا تھا تو آخر اسکے ترکش میں کوئی تیر تو تھا جسے وہ وہیں سے کھینچ کر مار دیا ہوتا تا کہ ہمارا کام تمام ہو جاتا

شعر (۱۰) فرشتوں کے لکھے یعنی کراماً کاتبین کی تحریر۔ فرماتے ہیں کراماً کاتبین کے لکھنے پر ہمیں ناحق کیوں پکڑا جاتا ہے یعنی گنہگار سمجھا جاتا ہے آخر جب انہوں نے لکھا تو اسوقت ہمارا کوئی آدمی تھا نہیں کیونکہ عام طور پر دنیا کے معاہدے فریقین کے سامنے طے ہوتے ہیں اور خاص کر جب کوئی دستاویز لکھی جاتی ہے۔

اس جگہ فرشتوں اور آدمی دو لفظوں کو جمع کر کے غالب مرحوم نے معجزہ شاعری دکھایا ہے کہ انسانوں کے جذبات کو فرشتے کیا سمجھ سکتے ہیں وہ ہر چیز اپنی نظروں سے دیکھیں گے انہیں اس بات کا علم ہو ہی نہیں سکتا کہ گناہ کیا ہے اور ثواب کیا ہے وہ تو معصوم ہونے کی وجہ سے گناہ کا تخیل بھی نہیں کر سکتے پھر ایسے لوگوں کی تحریر پر انسانوں کو مورد الزام ٹھہرانا کہاں تک جائز ہے جائز تو اسوقت ہوتا جب ہمارے گناہ اور ثواب انسانی جذبات کے نقطہ نظر کے ماتحت لکھے جاتے۔

شعر (۱۱) ریختہ یعنی اُردو شاعری۔ فرماتے ہیں اے غالب اُردو شاعری کے صرف تمہیں استاد نہیں ہو اگلے زمانے میں کوئی اُستاد میر بھی تھا۔ میر سے میر تقی رح مراد ہیں ایک دوسرے مقام پر بھی فرمایا ہے ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ!
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

(۳۶) لب خشک در تشنگی مُردگاں کا ۱ زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا
ہمہ نا امیدی ہمہ بد گمانی ۲ میں دل ہوں فریب وفا خوردگاں کا

شعر (۱) فرماتے ہیں، میں اُن لوگوں کا لب خشک ہوں جو تشنگی میں یعنی پہلے سے مر گئے اور میں آزردہ دل یعنی محروم و رنجیدہ لوگوں کا زیارت کدہ ہوں۔ دِل آزردگاں سے حرماں نصیب عشاق مراد ہیں۔

شعر (۲) فرماتے ہیں میں ایک پیکر نا امیدی و بدگمانی بن گیا ہوں اسلئے کہ میں ان لوگوں کا دل ہوں جو وفائے معشوق کا فریب کھا چکے ہیں یعنی جنہوں نے معشوق کو وفادار سمجھا تھا اور آخر انکے ارمان مایوسیوں سے بدل گئے۔

(۷/۲۳) تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا ۱ اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے ۲ خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا
توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے ۳ آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم ۴ میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
میں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں ۵ یعنی سبقِ شوقِ مکرّر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک ۶ میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل
آتشکدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا ۷

شعر (۱) اے ستمگر تو کسی کا دوست نہیں ہے اور تو صرف مجھی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ جو ظلم تو نے اوروں پر کئے ہیں وہ مجھ پر بھی نہیں کئے یا یوں سمجھ لیجئے کہ جو ظلم تو نے مجھ پر نہیں کئے وہ تو اوروں پر کر رہا ہے میں نے تو یہ سمجھا تھا کہ تیرے تمام ظلم صرف میرے لئے ہیں مگر میرا یہ خیال غلط ہے مجھے اس معاملہ میں شرکت غیر کسی طرح بھی گوارا نہیں ہے اور تیرا مجھ پر ظلم نہ کرنا بھی ایک ظلم عظیم ہے ؎

اے فلک تو نے دیا تھا غم جو کھانے کے لئے
وہ بھی حصہ کر دیا سارے زمانے کے لئے (داغ)

شعر (۲) ماہِ نخشب، اس مصنوعی چاند کو کہتے ہیں جسکو حکیم ابن عطا مشہور بہ ابن مقنع نے سیماب وغیرہ

سے بمقام نخشب تیار کیا تھا۔ یہ چاند دو ماہ تک برابر ایک کنوئیں سے نکلا کرتا تھا لیکن اسکی روشنی چار فرسنگ سے زیادہ نہ جا سکتی تھی اور وہ اصلی چاند کے مقابلہ میں بالکل ناقص اور ماند تھا۔

مطلب یہ ہے کہ آفتاب ابھی حسن و جمال میں میرے معشوق کے برابر نہ ہوا تھا کہ قضا و قدر کے ہاتھوں نے اسی طرح ناقص و نامکمل چھوڑ دیا۔ اس شعر میں شاعر نے آفتاب کو مُکھڑے یار کے مقابلہ میں ناقص قرار دے کر اُسے ماہ نخشب سے تشبیہ دی ہے۔

شعر (۳) فرماتے ہیں جس قدر عالی ہمت ہوتی ہے اسی کے موافق اسکی تائید غیبی ہوتی ہے اور ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جس کو آنکھوں میں جگہ ملی ہے اگر اس کی ہمت جبکہ وہ دریا میں تھا موتی بننے پر قانع ہو جاتی تو اس کو جیسا کہ ظاہر ہے یہ درجہ آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا۔ (یادگار غالب)

شعر (۴) شعرا نے عام طور پر قد یار کو فتنۂ محشر وغیرہ سے تشبیہ دی ہے آپ فرماتے ہیں میں نے جب تک قد یار اور اُسکے انداز محشر خرامی کو نہ دیکھا تھا مجھے روز قیامت کا یقین نہ آتا تھا اب قد یار کو دیکھ کر فتنۂ قیامت کا معتقد ہُوا ہوں ؎

سایہ میں اک بلند قامت کے　　فتنے سب سو گئے قیامت کے! (امیر)

شعر (۵) فرماتے ہیں میری سادہ دلی ملاحظہ فرمائیے میں یار کی رنجیدگی سے خوش ہوں کیونکہ مجھے اُمید ہے کہ صلح شوق کے بعد سبق عشق کے از سر نو شروع ہونے سے بڑا لطف حاصل ہوگا یعنی نئے سرے سے محبت شروع ہوگی گویا آغاز اُلفت سے لیکر انتہائے عشق تک کی تمام کیفیتیں ایک بار پھر پیدا ہونگی۔

شعر (۶) اس شعر میں شاعر نے اپنے کثرت معاصی کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اسقدر فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی خشک ہو گیا ہے مگر ابھی تک ہمارے دامن کا کونا بھی نہیں بھیگا (یادگار غالب)

مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ اس شعر کو حضرت ذوق بہت پسند کرتے تھے۔

شعر (۷) سمندر جو ایک چوہے کی قسم کا جانور ہے آتشکدوں میں پیدا ہوتا ہے اور آگ ہی میں رہتا ہے

مرزا فرماتے ہیں اے آسمان! میں اپنے داغِ جگر سے اس وقت سے آتش مزاجی حاصل کر رہا ہوں کہ آتش کدہ میں ابھی سمندر کا وجود بھی نہ تھا۔

(۲۸) شب کہ وہ مجلس فروز خلوتِ ناموس تھا ۱ رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا
مشہدِ عاشق سے اُگتی ہے جو کوسوں تک حنا ۲ کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا
حاصلِ اُلفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو ۳ دل بدل پیوستہ گویا اک لبِ افسوس تھا
کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیان
جو کہ کھایا خون دل بے منتِ کیموس تھا ۴۔

شعر (۱) ناموس بمعنی عفت و عصمت، رشتۂ شمع، وہ تاگا جو موم بتی میں ہوتا ہے۔ کسوت بمعنی لباس۔ خار در پیرہن بودن، فارسی میں محاورہ ہے جسکے معنی بیقرار و بےچین ہونیکے ہیں اسی کو غالب نے اُردو میں بیان کیا ہے فرماتے ہیں رات کو عفت و عصمت کی محفلِ خلوت میں محبوب رونق افروز تھا اور محبوب کے جمال باکمال کو دیکھ کر شمع کا ہر رشتہ خار پیرہن بن گیا تھا یعنی بیقراری کی وجہ سے شمع کی کچھ عجیب حالت ہو گئی تھی۔

جناب آسی اسی شعر کی شرح یوں فرماتے ہیں: "رات اس حال میں کہ وہ مجلس فروز خلوتِ ناموس تھا تو فانوس کے نیچے شمع کا ہر رشتہ خار لباس بنا ہوا تھا یعنی شمع سے اسکو تکلیف ہو رہی تھی اور وہ شرمندہ تھا کیونکہ اس کی موجودگی اس کی خلوتِ ناموس کے منافی تھی۔"

شعر (۲) فرماتے ہیں یہ جو مشہدِ عاشق سے کوسوں تک مہندی اُگتی ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسے محبوب کے قدم چومنے کی کس قدر حسرت تھی یعنی زندگی بھر تو وہ اسکی پابوسی حاصل نہ کر سکا تو اب شاید اسی طرح پر ہو جائے کہ اس کی قبر پر جو حنا اُگتی ہے وہ کسی دن پائے یار تک پہنچ جائے اور پابوسی کی حسرت نکل جائے۔

بوسم من بے برگ و نوا برگِ حنا را
تا بوسہ بہ پیغام دہم آں کفِ پا را

شعر (۳) شکستِ آرزو یعنی آرزوؤں کا خون ہونا۔ دل بدل جانا یعنی دوسرے جیسے بن جانا۔ فرماتے ہیں ہم نے محبت کی جس کا نتیجہ ہوا کہ آرزوؤں کے خون کے سوا کچھ نہیں ملا گویا عاشق و معشوق دونوں کے دل ملنے کے سبب خوں بن جاتا ہے جس سے آخر میں غم، افسوس و حسرت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

شعر (۴) کہیں بھی مشاعروں میں زخمِ جگر کو کہتے ہیں جس کا زخمِ جگر خون بہتا ہے تو گاہے بے تحاشا بہتا ہے تو تنزل اختیار کرتی ہے اور بعد میں کمی ہوتی ہے۔ لیکن مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ہماری عمر کی فراغت کا یہ بیان کر دوں کہ میں کیلئے کمیوں کا دخل نہیں۔ ابتدا ہی سے خونِ جگر کھاتا ہوں۔

(۳۹) آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے ۱ صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے ۲ اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

شعر (۱) مرزا صاحب معشوق سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ صاحب آپ ہمیشہ ہماری عاشقی پہ طعنہ زنی کرتے تھے اور ہمت عشق کا مذاق اڑاتے تھے مگر یہ اسی وقت تک تھا جب تک آپ نے آئینہ نہ دیکھا تھا اب جو آپ نے آئینہ میں اپنا حسن ذوق دیکھا تو عاشق ہونا ہی پڑا اب وہ دل نہ دینے کا غرور کہاں گیا؟

شعر (۲) فرماتے ہیں آپ قاصد کو کیوں قتل کرتے ہیں اگر وہ میرا پیغام آپ تک لیکر آیا تھا تو یہ کوئی خطا نہ تھی بلکہ یہ میری خطا تھی جس نے اسے آپ تک بھیجنے کی گستاخی کی۔ دوسرے اسکے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ عاشق کو تابِ عشق کے باعث یہ منظور نہیں کہ کوئی دوسرا معشوق کے ہاتھ سے قتل ہو سکے وہ اسے اس پیرایہ میں منع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سعادت آپکے ہاتھوں سے قتل ہونے کی میرے نصیبوں میں ہونی چاہئے تھی۔

(۴۰) عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا ۱ جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے ۲ ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں ۳ شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا
بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے ۴ یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن ۵ غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار ۶ لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
۷ حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

شعر (۱) عرض یعنی ظاہر کرنا، نیاز یعنی عاجزی، فرماتے ہیں میں عشق کے عجز و نیاز کو ظاہر کرنے کے قابل نہیں رہا کیونکہ یہ سب دل کی وجہ سے تھا اسلئے کہ دل منبعِ عشق تھا اور وہ پیہم صدمات عشق کی وجہ سے مٹ چکا ہے۔

شعر (۲) شمع کشتہ یعنی بجھی ہوئی شمع۔ درخورِ محفل نہ رہنا یعنی قابلِ محفل نہ رہنا، فرماتے ہیں میں دنیا سے زندگی کی حسرت کا داغ لئے ہوئے جا رہا ہوں یعنی میرا دل مرنے کو نہ چاہتا تھا لیکن دستِ قضا مجھے جبراً لیے جا رہا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں دعویٰ مع دلیل واقع ہوا ہے یعنی میں ایک بجھی ہوئی شمع ہوا جو قابلِ محفل نہیں اور قاعدہ ہے کہ جب شمع بجھ جاتی ہے تو اسے محفل سے اٹھا لیا جاتا ہے نیز جب شمع بجھتی ہے تو بتی کچھ دیر تک چمکتی رہتی ہے گویا وہ داغِ حسرتِ ہستی ہے۔

افسردہ دل کی مجمعِ حسرت میں قدر کیا
بجھ کر چراغ لائقِ محفل نہیں رہا (آرزو لکھنوی)

شعر (۳) فرماتے ہیں میری حالت اسقدر زبون ہو چکی ہے کہ میرا قتل کرنا اسکے دست و بازو کی شان کے خلاف ہے اب مجھے مرنے کیلئے کوئی اور تدبیر کرنی چاہیئے کیونکہ اسکے ہاتھ سے قتل ہونے کی سعادت حاصل نہیں ہو سکتی، آسی صاحب فرماتے ہیں کہ اس شعر میں شاعر نے صرف اپنی گرانجانی کا اظہار کیا ہے اور دست و بازوئے قاتل جس سے نزاکتِ دست و بازو مراد ہے اس کی تائید کے لئے الفاظ موجود ہیں۔

شعر (۴) بروئے، مقابل، شش جہت: سے مراد دنیا مجازاً کیونکہ دنیا کی چھ طرفیں ہیں یعنی بالا، زیر، مشرق، مغرب، شمال، جنوب یعنی دنیا کے مقابلہ پر ہر طرف آئینہ کھلا ہوا ہے اور اس سے ناقص و کامل سب

سب حیران ہیں یعنی اسرارِ قدرت کے سمجھنے میں تمام عقلمند اور بیوقوف حیران ہیں۔ (آسی)

ہر ذرّہ محوِ جلوۂ حُسنِ یگانہ ایست
گوئی طلسمِ شش جہت آئینہ خانہ ایست (غالبؔ)

حضرت بیخودؔ دہلوی اس شعر کی شرح اس طرح فرماتے ہیں، آئینہ جس طرح عکس قبول کرنے میں کچھ امتیاز نہیں کرتا بعینہٖ اسی طرح کی کیفیت دلِ عارف و اہلِ دُنیا کی ہے یہ شعر حقیقت اور مجاز دونوں پہلو لئے ہوئے ہے اگر حقیقت کی طرف اس شعر کو لیجانا چاہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ دلِ عارف پر اچھی بُری دونوں کیفیتیں پرتو افگن ہوتی ہیں اور اگر اس شعر کے معنی مجاز لئے جائینگے تو یہ مطلب نکلے گا کہ اہلِ دنیا کو اچھے بُرے کلام کا فرق محسوس نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ ناقص و کامل کا فرق سمجھ نہیں سکتے۔

میرے خیال میں اس شعر کی شرح یوں بھی ہو سکتی ہے۔ تمام دنیا کیلئے آئینہ معرفتِ الٰہی کھلا ہوا ہے وہاں ناقص و کامل کا کوئی امتیاز نہیں جو کوشش کریگا اسکی بارگاہ تک پہنچ جائے گا۔

شعر (۵) فرماتے ہیں میرے جذبۂ شوق نے نقابِ حُسن کے تمام بند کھول دیئے ہیں اور حُسن کو بالکل عریاں کر دیا ہے اب میرے اور اُس کے درمیان میں کوئی شے حائل ہے تو وہ صرف حجابِ نگاہ ہے اگر چشمِ باطن وا ہو جائے تو یہ حجاب بھی اُٹھ جائے اور شاہد و مشہود میں کوئی فرق باقی نہ رہے ؎

اب دُور کیا ہیں جلوۂ جاناں کی لذّتیں!
اک پردہ رہ گیا ہے سو وہ بھی نگاہ کا! (مرزا قویؔ)

شعر (۶) فرماتے ہیں اب میرے دل سے وفا کرنے کی خواہش مٹ گئی ہے اس لئے کہ اس کا نتیجہ سوائے حسرت کے اور حاصلِ وفا کچھ نہیں۔

شعر (۷) فرماتے ہیں۔ اسدؔ میں عشق کے ظلم و ستم سے نہیں ڈرتا لیکن وہ دل جو معشوق کے جور و ظلم اُٹھا سکتا تھا اور مجھے جس پر ناز تھا وہ مٹ چکا ہے۔

(۱۴) رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف ۱ عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا
ذرہ ذرہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے ۲ گردشِ مجنوں بچشمکہائے لیلیٰ آشنا
شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز ۳ ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا
شکوہ سنجِ رنجِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیئے ۴ میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا
میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے ۵ عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
۶- سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

شعر (۱) رشک محبت کہتا ہے کہ اس کا غیر کے ساتھ ربط و ضبط ہے یعنی اُسے غیر سے محبت ہے لیکن عقل کہتی ہے کہ رقیب کے ساتھ بھی اس کا اخلاص و اُلفت حقیقی نہیں وہ بیوفا کس کا آشنا ہے وہ جس طرح تیرے ساتھ بیوفائی کرتا ہے اسی طرح اس کے ساتھ بھی کرے گا۔

شعر (۲) اس جہان کا ذرہ ذرہ جو گردش و انقلاب کا ساغر ہے اور جس نے انسان کو حیران و پریشان کیا ہوا ہے یہ سب کچھ آسمان کی نیرنگ سازی کا نتیجہ ہے یعنی یہ سب کچھ اسی کے اشارہ سے ہو رہا ہے مصرعہ ثانی میں شاعر نے برتمثیل کہا ہے کہ مجنوں کی گردش یعنی صحرا نوردی لیلیٰ ہی کے اشارہ چشم سے تھی مفہوم شعر یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب محبوب حقیقی (خدا) ہی کے اشارہ اور حکم سے ہو رہا ہے۔

شعر (۳) فرماتے ہیں یہ عشق ہی ہے جو انسان عاجز کیلئے سرمایہ مباہات ہے اور یہ عشق ہی ہے جو ذرہ کو صحرا اور قطرہ کو دریا بنا دیتا ہے یا ذرہ کو صحرا سے اور قطرہ کو دریا سے ملا دیتا ہے ؎

عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذروں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا

شعر (۴) فرماتے ہیں میں ہوں اور میرا دل ہے جو ایک آفت کا ٹکڑا ہے جو آرام و عافیت کا دشمن اور آوارگی پسند ہے

شعر (۵) فرماتے ہیں ہم دونوں کو رشک بدگمانی کی باتیں نہ کرنا چاہئیں۔ میرا رفیق زانو ہے اور تیرا آشنا آئینہ ہے یعنی میں فکر کی وجہ سے سر بزانو رہتا ہوں اور تم بناؤ سنگار کی وجہ سے مشغول بہ آئینہ رہتے ہو۔

شعر (۶) تمثال بمعنی تصویر۔ فرماتے ہیں اے اسد! فرہاد کوہکن، شیریں کی تصویر بنانیوالا ایک نقاش تھا، ورنہ پتھر سے سر مار کر بھی کہیں معشوق پیدا کیا جاسکتا ہے؟ اس شعر میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ فرہاد کا عشق کامل نہ تھا ورنہ شیریں کا پیدا ہونا کچھ بعید نہ تھا۔

(۲۹) ذکر اس پریوش کا اور پھر بیاں اپنا ۱ بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
مے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں یارب ۲ آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے ۳ عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا
دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالینگے ۴ بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا
درد دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں ۵ انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا
گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا ۶ ننگ سجدہ سے میرے سنگ آستاں اپنا
تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو ۷ دوست کی شکایت میں ہمنے ہمزباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
۸ بے سبب ہوا **غالب** دشمن آسماں اپنا

شعر (۱) فرماتے ہیں میں نے جو معشوق کے حسن کی تعریف کی تو جو شخص میرا محرم راز تھا وہ بھی سن کر میرا رقیب بنگیا اسواسطے کہ اول تو ایسے پریوش کی تعریف تھی اور وہ بھی مجھ جیسے جادو بیان کی زبان سے پہلے مصرعہ کہ دوسرا رکن یعنی بیان اپنا یہ مرزا مرحوم کی خصوصیات میں سے ہے (یادگار غالب)

شعر (۲) فرماتے ہیں، بزم غیر میں بکثرت شراب نوشی محبوب کو اپنی عالی ظرفی و میکشی کا امتحان منظور ہے، شاعر بطور شکوہ کہتا ہے کہ آج ہی ان کو اپنا امتحان منظور ہوا جبکہ وہ بزم غیر میں ہیں کاش کہ یہ امتحان ان کو

میری غفلت میں میں نہ ہوتا اور وہ میرے ساتھ شراب پی کر بیخود ہوتے تو میں انکے وصل سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہوتا (شاعر اپنی بدنصیبی کا شکوہ کرتا ہے)

شعر (۳) فرماتے ہیں اب ہمارا مسکن عرش ہے کاش کہ ہمارا مکان عرش کے اس طرف ہوتا تاکہ کسی بلندی کو ہم اپنا منظر بنا کر اسکے لطف دیدار سے بہرہ ور رہتے مگر اب تو عرش سے اونچا کوئی مقام نہیں ہے ہم منظر بنائیں یہ وجہ ہے کہ ہم اپنی حقیقت سے بے خبر ہیں۔

شعر (۴) فرماتے ہیں کہ خوب ہوا کہ معشوق کے در کا پاسبان ہمارا جان پہچان نکلا اب ہمارے لئے اس بات کا موقع حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہے ذلت ہم کو دے ہم اسکو ہنسی میں ٹالتے رہینگے اور یہ ظاہر کرتے رہینگے کہ ہمارا قدیم آشنا ہے ہمارا اس کا قدیم سے یہی برتاؤ ہے۔ (یادگار غالب)

شعر (۵) فرماتے ہیں میں اپنا درد دل کب تک لکھتا رہوں اب لکھنے کی طاقت نہیں بہتر یہ ہے کہ میں خود انکے پاس جا کر انہیں اپنی زخمی انگلیاں اور خونچکاں قلم دکھاؤں کہ لکھتے لکھتے میری یہ حالت ہو گئی ہے ممکن ہے وہ دیکھ کر میرے درد و مصیبت کو سمجھ لیں اور اس کا مداوا کریں۔

شعر (۶) فرماتے ہیں آپ نے اپنے سنگ آستاں کو بدلنے کی ناحق زحمت گوارا کی۔ وہ پتھر مجھ ننگ سجدہ کے سجدوں سے خود بخود مٹ جاتا پھر آپ نیا پتھر لگا لیتے۔

شعر (۷) فرماتے ہیں کہ میں نے دشمن کو بھی دوست کی شکایت میں اپنا ہمنوا بنا لیا ہے تاکہ وہ وہاں جا کر میری چغلی نہ کھائے اب وہ میری شکایت اس سے نہیں کر سکتا۔

شعر (۸) عام طور پر آسمان ہنرمندوں کا دشمن ہوتا ہے ہم کہاں کے ہنرمند اور دانائے روزگار تھے کہ آسمان ناحق ہمارا دشمن ہو گیا ہے ؎

از من بگیر عبرت و کسب ہنر مکن
با بخت خود عداوت ہفت آسماں مخواہ

(۴۳) سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے ۱ کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
۲-
تیرے چہرے سے عیاں ہو غمِ پنہاں میرا

شعر(۱) اس شعر میں شاعر نے اپنے کلام کی طرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کا فیض عام ہے فرماتے ہیں کہ میں وہ سرمہ ہوں جس کی قیمت صرف اتنی ہے کہ خریدار کی آنکھوں پر میرا احسان رہے۔ سرمۂ مفت نظر کی طرف اضافت تشبیہی ہے اور اسے اضافت مجازی بھی کہتے ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ سخن فہمی و سخن گوئی کے لئے اس سرمہ سے بصارت حاصل ہوتی ہے۔

شعر(۲) فرماتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ضبط نالۂ غم سے میری زندگی تمام ہو جائے اور پھر تجھے میرے مرنے کا رنج ہو اور یہ رنج تیرے چہرے سے میرا غم پنہاں ہو کر ظاہر ہو۔

(۴۴) غافل بوہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں ۱ بے شانۂ صبا نہیں طرّۂ گیاہ کا
بزمِ قدح سے عیشِ تمنّا نہ رکھ کہ رنگ ۲ صیدِ ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا
رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے ۳ شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے ۴ پُرگل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا
جاں درہوائے یک نگہِ گرم ہے اسدؔ
۵-
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

شعر(۱) فرماتے ہیں غافل انسان اپنی خود آرائی کے وہم میں گرفتار ہے اور اپنی کاردانی پر فخر کا اظہار کرتا ہے حالانکہ دنیا میں کوئی کام بغیر حکم قادر مطلق کے نہیں ہوتا یہاں تک کہ گھاس جیسی ناچیز شے کی زلف سنوارنے کیلئے اس نے صبا کو مقرر کر رکھا ہے تو ایسی حالت میں انسان کا اپنی کامیابی پر ناز کرنا جہالت کی دلیل ہے۔ تمام کامرانیاں لطف الٰہی سے منسوب ہونی چاہئیں۔

شعر (۲) صید دام جستہ، وہ شکار جو دام سے نکل گیا ہو۔ رنگ بمعنی عیش و عشرت۔ فرماتے ہیں محفل شراب سے عیش و مسرت کی امید نہ رکھ کیونکہ یہ عیش ایک ایسا شکار ہے جو اس دام سے نکل چکا ہے مفہوم یہ ہے کہ بزم عیش و طرب کو ثبات نہیں اسلئے اس سے تمنائے مسرت بیکار ہے یا یہ کہ اس دنیا میں عیش و مسرت کو دوام نہیں۔

شعر (۳) فرماتے ہیں ہم اپنے گناہوں کا عذر کرنے میں شرمندگی کا احساس کرتے ہیں اسلئے اپنے گناہ کا عذر نہیں کرتے کیا عجب ہے کہ رحمت الٰہی ہمارے اس شرم کو جو عذر گناہ میں ہے قبول کرلے۔

شعر (۴) فرماتے ہیں میں مقتل میں معشوق کے ہاتھوں سے قتل ہونے کیلئے کس خوشی سے جا رہا ہوں اور میرا دامن نگاہ زخموں کے خیال سے پھولوں سے لبریز ہے یعنی زخموں کی بہار میری نظروں میں ہے۔

شعر (۵) ہوا بمعنی خواہش اور شوق۔ فرماتے ہیں اسد کی جان اک نظر گرم کی آرزومند ہے اور تیز دادخواہ نے اپنا وکیل اسلئے پروانہ کو مقرر کیا ہے تاکہ وہ تجھ کو جان دینے کا تماشہ شمع پر جل کر دکھا دے اور اسی طرح تو میری جان اک نگاہ گرم سے لے لے۔

(۵۴) جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا ۱ کہتے ہیں ہم تجھکو منہ دکھلائیں کیا
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ۲ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
لاگ ہو تو اسکو ہم سمجھیں لگاؤ ۳ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ ۴ یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا
موج خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے ۵ آستان یار سے اٹھ جائیں کیا
عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ ۶ مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
۷-
کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

شعر (۱) معشوق ظلم و ستم سے باز آگیا ہے مگر وہ کس طرح ظلم و ستم سے باز آسکتا ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے

تجھ پر بہت ظلم کیے ہیں اسلئے اب تیرے سامنے آنے سے مجھے شرم محسوس ہوتی ہے شاعر کہتا ہے کہ اب معشوق کا مُنہ نہ دکھانا بھی ایک ظلم ہے اسلئے وہ ترک ستم نہیں کرسکتا۔

شعر (۲) فرماتے ہیں ہم کسی کام کے بننے اور کسی کے نہ بننے سے کیوں پریشان ہوں سات آسمان گردش میں ہیں ان کی گردش کا آخر کچھ تو نتیجہ نکلے گا اور کچھ نہ کچھ ضرور ہو کر رہے گا۔

شعر (۳) لاگ بمعنی دشمنی۔ لگاؤ بمعنی محبت، فرماتے ہیں اگر معشوق کو ہم سے عداوت ہے تو ہم اپنے دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیں کہ اسکو ہم سے عداوت ہے لیکن جب نہ عداوت ہو اور نہ محبت ہو تو پھر کس بات پر دھوکا کھائیں۔

یادگار غالب میں مولانا حالی نے اس شعر کی شرح ان الفاظ میں فرمائی ہے۔ یہ مضمون عجب نہیں کہ کسی اور نے بھی باندھا ہو مگر ہم نے آجتک نہیں دیکھا اگر باندھا بھی ہوگا تو اس خوبی و لطافت سے نہ باندھا ہوگا مطلب یہ کہ معشوق کو ہمارے ساتھ دشمنی ہے اور نہ دوستی۔ اگر دشمنی بھی ہوتی تو اسلئے کہ اس میں ایک طرح کا تعلق ہوتا ہے ہم اس کو دوستی سمجھتے لیکن جب دوستی ہو اور نہ دشمنی تو کس بات پر پھر دھوکا کھائیں۔ قطع نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے لاگ اور لگاؤ ایسے دو لفظ بہم پہنچائے ہیں جن کا ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو دوچند کر دیا ہے۔

شعر (۴) فرماتے ہیں ہم نامہ بر کو خط دیکر اسکے ساتھ ساتھ کیوں ہولئے کیا ہم اپنے خط کو خود پہنچائیں۔ اس شعر میں جذبۂ رشک اور بےچینی کا اظہار فرمایا ہے۔

شعر (۵) موجِ خون سے مراد یہاں ایذا و تکلیف ہے۔ فرماتے ہیں خواہ ہمیں کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچے مگر ہم در یار سے نہ اٹھیں گے عزم یہ ہے کہ اب مر کے ہی اٹھیں گے۔

شعر (۶) دکھائیں کیا کہ ہم مرجع نہ آیا ٹھہرایا ہے فرماتے ہیں عمر بھر موت کا منتظر رہا کہ وہ حالت زندگی سے ضرور بہتر ہوگی۔ اب دیکھئے مرنے کے بعد کیا حالت دکھاتے ہیں جس کا تمام عمر منتظر رہا ہے (یادگار غالب)

شعر (۷) اس شعر میں معشوق کے تجاہل عارفانہ کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ وہ لوگوں سے میرے

معشوق یا میرے عشق کی شہرت سنکر پوچھتے ہیں کہ غالب کون شخص ہے۔ اب کوئی ہمیں بتلائے کہ ہم اسے کیا بتائیں کہ غالب کون ہے؟

زمردم یار می پرسد کہ غالب کیست طالع بیں!
کہ عمرم در محبت رفت و کار آخر رسید اینجا

(۴۶) لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی ۱ چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا
حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداری ساحل ۲ جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

شعر (۱) لطافت بمعنی پاکیزگی۔ کثافت بمعنی گندگی۔ زنگار چمن سے مراد سبزہ زار ہے فرماتے ہیں لطافت بغیر کثافت کے جلوہ گر نہیں ہو سکتی (مصرعہ ثانی اس بیان کا مثالی ثبوت ہے، باد بہاری) کا جلوہ ہمیشہ چمن کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے جب تک چمن میں زنگار چمن یا سبزہ زار نہ ہو اسوقت تک آئینہ باد بہاری کوئی نہیں۔ یہاں آئینہ باد بہار کو لطافت اور زنگار چمن (سبزہ زار) کو کثافت کہا ہے۔

شعر (۲) حریف بمعنی دشمن۔ جوشش دریا سے مراد طغیانی دریا۔ فرماتے ہیں۔ ساحل دریا اگرچہ کتنا ہی خوددار ہے لیکن اس کی خودداری دریا کی طغیانی کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور ساحل اپنے آپ کو غرق ہونے سے نہیں بچا سکتا اسی طرح جس بزم میں تو ساقی ہو وہاں ہوشیاری کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر نے معشوق کی ساقی گری کو جوشش دریا سے مشابہ کیا ہے۔

مولانا حالی نے یادگار غالب میں اس شعر کی شرح اس طرح سے فرمائی ہے ساحل لاکھ اپنے آپ کو بچائے مگر جب دریا طغیانی پر آتا ہے تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا اسی طرح جہاں تو ساقی ہو وہاں ہوشیاری کا دعویٰ نہیں چل سکتا۔ یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

(۴۷) عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ۱ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد ۲ تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام ۳ مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ ۴ اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
ضعف گریہ سے مبدّل بہ دمِ سرد ہوا ۵ باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال ۶ ہو گیا گوشت سے ناخن کا جُدا ہو جانا
ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھُلنا ۷ روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا
گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچہ کی ہوس ۸ کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا
تاکہ تجھ پر کھُلے اعجازِ ہوائے صیقل ۹ دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گُل ذوقِ تماشا غالبؔ
۱۰ چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

شعر (۱) فرماتے ہیں جب درد حد سے گزر جائیگا تو مرجائینگے یعنی فنا ہو جائینگے گویا قطرہ دریا میں کھپ جائیگا اور یہی اس کا مقصود ہے پس درد کا حد سے گزر جانا بھی اسکی دوا ہو جانا ہے (یادگارِ غالب)

شعر (۲) قفلِ ابجد سے مراد وہ تالا ہے جس کے حلقوں پر حروفِ ابجد کندہ ہوتے ہیں اور جب تک یہ سب حروف بہ ترتیب مقررہ نہیں ملتے قفل نہیں کھُلتا۔

شاعر نے اس شعر میں اپنی قسمت کو قفلِ ابجد سے مشابہ کیا ہے اور کہا ہے کہ جس طرح مقررہ لفظ کے بنتے ہی قفلِ ابجد کھل جاتا ہے اسی طرح تیرے ملنے کی تدبیر بنتے ہی میرے نصیبوں میں تجھ سے جُدائی لکھی تھی۔

شعر (۳) چارہ بمعنی علاج۔ زحمت بمعنی بیماری۔ عقدہ بمعنی گرہ، وا ہونا کھُلنا۔ فرماتے ہیں دل کشمکش نکرِ علاج ہی میں تمام ہو گیا اور یہ گرہ کھُلنے ہی میں مٹ گئی شاعر نے دلکو عقدہ سے تشبیہ دی ہے نہایت اچھی تشبیہ ہے۔

شعر (۴) اللہ اللہ ازرہ استعجاب کہا ہے۔ اربابِ وفا یعنی وفادار۔ فرماتے ہیں ایک وہ زمانہ تھا کہ ہم پر طرح طرح کے ظلم کئے جاتے تھے لیکن اب یہ دیکھ کر کہ ہم اسکے ظلم و ستم کو بخوشی برداشت کرتے ہیں اور اس سے لُطف اندوز ہوتے ہیں اس نے ہم جیسے سچے عاشقوں کو جفا سے بھی محروم کر دیا ہے۔

شعر (۵) فرماتے ہیں ہم مسئلہ استحالہ عناصر کے قائل نہ تھے یعنی یہ کہ پانی بھی مبدل بہ ہوا ہو جاتا ہے۔ اور ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک عنصر دوسرے عنصر میں کس طرح تبدیل ہو سکتا ہے لیکن اب جبکہ انتہائی ضعف سے ہم نالہ نہیں کر سکتے صرف آہیں کر رہے ہیں تو ہمیں اس امر کا یقین ہو گیا کہ پانی ہوا بن سکتا ہے۔

شعر (۶) فرماتے ہیں تیری حنا آلود انگلیوں کا خیال دل سے نہیں مٹایا جا سکتا یہ اسی طرح ناممکن ہے جس طرح گوشت کو ناخن سے نہیں جدا کیا جا سکتا۔

شعر (۷) فرماتے ہیں غم فرقت میں روتے روتے تمام ہو جانا میرے نزدیک ایسی ایک معمولی بات ہے جیسے ابر بہاری کا برس کر کھلنا۔ یہ بالکل نرالی تشبیہ ہے۔ (یادگار غالب)

شعر (۸) نکہتِ گل، پھول کی خوشبو۔ ہوس بمعنی آرزو۔ جولاں بمعنی دوڑنا۔ فرماتے ہیں اگر بوئے گل کو تیرے کوچہ میں پہنچنے کی ہوس نہیں ہے تو پھر یہ باد صبا کے رستہ کی گرد کیوں بن رہی ہے مفہوم شعر یہ ہے کہ بوئے گل اس لئے ہوا میں شامل ہے کہ اسے تیرے کوچہ میں پہنچنے کی سعادت نصیب ہو۔

شعر (۹) اعجاز بمعنی معجزہ صیقل بمعنی زنگ دور کرنا۔ آئینہ سے مراد آئینہ فولادی جو برسات میں سبز ہو جاتا ہے۔ آئینہ کا سبز ہو جانا موسم برسات کی ہوا کے اثر سے ہے فرماتے ہیں اگر تو عشق کے اعجاز کو دیکھنا چاہتا ہے تو موسم برسات میں آئینہ فولادی کو دیکھ کہ وہ زنگ آلود ہو جاتا ہے اور یہ زنگ لگنا کشش عشق کی صیقل ہے کیونکہ جب زنگ لگے گا تو آئینہ کو صیقل ضرور کیا جائے گا۔

شعر (۱۰) فرماتے ہیں اے غالب! باغ میں طرح طرح کے پھولوں کا کھلا ہوا ہونا میرے دل میں اشتیاق دید پیدا کرتا ہے لہذا چشم حقیقت بیں کو ہر رنگ میں کھل جانا چاہیئے۔ مفہوم یہ ہے کہ کائنات کے ہر ذرے کو اخذ نتائج کے لئے چشم بینا سے دیکھنا چاہیئے۔

ردیف "ب"

(۸۴) پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب ۱ دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب
پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن ۲ سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب
جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے ۳ سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر ۴ موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب
چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو ۵ موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب
جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز ۶ دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب
بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر ۷ شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب
موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال ۸ ہے تصور میں ز بس جلوہ نما موجِ شراب
نشے کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ ۹ بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب
ایک عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیتِ فصل ۱۰ موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب
شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل ۱۱ رہبرِ قطرہ بدریا ہے خوشا موجِ شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ **اسد**
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب -۱۲

شعر (۱) بال کشادن فارسی محاورہ ہے جس کے معنی اُڑنا۔ بطِ مے سے مراد شراب کی وہ صراحی جو بط کی شکل کی ہو۔ (بط ایک دریائی پرندہ ہے جو اکثر تالابوں یا جھیلوں میں رہتا ہے) فرماتے ہیں پھر وہ وقت آگیا ہے کہ موجِ شراب اُڑنے کیلئے اپنے پر و بال کھولے! وہ موجِ شراب بطِ مے کو دل و دست (حوصلہ و قوت) شناوری عطا کرے۔ مفہوم یہ ہے کہ پھر موسم بہار آگیا ہے شراب کا دور چلنا چاہیے بطِ مے کی بال کشائی کو دورِ شراب سے استعارہ کیا ہے۔

شعر (۲) سیہ مست بمعنی بہت مست۔ ارباب چمن سے مراد شجر و سبزہ ہیں۔ تاک بمعنی انگور۔ فرماتے ہیں ارباب چمن (باغ کے سرسبز اشجار) جو یہ مستی میں جھوم رہے ہیں اس کی وجہ نہ پوچھو۔ بات یہ ہے کہ ہوا جو سایۂ تاک (انگوروں میں) سے ہو کر گزرتی ہے وہ موج شراب کا اثر رکھتی ہے اور ارباب چمن اس سے متاثر ہو کر مستانہ وار جھوم رہے ہیں۔ سیہ مستی کا لفظ نہایت مناسب ہے۔ کیونکہ درختوں کی گہری سبزی سیاہی کے حد تک پہنچ جاتی ہے اور یہ بے نظیر تشبیہ ہے۔

شعر (۳) جو شخص شراب میں غرق ہو جائے وہ نہایت صاحب نصیب ہے اور اگر موج شراب سر سے گزر جائے تو وہ ہما کی طرح دلیل سعادت ہے اس شعر میں شاعر نے موج شراب کو بال ہما سے تشبیہ دی ہے اور موج شراب کے سر سے گزرنے میں نشہ مے کے حد سے گزر جانے کی طرف اشارہ ہے اور "بھی" کی معنوی قوت (جسے انگریزی میں فورس کہتے ہیں) اس شعر میں یہ ہے کہ اگر شراب کا استعمال اعتدال سے ہو تو نہایت اچھا ہے لیکن اگر اس کا نشہ حد سے تجاوز ہو تب بھی بال ہما سے مشابہ ہے۔

شعر (۴) فرماتے ہیں برسات وہ موسم ہے کہ اس میں بہت سی کیفیات اور بہت سی اشیاء میں ایک انقلاب سا پیدا ہو جاتا ہے اور کیا عجب ہے کہ موسم بہار کی ہوا کا فیض موج ہستی کو بھی موج شراب بنا دے مقصود یہ ہے کہ موسم بہار میں طبیعتوں میں ایک خاص ولولہ و جوش پیدا ہو جاتا ہے۔

شعر (۵) طرب بمعنی خوشی۔ فرماتے ہیں موسم بہار میں طوفان مسرت سے ہر طرف چار موجیں اٹھتی ہیں یعنی موج گل یعنی ہر طرف رنگ برنگ کے پھول شگفتہ ہوتے ہیں موج شفق یعنی آسمان پر ہر طرف شفق پھولتی ہے موج صبا یعنی ہر طرف خوشگوار ہوائیں چلتی ہیں موج شراب یعنی ہر طرف شراب کے دور چلتے ہیں۔ اس شعر میں شاعر نے بہار کی پوری کیفیت بیان کی ہے۔

شعر (۶) روح نباتی یعنی قوت نامیہ مراد سبزہ۔ جگر تشنہ بمعنی شائق۔ آب بقا مراد آب حیات۔ فرماتے ہیں موسم بہار میں جس قدر قوت نامیہ کے حسن ناز میں ترقی ہوتی ہے اسی قدر موج شراب اپنے آب حیات کے

گھونٹوں سے روح انسان کو قوت و تسکین عطا کرتی ہے۔

شعر (۷) رگ تاک یعنی انگور کی بیلیں۔ شہپر یعنی پر پرواز۔ فرماتے ہیں موج شراب انگور کی بیلوں میں خون بن کر دوڑ رہی ہے اور جو رنگینی بیلوں کے پتوں پر ظاہر ہو رہی ہے وہ درحقیقت پر پرواز ہے اور موج شراب اسی پر پرواز رنگ سے پرواز کرتی ہے۔

شعر (۸) فرماتے ہیں میرے تصور میں موج شراب جلوہ نما ہے اسلئے میرے گزرگاہ خیال میں موج شراب کی رنگینی نے موجہ گل سے مشابہ ہے چراغاں کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ موجہ گل کو چراغاں سے تشبیہ دی ہے۔

شعر (۹) نشو و نما سے مراد نشو و نما دماغ ہے سر یعنی خیال و خواہش ہے فرماتے ہیں موج شراب نشے کے پردے میں تماشائے دماغ میں محو ہے اس لئے کہ اُسے نشو و نمائے دماغ کا خیال ہے۔

شعر (۱۰) طوفانی یعنی جوش و خروش کا اظہار کرنے والے۔ فصل سے مراد موسم بہار۔ فرماتے ہیں موسم بہار نے زمانہ بھر میں ایک جوش و خروش کا طوفان برپا کر رکھا ہے اور موجۂ سبزۂ نوخیز سے لیکر موج شراب تک سب ایک ہی رنگ یعنی مستی کے عالم میں ہیں۔

شعر (۱۱) فرماتے ہیں موسم بہار بھی ایک عجیب شے ہے جو ہنگامہ ہستی کی شرح کر رہا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ نشاط بہار اور ہنگامۂ ہستی دونوں ناپائدار ہیں اسواسطے موسم بہار اس کی شرح ہے اور چونکہ شراب بھی بیخودی کی کیفیت پیدا کرتی ہے جو فنا سے مشابہ ہے اسلئے اس کو "رہبر قطرہ بدریا" کہا۔ کیونکہ فنا قطرے کو دریا سے اور جزو کو کل سے ملا دیتی ہے۔

شعر (۱۲) فرماتے ہیں اسد! جلوۂ گل دیکھ کر میرے ہوش اُڑنے لگتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ موج شراب کی بال کشائی یعنی دور شراب کا وقت آ پہنچا ہے۔

ردیف "ت"

(۴۹) افسوس کہ دیدان کا کیا رزق فلک نے ۱ جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت
کافی ہے نشانی تِرے چھلّے کا نہ دینا ۲ خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت
لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
۳- تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

شعر (۱) دیدان بمعنی کِرم کیڑے۔ درخور ہونا بمعنی قابل ہونا۔ عقد بمعنی موتیوں کا ہار مگر یہاں مراد چھلّہ یا انگوٹھی ہے۔ فرماتے ہیں جن لوگوں کی انگلیاں موتیوں کی انگوٹھیوں کے قابل تھیں افسوس آسمان نے ان کو مرنے کے بعد کیڑوں کی خوراک بنا دیا یعنی ان کی نرم و نازک انگلیوں کو کیڑے کھا رہے ہیں۔

بعض نسخوں میں دیدان کے بجائے دنداں دیکھا گیا ہے اس صورت میں اس شعر کی شرح یہ ہوگی۔ جن لوگوں کی انگلیاں موتیوں کے چھلّے کے قابل تھیں افسوس گردشِ آسمان نے ان کی انگلیوں کو دانتوں کا رزق بنا دیا یعنی وہ انقلاب روزگار سے انگشت بدنداں یعنی حیران ہیں۔

شعر (۲) فرماتے ہیں سفر کے وقت نشانی کے طور پر چھلّا وغیرہ دینے کا قاعدہ ہے شاعر کہتا ہے۔ کہ مجھے تیری یہی نشانی کافی ہے کہ تُو نے مجھے بجائے چھلّا دینے کے خالی انگلی دکھا دی اور نشانی نہ دی۔

شعر (۳) سخن گرم بمعنی سخن خوب یا لطیف و پاکیزہ اشعار۔ فرماتے ہیں اے اسدؔ میں سوزش دل کی وجہ سے لطیف و پاکیزہ اشعار کہتا ہوں تاکہ کوئی شخص میرے حرفوں پر انگلی نہ رکھ سکے یعنی میرے اشعار میں عیب نہ نکال سکے۔ اس جگہ ایک پُر لطف نکتہ یہ بھی ہے کہ گرم چیز پر کوئی شخص جل جانے کے خوف سے انگلی نہیں رکھتا پس میرے اشعار میں کوئی شخص اپنی بدنامی کے خوف سے عیب نہ نکال سکے گا۔

(۵۰) رہا کوئی تا قیامت سلامت پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

جگر کو مرے عشق خوننابہ مشرب ۲ لکھے ہے خداوند نعمت سلامت
علی الرغم دشمن شہید وفا ہوں ۳ مبارک مبارک سلامت سلامت
نہیں گر سر و برگ ادراک معنی
۴ تماشائے نیرنگ صورت سلامت

شعر(۱) فرماتے ہیں اگر کوئی تاقیامت زندہ و سلامت رہا تو کیا ایک روز مرنا لازمی ہے۔

شعر(۲) عشق خوننابہ مشرب سے مراد ایسا عشق جس کے مذہب میں خون کھانا جائز ہو فرماتے ہیں عشق جس کے مذہب میں خون پینا جائز ہے ہمیشہ میرے جگر کو خداوند نعمت لکھتا ہے اسلئے کہ اُس نے میرے خون جگر ہی سے پرورش پائی ہے۔

شعر(۳) علی الرغم دشمن معنی بخلاف دشمن۔ فرماتے ہیں میں دشمن کی خواہش کے خلاف شہید وفا ہوں اور اسی پر اپنے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کیونکہ آئین محبت میں شہید وفا ہونا ایک بہت بڑا امتیاز ہے، مولانا نظم فرماتے ہیں کہ مبارک اس وجہ سے کہ رقیب کے خلاف مراد ہے اور سلامت اس وجہ سے کہ شہید وفا زندہ جاوید ہے

شعر(۴) سرو برگ بمعنی سامان۔ صورت معنی کی ضد ہے۔ ادراک بمعنی سمجھنا، دریافت کرنا۔ نیرنگ صورت سے مراد اجسام ظاہری معنی سے مراد حقیقت۔ فرماتے ہیں اگر حقیقت کو سمجھنے یا دریافت کرنے کی قوت و سامان نہیں تو نہ سہی۔ نیرنگ صورت یعنی اجسام ظاہری کا دیکھنا ہی غنیمت ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ عشق مجازی عشق حقیقی کا زینہ ہے۔

(۵۱) مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت

شعر(۱) مُند گئیں سے مراد بند ہو گئیں۔ بالیں بمعنی سرہانہ۔ فرماتے ہیں اے غالب! میری آنکھیں کھولتے ہی کھولتے بند ہو گئیں یعنی موت آگئی احباب نے میرے سرہانے لے آئے لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔

(۵۲) آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست ۱ دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست
اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر ۲ کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست
خانہ ویراں سازیٔ حیرت تماشا کیجیئے ۳ صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست
عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے ۴ کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست
چشمِ ما روشن کہ اس بیدرد کا دل شاد ہے ۵ دیدۂ پرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست
غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اسکے ہجر میں قطعہ ۶ بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست
تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک ۷ مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدہ دیدارِ دوست
جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ ۸ سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست
چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر ۹ ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیٔ گفتارِ دوست
مہربانیہائے دشمن کی شکایت کیجئے ۱۰ یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
۱۱ ہے ردیفِ شعر میں غالبؔ زبس تکرارِ دوست

شعر (۱) فرماتے ہیں دوست کے رخساروں پر سبزہ آغاز ہو جانے سے اس کا بازارِ حسن سرد ہو گیا ہے۔ شاید خطِ رخسارِ دوست بجھی ہوئی شمع کا دھواں تھا۔ اس شعر میں شاعر نے خطِ رخسار کو شمعِ کشتہ یعنی بجھی ہوئی شمع سے تشبیہ دی ہے۔

شعر (۲) اے ناعاقبت اندیش دل خواہشِ دیدار کو ضبط کر، کوئی ایسا ہے جو جلوۂ یار کی تاب لا سکے؟ یعنی اس کے جمالِ باکمال کو دیکھ سکے۔ اس شعر میں حضرت موسیٰ کے قصہ کی طرف تلمیح ہے۔

شعر (۳) فرماتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے حیرت نے کس طرح میرے گھر کو برباد کر دیا ہے اور یار کی محشر خرامی نے صورتِ نقشِ قدم مجھے اپنا والہ و شیدا بنا دیا ہے (رفتہ رفتار دراصل وارفتہ رفتار دوست ہے) نیز یہ بھی ہو سکتا ہے

کہ شاعر نے خود کو باعتبار حیرانی و پامالی و خانہ بربادی نقش پا سے مشابہ کیا ہے۔

شعر (۴) فرماتے ہیں اگرچہ میں دوست کے عشق کا بیمار تھا اور اسی میں مجھے مرنا چاہیئے تھا لیکن میری بدنصیبی ملاحظہ فرمائیں میں مرا بھی تو دشمن کے رشک میں مرا اور بجائے کشتۂ دوست ہونیکے کشتۂ دشمن ہوا۔

شعر (۵) چشم ما روشن دل ما شاد۔ خوشی کے موقع پر کہا جاتا ہے نیز چشم ما روشن کے لحاظ سے دل ما شاد نظم کیا ہے۔ فرماتے ہیں ہم خوش ہیں کہ ہماری تکلیف سے اس کا دل خوش ہے اور ہمارا دیدۂ پرخوں یعنی خون کے آنسو بہانا دوست کیلئے بمنزلہ شراب کے لبریز ساغر کے ہے یعنی باعث مسرت ہے۔

شعر (۶) (قطعہ) فرماتے ہیں دوست میرے حال کی پرسش اس طرح کر رہا ہے جیسے کوئی نہایت ہی غمخوار دوست کسی دوست کا حال دریافت کرتا ہے۔

شعر (۷) فرماتے ہیں تاکہ میں اس کی پرسش حال سے یہ سمجھوں کہ اس کی رسائی دوست تک ہے اس لئے مجھ کو دوست کے وعدۂ دیدار کا فریب دیتا ہے۔

شعر (۸) فرماتے ہیں جب میں اپنے ضعف دماغ کا شکوہ کرتا ہوں تو وہ دوست کی معنبر زلفوں کی داستان شروع کر دیتا ہے۔

شعر (۹) اگر وہ مجھے چپکے چپکے روتے دیکھتا ہے تو یار کی شوخی رفتار کا قصہ چھیڑ دیتا ہے یعنی اُس کی خوبی گفتار کی حکایت بیان کرنے لگتا ہے۔

شعر (۱۰) فرماتے ہیں اس حالت میں ہم دشمن کی) ان مہربانیوں کی شکایت کریں جو وہ ہمارا جی جلانے کے لئے کرتا ہے یا دوست کے ظلم و ستم کا شکریہ ادا کریں۔

شعر (۱۱) فرماتے ہیں میں اپنی اس غزل کو خود دل سے پسند کرتا ہوں اس لئے کہ اس کی ردیف میں بار بار لفظ دوست آتا ہے جو مجھے پیارا معلوم ہوتا ہے۔

ردیف "ج"

(۱۳۵) گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج ۱ قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ ۲ تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج
اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل ۳ سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج
لو ہم مریضِ عشق کے تیماردار ہیں
۴۔ اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج!

شعر (۱) قمری۔ ایک چھوٹا سا پرندہ ہے۔ حلقہ در بمعنی دروازے کی زنجیر مجازاً وہ شخص جسے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔ فرماتے ہیں شاید آج ہمارا معشوق سیرِ باغ میں مصروف ہے کہ آج باغ کا انتظام عجیب طریقہ سے کیا گیا ہے اور قمری (جو ایک مرغِ نواسنج ہے) کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں اور اس کا طوق اس کے لئے حلقۂ بیرونِ در بنا ہوا ہے۔

شعر (۲) فرماتے ہیں آج میری ہر آہ کے ساتھ دل کا ایک ٹکڑا باہر آرہا ہے اور کمندِ تارِ نفس نے اثر کو شکار کر لیا ہے یعنی آج ہماری آہ میں اثر پیدا ہو گیا ہے۔

بعض شرحوں میں اس شعر کے معنی اس طرح بیان کئے گئے ہیں۔ ' تارِ نفس کی کمند نے اثر کو شکار کر لیا ہے لیکن اس اثر کا نتیجہ اُلٹا ہے کہ ہر فغان کے ساتھ ایک پارۂ دل باہر آتا ہے یعنی اثرِ آہ سے دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔ اثرِ آہ کے اس اُلٹے نتیجہ کے ذکر سے اپنی بدبختی کا اظہار مقصود ہے '

شعر (۳) چل یعنی رخصت ہو۔ فرماتے ہیں اے عافیت (آرام) کنارہ کر اور اے انتظام یہاں سے بھاگ نکل۔ میرے آنسوؤں کا سیلاب آج در و دیوار گرانے کے لئے تیار ہے (سیلابِ گریہ کے مقابلہ میں عافیت و انتظام کا وجود ممکن نہیں)

شعر (۴) تیمار دار سے مراد وہ شخص ہے جو کسی بیمار کی خدمت و غمخواری کرتا ہے فرماتے ہیں تو تم اس امر کی شکایت کرتے تھے کہ بیمارِ عشق کا کوئی نگراں یا خدمت کرنے والا نہیں ہم آج سے اس کی تیمارداری کا ذمہ لیتے ہیں لیکن اگر یہ اچھا نہ ہُوا تو پھر مسیحا کا کیا علاج؟ کیا علاج ایک محاورہ ہے جسکے معنی ہیں کہ پھر اسکو کیا سزا دی جائے

بیمارِ عشق کا جو نہ تم سے ہوا علاج
کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج

ردیف "چ"

(۴۵) نفس نہ آرزوئے انجمن سے باہر کھینچ ۱ اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ
کمالِ گرمیٔ سعیٔ تلاشِ دید نہ پُوچھ ۲ برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ
تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل ۳ کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ
تری طرف ہے بحسرت نظارۂ نرگس ۴ بکوریٔ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ
بہ نیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز ۵ نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں
بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

شعر (۱) فرماتے ہیں ترکِ آرزو نہ کر اور بزمِ آرزو سے باہر نہ نکل اگر شراب نہیں تو انتظارِ ساغر ہی سہی، بہرحال ترکِ آرزو نہ کر مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں انسان کو مایوس اور نا امید نہ ہونا چاہیئے اور کامیابی کی توقع کو کسی حالت میں بھی ترک نہ کرنا چاہیئے۔

شعر (۲) فرماتے ہیں معشوق کے دیدار کی خاطر جو مجھے دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے اسکی کیفیت مجھ سے نہ پوچھ، حسرتِ دیدارِ دوست میں جو حیرانی مجھ پر مستولی ہے اُس نے مجھے آئینہ بنا دیا ہے جس میں بجائے جوہر دل کے

کانٹے ہیں، جنکو کمال گرمی سعی کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے، تو بجائے میرا حال پوچھنے کے ان کانٹوں کو نکال جو دشت تلاش و سعی میں میرے تلوؤں میں چبھے ہوئے ہیں پھر تجھ پر میری سعی و تلاش کا حال آئینہ ہوگا۔

شعر (۳) فرماتے ہیں اے دل بستر پر لیٹے لیٹے دوست کا انتظار کرنا آرام ڈھونڈنے کا ایک بہانہ ہے لہذا اٹھ اور اس بستر کے ناز اٹھانے سے کنارہ کر۔ ناز بستر کے الفاظ سے شاعر نے کئی معنی پیدا کئے ہیں یعنی اٹھ صحرا نوردی کر، نالہ کشی کر وغیرہ وغیرہ۔

شعر (۴) فرماتے ہیں۔ نرگس تیرے چہرہ کو بنگاہ حسرت دیکھ رہی ہے کہ تو شراب کیوں نہیں پیتا؟ اور چونکہ تو بلحاظ شرم و حیا جو تیری طبیعت میں موجود ہے اسکی موجودگی میں بیجابانہ شراب نہیں پی سکتا لیکن میں تجھے بتاتا ہوں کہ میرا یہ رقیب یعنی نرگس کور دل اور کور چشم ہے اسلئے تجھے بے تکلف شراب نوشی کرنی چاہیئے

اس شعر میں نرگس کو رقیب اسلئے کہا گیا ہے کہ وہ بھی معشوق کے جمال کا نظارہ کرنے میں مشغول ہے۔ اور بوجہ آنکھ سے مشابہ ہونے کے کور چشم اور بے نور ہونے کے سبب کور دل کہا گیا ہے۔

شعر (۵) ودیعت بمعنی امانت۔ فرماتے ہیں تیرا خنجر ناز میرے پردۂ زخم جگر کے نیام میں بمنزلہ امانت موجود ہے تو اس کا حق امانت" بہ نیم غمزہ" ادا کر یعنی اس خنجر کو اس نیام سے نکال لے اور نیم نگاہ جو حق امانت یا مزد امانت ہے مجھے عطا فرما۔ نیز اس شعر میں صنعت الفاظ بھی موجود ہے وہ یہ کہ "نیام" کا الف نکال ڈالنے سے "نیم" رہ جاتا ہے اور عاشق بھی نیم غمزہ کا طالب ہے۔

شعر (۶) سفرہ بمعنی دسترخوان۔ سمندر وہ کیڑا جو آگ میں پیدا ہوتا ہے۔

فرماتے ہیں میرے پیالے میں آتش پنہاں کی شراب ہے لہذا اسی مناسبت سے میرے دسترخوان پر کباب بھی سمندر کے دل کے لگانے چاہئیں۔

ردیف "د"

۵۵) حُسن غمزہ کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد ۱ بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا ۲ ہوئی معزولیٔ انداز و ادا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے ۳ شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پر یعنی ۴ ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد
درخور عرض نہیں جوہر بیداد کو جا ۵ نگہ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد
ہے جنوں اہلِ جنوں کے لئے آغوش وداع ۶ چاک ہوتا ہے گریبان قضا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق ۷ ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی ۸ کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالب!
۹- کس کے گھر جائیگا سیلاب بلا میرے بعد

شعر (۱) غمزہ معشوق کے اس اشارے کو کہتے ہیں جو آنکھ اور ابرو کیا جائے۔ اہلِ جفا مراد معشوق، فرماتے ہیں میرے مرنیکے بعد "حسن" "غمزہ" یعنی ناز و انداز کی کشمکش سے چھوٹ گیا اور اہلِ جفا یعنی تمام معشوق آرام سے ہو گئے۔ مفہوم یہ ہے کہ جب تک میں زندہ تھا تمام معشوقوں کو مجھے اپنا فریفتہ بنانے کیلئے ناز و انداز سے کام لینا پڑتا تھا اب ان کو اس کشمکش سے نجات مل گئی۔

شعر (۲) منصب شیفتگی سے مراد منصب یا درجہ عشق ہے۔ فرماتے ہیں میرے مرنیکے بعد منصب عشق کے قابل کوئی نہ رہا اسلئے معشوقوں کے انداز و ادا معزول ہو گئے کیونکہ جب کوئی عاشق ہی نہیں تو پھر ناز و ادا کس کام کے؟

شعر (۳) فرماتے ہیں جب شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے درحقیقت وہ دھواں نہیں۔

بلکہ وہی شعلہ ہے جو شمع کے جل بجھنے کے بعد اُسکے غم میں سیہ پوش ہو جاتا ہے اسی طرح شعلۂ عشق میرے مر جانے کے بعد غم میں سیہ پوش ہوگیا ہے کیونکہ میں بھی آتش عشق کے سوز و گداز میں جل بجھا ہوں۔

شعر (۴) فرماتے ہیں میرا دل خاک میں ملنے کے بعد (یعنی قبر میں) معشوقوں کے حال پر خون کے آنسو بہا رہا ہے اسلئے کہ میرے مرنیکے بعد انکے ناخنوں کو حنا کی احتیاج ہوئی۔ مفہوم یہ ہے کہ زندگی میں تو وہ میرے خون سے اپنے ناخنوں کو رنگین کر لیا کرتے تھے اب میری موت کے بعد وہ محتاج حنا ہیں۔

شعر (۵) عرض بمعنی کسی چیز کا کسی پر ظاہر کرنا۔ فرماتے ہیں جوہر بیداد کے اظہار کیلئے اب کوئی مناسب جگہ نہیں رہی یعنی میرے مرنیکے بعد وہ کسی اور کو تختہ مشق ناز نہیں بنا سکتے۔ اسلئے نگہِ ناز نے سُرمہ لگانا چھوڑ دیا ہے اس شعر میں عرض اور جوہر کو رعایت لفظی کیلئے استعمال کیا ہے مگر وہ عرض جو جوہر کی ضد ہے وہ بہ رائے مفتوح ہے اور یہ برائے ساکن ہے۔

شعر (۶) آغوش وداع ہے یعنی رخصت ہو رہا ہے۔ چاک گریباں یعنی گریبان کا پھٹنا۔ فرماتے ہیں۔ جنونِ عشق بھی میرے ساتھ دُنیا سے اُٹھ رہا ہے اور چاک گریبان سے رُخصت ہو رہا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ میرے بعد اب کوئی شخص حالت جنون عشق میں اپنے گریبان کو چاک نہ کرے گا۔ اور اب کوئی گریبان چاک یعنی پھٹا ہوا نظر نہ آئے گا۔

شعر (۷) مصرع اول مجموعہ الفاظ "صلا" ہے پہلی بار ساقی سوالیہ لہجے میں دریافت کرتا ہے کہ "کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق؟" مگر کسی میں یہ ہمت نہیں کہ وہ شراب عشق پیئے اور جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو دوبارہ بطریق مایوسی اس مصرع کو پڑھتا ہے کہ "کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق!" یعنی کوئی نہیں ہو سکتا۔ لفظ "مکرر" نے اس شعر کو گویا فلک الافلاک پر پہنچا دیا ہے۔

شعر (۸) فرماتے ہیں میں اس غم میں مر رہا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد مہر و وفا کا بھی خاتمہ ہو جائیگا اور کوئی ان کی تعزیت کرنے والا بھی باقی نہ رہے گا۔

شعر (۹) مجھے عشق کی بیکسی پہ رونا آتا ہے کہ میری موت کے بعد یہ سیلاب بلائے عشق کسکے گھر جائیگا۔ یعنی میرے مرنے کے بعد عشق کا کوئی پرسان حال تک نہ ہوگا۔ اور عشق کی بیکسی کا یہ تصور میرے لئے ابھی سے سوہان روح بن رہا ہے۔

ردیف "ر"

(۵۶) بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار ۱ نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار
وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ ۲ کہ ہو گئے میرے دیوار و در در و دیوار
نہیں ہے سایہ کہ سن کر نویدِ مقدمِ یار ۳ گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار
ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مۓ جلوہ ۴ کہ مست ہیں ترے کوچہ میں ہر در و دیوار
جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ ۵ کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار
ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے ۶ کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار
وہ آ رہا مرے ہمسائے میں تو سائے سے ۷ ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار
نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی ۸ ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار
نہ پوچھ بے خودیٔ عشق مقدمِ سیلاب ۹ کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار
نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں
۱۰ حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

شعر (۱) فرماتے ہیں نگاہ شوق کے رستہ میں در و دیوار حائل نہیں ہو سکتے بلکہ یہ بال و پر کا کام دیتے ہیں اور میری نگاہِ شوق تیرے جمالِ جہاں آرا کو دیکھ لیتی ہے مفہوم یہ ہے کہ رکاوٹوں سے شوق میں اور ترقی ہوتی ہے

دیکھ لیتی ہیں پسِ پردہ تجھے
ہیں کچھ ایسی بھی نگاہیں خاص خاص (بیخود)

شعر (۲) وفورِ اشک یعنی کثرتِ گریہ۔ فرماتے ہیں میرے کثرتِ گریہ یا طوفانِ اشک نے گھر کا یہ حال کر دیا ہے کہ جہاں دیواریں تھیں وہ ٹوٹ کر دروازے بن گئے ہیں اور جہاں دروازے تھے وہ گر کر دیواریں بن گئی ہیں۔

شعر (۳) نوید بمعنی خوشخبری۔ مقدم بمعنی آنا۔ فرماتے ہیں یہ در و دیوار کا سایہ نہیں جو در و دیوار سے کچھ آگے ہے بلکہ یار کے آنے کی خوشخبری سنکر خود در و دیوار اسکے استقبال کیلئے چند قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔

شعر (۴) فرماتے ہیں تو نے اپنے جلوہ حسن کی شراب کو کتنا ارزاں کر دیا ہے کہ تیرے کوچہ کے در و دیوار بھی شراب جلوہ حسن سے مست ہو رہے ہیں۔

شعر (۵) فرماتے ہیں اگر تو میرے سودائے انتظار کے خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے تو آ کیونکہ میری نظریں تیرے انتظار میں در و دیوار پر جمی ہوئی ہیں اور کثرت انتظار سے در و دیوار نے دکان متاع نظر کی شکل اختیار کر لی ہے۔

شعر (۶) فرماتے ہیں میں نے جب کبھی دل کھول کر رونے کا سامان کیا تو فوراً در و دیوار میرے قدموں پر گر پڑے۔ مفہوم یہ ہے کہ میرے گریہ میں اتنا اثر ہے کہ تکمیل ارادہ سے پہلے ہی اس کا اثر ظاہر ہو جاتا ہے۔

شعر (۷) فرماتے ہیں میرا محبوب جب میرے ہمسایہ میں آکر آباد ہو گیا تو میرے مکان کے در و دیوار کا سایہ اسکے مکان کے در و دیوار کے سائے پر قربان ہونے لگا۔

شعر (۸) فرماتے ہیں بغیر تیرے گھر کی آبادی ہماری نظروں میں کھٹکتی ہے اور ہم در و دیوار کو دیکھ دیکھ کر روتے ہیں (آنکھ میں اگر کوئی چیز کھٹکے تو اس کا لازمی نتیجہ آنسوؤں کی روانی ہے)

شعر (۹) سیلاب گریہ آنے کے وقت بیخودی عیش کی کیفیت مجھ سے نہ پوچھ گویا در و دیوار پر حالت وجد طاری ہو جاتی ہے اور وہ رقصاں نظر آتے ہیں۔

شعر (۱۰) فرماتے ہیں اے غالب! اگرچہ تیرے راز محبت کو سننے والا سوائے در و دیوار کے اور کوئی نہیں لیکن اس کا تذکرہ کسی سے نہ کر کیونکہ لوگ تجھے مجنوں خیال کرینگے اور کہیں گے کہ در و دیوار بھی کہیں راز محبت سنتے ہیں اور در و دیوار سے مخاطب ہونا کوئی عقلمندی کی نشانی ہے۔

(۵۷) گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر ۱ جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر
کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن ۲ جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر
کام اُس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں ۳ لیوے نہ کوئی نام ستم گر کہے بغیر
جی ہی میں کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم ۴ سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر
چھوڑوں گا میں نہ اس بُتِ کافر کا پُوجنا ۵ چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام ۶ چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ۷ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات ۸ سنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر
غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
۹- ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

شعر (۱) فرماتے ہیں جب تیرے دروازے پر بغیر تیری اجازت کے میں نے اپنا گھر بنا لیا ہے تو کیا اب بھی تو میرے گھر کو بلا میرے بتلائے ہوئے نہیں جان سکتا اور یہ کہتا رہے گا کہ تمہیں تیرا گھر معلوم نہیں۔

شعر (۲) فرماتے ہیں جب مجھ میں ضعف و نقاہت کے سبب طاقت سخن نہ رہی تو وہ لوگوں سے کہنے لگے۔ کہ میں اسکی تمنا کیونکر پوری کروں۔ میں کسی کے دل کا حال کیسے جان سکتا ہوں جب تک، کہ وہ خود نہ بیان کرے شاعر کا مطلب یہ ہے کہ کاش یہ بات وہ پہلے کہتے تو میں اپنے دل کا حال ان سے بیان کرتا اب جبکہ مجھے بات کرنے کی طاقت نہیں رہی (ان) کا یہ ارشاد ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے؟

شعر (۳) فرماتے ہیں خوبیٔ قسمت سے میں ایک ایسے شخص پر عاشق ہوں کہ جسکے نام کے ساتھ ہر شخص "ستمگر" کا لفظ استعمال کرتا ہے (اس جگہ ستمگر کا لفظ کتنا بلیغ ہے یعنی میرا معشوق صرف "ستم" کرتا ہی نہیں ہے بلکہ ستم "ایجاد کرتا" یا "بناتا" بھی ہے)

شعر (۴) فرماتے ہیں ہمارے دل میں کسی کی شکایت موجود نہیں ورنہ ہم تو صاف باطن شخص ہیں اور
ہ پرکھنے والے ہیں چاہے اس میں ہماری جان ہی کیوں نہ جائے لیکن ہم کہے بغیر نہ رہیں۔

شعر (۵) فرماتے ہیں اس بت کافر کی پرستش ترک نہیں کر سکتا چاہے لوگ مجھے کافر ہی کیوں نہ کہیں؟

خلق میگوید کہ خسرو بت پرستی میکند
آرے آرے میکند با خلق عالم کار نیست

شعر (۶) دشنہ بمعنی کٹار۔ فرماتے ہیں اگرچہ مقصود معشوق کے ناز و غمزہ کا بیان ہوتا ہے مگر شاعرانہ
ان میں دشنہ و خنجر کے بغیر کام نہیں چلتا۔ مفہوم یہ ہے کہ شاعری کا لطف بغیر تشبیہات و استعارات
نہیں آسکتا۔

شعر (۷) فرماتے ہیں چاہے مشاہدہ حق کے متعلق ہی بیان کیوں نہ ہو مگر شاعری میں انہیں بغیر
و ساغر کے کام نہیں چلتا (یہ شعر بھی شعر سابق کی طرح ہے)

شعر (۸) فرماتے ہیں اگر میں بہرا ہوں تو آپ کی مہربانی دوگنی ہونی چاہیئے کیونکہ جب تک بات کو
بارہ نہ کہا جائے میں سُن نہیں سکتا۔ (اس شعر میں شاعر نے اپنی حالت بیان کی ہے۔ عمر کے آخری دور
عارضہ ثقل سماعت بڑھ گیا تھا)

شعر (۹) شاعر نے اپنے حال کو کس لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ صنعت معنوی کے علاوہ سب
عرض کر دینے کے بعد بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ نہیں کہا۔

(۵) کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر ۱ جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے ۲ سرگرم نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر
کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا ۳ رُکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
آتا ہے میرے قتل کو پر جوش رشک سے ۴ مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہُوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق ۵ لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر
واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ۶ ہم کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھ کر
بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ ۷ لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر
زنّار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال ۸ رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر
ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں ۹ جی خوش ہُوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر
کیا بدگماں ہے مجھسے کہ آئینہ میں مرے ۱۰ طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طُور پر ۱۱ دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا
۱۲- یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

شعر (۱) فرماتے ہیں میں یار کا روئے پُرانوار دیکھ کر کیوں نہ جل گیا۔ میں اپنی قوت دیدار دیکھ کر جل رہا ہوں۔ اس شعر میں شاعر نے انتہائے رشک کا اظہار کیا ہے۔

شعر (۲) چونکہ میں دن رات آتشیں نالے کرنے میں مصروف ہوں اس لحاظ سے لوگ مجھے آتش پرست کہتے ہیں حالانکہ میں آتش پرست نہیں ہوں۔

شعر (۳) فرماتے ہیں جہاں معشوق کی جفا عام ہو وہاں عشق کی آبرو کیا ہو سکتی ہے کیونکہ اس سے سچے عاشق اور بوالہوس میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ آپ کو بے سبب آزار دیکھکر میں اپنے آپ کو عشق سے روکتا ہوں۔ مجھ عاشق پر تو آپ ظلم کر سکتے ہیں جو جائز ہے لیکن رقیب جو عاشق نہیں اس پر ظلم کرنا میرے عشق کی آبرو پر ایک داغ ہے۔

شعر (۴) فرماتے ہیں معشوق میرے قتل کو آرہا ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے ضرور قتل کریگا لیکن میں تلوار اسکے ہاتھ میں دیکھکر جوشِ رشک سے مر رہا ہوں کہ تلوار کی اسکے دستِ نازک تک رسائی کیوں ہے؟

شعر (۵) فرماتے ہیں شیشۂ شراب کی گردن پر ایک جہان کا خون ثابت ہوگیا ہے اور موجِ شراب تیری
تار دیکھ کر لرز رہی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ خونِ خلق تیری رفتارِ مستانہ سے ہوا اور تیری مستی کا باعث مے
شی تھی اور وہ مے شیشہ میں تھی لہذا خونِ خلق کا سبب شیشۂ مے ہُوا۔

شعر (۶) فرماتے ہیں ہائے افسوس یار نے ہمیں ظلم و ستم کا خواہشمند دیکھ کر ظلم کرنا چھوڑ دیا اور مجھے
ں سے بھی محروم کر دیا۔ مفہوم یہ ہے کہ معشوق عاشق کی کسی خواہش کو پُورا ہونے نہیں دیتا۔

شعر (۷) فرماتے ہیں ہم اپنی جنسِ سخن کے ساتھ خود خریدار کے ہاتھ بک جاتے ہیں لیکن اسکی طبیعت کا پہلے
ندازہ کر لیتے ہیں اور دیکھ لیتے ہیں کہ وہ کس حد تک ہمارے اشعار سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے اسکے بعد ہم خود اسکے
دردان بنجاتے ہیں اسلئے کہ جو شخص میرے کلام کا قدردان ہے وہ درحقیقت صحیح ذوق رکھتا ہے۔

شعر (۸) رشتۂ زنار کو بہ سبب صاف ہونے کے راہِ ہموار سے تعبیر کیا ہے اور تسبیح کو اس کے دانوں کے
شیب و فراز کی وجہ سے راہِ ناہموار خیال کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تسبیح و زنّار دونوں ایک ہی منزل پر پہنچنے
ے دو مختلف راستہ ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ زنار کی راہ ہموار اور تسبیح کی راہ میں ٹھوکریں ہیں اس لئے زنّار
ہن لے اور تسبیح ترک کر دے مسافر کو ہموار راستہ پر چلنا چاہیئے۔ (تسبیح پر زنّار اور کعبہ پر بت خانہ کو ترجیح
دینا شعرا کا عام دستور ہے)

شعر (۹) فرماتے ہیں میں پاؤں کے ان آبلوں کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا مگر راستہ کو پُرخار دیکھ کر اب جی
خوش ہُوا ہے کہ یہ سب پھوٹ جائیں گے۔ (مفہوم یہ ہے کہ عاشق صادق عشق کی مصیبتوں سے نہیں گھبراتا)

شعر (۱۰) فرماتے ہیں معشوق مجھ سے کتنا بدگمان ہے کہ میرے آئینہ فولادی میں جو زنگ لگا ہُوا
ہے اُسے زنگ نہیں سمجھتا بلکہ عکس طوطی خیال کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں نے طوطی کو آئینہ کے پیچھے چھپا
رکھا ہے تاکہ وہ اس کی یعنی معشوق کی باتوں کا چربہ اُتارے۔ حالانکہ اس میں کوئی اصلیت نہیں
محض اس کی بدگمانی ہے ۔

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
انچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم

شعر (۱۱) اس شعر میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا مگر وہ اسکے متحمل نہ ہوئے اور ڈر گئے لیکن انسان نے اُسے اُٹھا لیا میرزا فرماتے ہیں برقِ تجلی گرنے کے ہم مستحق تھے نہ کوہ طور، اسلئے کہ شرابخوار کا ظرف دیکھ کر اُس کے موافق اُسکو شراب دی جاتی ہے پس کوہ طور جو منجملہ جمادات کے ہے وہ کیونکر تجلی الٰہی کا متحمل ہو سکتا ہے یہ خیال مع اس تمثیل کے جو اس میں بیان ہوئی ہے بالکل اچھوتا خیال ہے (یادگار غالب) یہ شعر مرزا صاحب کے نشتروں میں سے ہے۔

شعر (۱۲) فرماتے ہیں مجھے تیری دیوار دیکھ کر غالب شوریدہ سر مجنوں کا سر پھوڑنا یاد آگیا کہ وہ حالت جنون عشق میں ان دیواروں کے ساتھ سر پھوڑا کرتا تھا۔

(۵۹) لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر ۱ میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جو ہو خارِ بیاباں پر
نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی ۲ سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اس زمانے سے ۳ کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے ۴ بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر
نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا ۵ کہ پشتِ چشم سے جسکے نہ ہووے مہر عنواں پر
مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا ۶ کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر
بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا ۷ قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر
نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی ۸ ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

شعر (۱) فرماتے ہیں میرا دل مہر درخشاں کی زحمت پر لرزتا ہے کہ وہ ایک ایسے قطرۂ ناچیز کے فنا کرنے کی تکلیف اُٹھاتا ہے جو نوکِ خار پر ٹھہر گیا ہے اور جس کا فنا ہو جانا ایک روز یقینی ہے دل کا لرزنا اسلئے کہا گیا کہ آفتاب صبح کو لرزتا ہوا نکلتا ہے

شعر (۲) فرماتے ہیں زنداں میں بھی حسن یوسف کیلئے سامان آرائش پیدا ہو گیا ہے اور حضرت یعقوب کی آنکھوں کی سفیدی قید خانہ کی درو دیوار پر پھر رہی ہے۔ "پھرتی ہے" ایک ذو معنی لفظ ہے جس سے گردش کرنے اور تلاش کرنیکے معنی بھی مفہوم ہوتے ہیں۔ تلمیح ظاہر یہ ہے کہ حضرت یعقوب کی آنکھیں فراق یوسف میں بے نور ہو گئیں تھیں۔ "پھرتی ہے" میں ایہام ہے ایک تو سفیدی چشم یعقوب جو دیوار زنداں پر شوق دیدار حضرت یوسف علیہ السلام میں پھرتی ہے دوسرے وہ سفیدی جو مکانوں پر صفائی اور آرائش کے لئے پھرتی ہے۔

شعر (۳) فرماتے ہیں میں تعلیم فنا درس بیخودی میں اسوقت سے حاصل کرتا ہوں کہ مجنوں اُس وقت طفل مکتب تھا اور مکتب کی دیواروں پر بچوں کی طرح لکیریں کھینچتا تھا نیز اس شعر میں شاعر نے "لام الف لکھتا تھا" جو کہا ہے اس سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ مجنوں اس وقت "لا" لکھتا تھا یعنی ابھی وہ لفظ "لیلیٰ" بھی پورا نہ لکھ سکتا تھا اور اسکو لیلیٰ کا عشق کامل نہ ہوا تھا یا وہ "لا" لکھ کر نیستی کی مشق کرتا تھا۔ مطلب شعر یہ ہے کہ میں درس فنا میں مجنوں پر فوقیت رکھتا ہوں اسلئے کہ مجھ کو فنا کی تعلیم روز ازل سے ملی تھی۔

شعر (۴) فرماتے ہیں اگر میرے دل کے ٹکڑے نمکدان یعنی نمک چھڑکنے کی ایذا پر خوش رہتے تو میں مرہم کی تشویش سے کس قدر آزاد اور فارغ البال رہتا اور اس کی جستجو میں دربدر کی ٹھوکریں نہ کھاتا۔ مفہوم یہ ہے کہ ایک عاشق کے لئے نمک کی موجودگی میں مرہم کی تلاش باعث ننگ ہے۔

شعر (۵) طومار بمعنی دفتر۔ پشت چشم کنایہ از غمزہ و اغماض چشم پوشی۔ بے پروائی۔ عنوان بمعنی نامہ فرماتے ہیں اقلیم محبت میں کوئی فرمان ناز ایسا نہیں کہ جسکے عنوان پر معشوق کی بے پروائی کی مُہر ثبت نہ ہو۔ مفہوم یہ ہے کہ معشوقوں کے ناز کے ساتھ اُن کا آنکھ پھیر لینا لازمی ہے گویا ادھر کسی کا ناز و ادا سے دل لیا اُدھر آنکھیں پھیر لیں اور لفظ عنوان سے معشوق کی فوری بیوفائی کی طرف اشارہ ہے۔

شعر (۶) فرماتے ہیں مجھے آسمان پر ابر شفق آلودہ دیکھ کر یہ یاد آ رہا ہے کہ تیری جدائی میں کس طرح گلستان پر آگ برستی تھی۔ مفہوم یہ ہے کہ جب کبھی زمانۂ ہجر میں سیر باغ کا اتفاق ہوا اور غنچہ و گل پر نظر پڑ

آواز پر مرتا ہوں کہ وہ جلاد سے کہے کہ "ہاں اور" یعنی ایک اور وار کر' ہاں ایک اور ہاتھ چھوڑ۔

شعر (۸) فرماتے ہیں میرے سینہ سے ہر روز جو ایک نیا داغ جدائی ظاہر ہوتا ہے تو لوگوں کو اس پر آفتاب جہاں تاب کا دھوکا ہوتا ہے یعنی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سورج طلوع ہو رہا ہے۔

شعر (۹) فرماتے ہیں تمہیں دل نہ دیتا تو کوئی دم اور چین لیتا اور جو نہ مرتا تو کوئی دم اور آہ و فغاں کرتا اس شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے جیسے مرزا صاحب نے یہ معشوق کے سوال کے جواب میں کہا ہے۔ مثلاً معشوق سوال کرتا ہے "تو کوئی دم چین نہیں لیتا" تو شاعر کی طرف سے یہ جواب دیا گیا اگر تمہیں دل نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا۔ معشوق نے کہا "تو آہ و فغاں کیوں نہیں کرتا" عاشق نے جواب دیا "اگر نہ مرتا تو کوئی دن اور آہ و فغان کرتا"

شعر (۱۰) فرماتے ہیں جب ندی نالے رک جاتے ہیں اور جب اسکے بعد انہیں راستہ ملتا ہے تو وہ نہایت زور سے بہتے ہیں اسی طرح میری طبیعت جب رکتی ہے تو نہایت زور سے چلتی ہے مفہوم یہ ہے کہ جب میں کچھ روز شعر نہیں کہتا پھر جو کہتا ہوں تو طبیعت زیادہ رواں ہوتی ہے۔

شعر (۱۱) فرماتے ہیں اگرچہ دنیا میں اور بھی نہایت بلند پایہ شاعر موجود ہیں مگر لوگ کہتے ہیں کہ غالب کا انداز بیان سب سے نرالا ہے۔

(۱۶) صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر ۱ تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر
نہ کی سامان عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
۲- ہوا جام زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر

شعر (۱) آب برجا ماندہ سے وہ پانی مراد ہے جو ایک جگہ پر ٹھہرا ہے اور اس کا رنگ متغیر ہو جائے جس طرح آئینہ کی صفائی ہی اسکے زنگ کا سبب ہے اسی طرح جب پانی ایک جگہ پر ٹھہرا رہتا ہے تو اس پر کائی جم جاتی ہے شاعر نے آئینہ کی صفائی کو پانی اور زنگ کو کائی سے تشبیہ دی ہے مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں جو لوگ۔ زیادہ مشہور اور قابل ہوتے ہیں عام طور پر وہی آلام و مصائب کا شکار ہوتے ہیں۔

شعر (۲) فرماتے ہیں سامانِ عیش و جاہ بھی میری وحشتِ عشق کو دور نہ کر سکے بلکہ میری وحشت اس سے اور بڑھ گئی بلکہ جامِ زمرد بھی میری نگاہ میں داغِ پلنگ یعنی چیتے کا داغ بن گیا ہے۔

(۶۲) جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی ۱ گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر
بہ رنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بے تابی ۲ ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر
فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے ۳ متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر
ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے ۴ شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر
فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا ۵ فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر
اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
۶- تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

شعر (۱) فرماتے ہیں چاک گریبانی کا نتیجہ عریانی ہے اور عریانی نشانِ جنون ہے اس لئے میں اپنی عریانی کا احسانمند ہوں کہ اس نے میرے جنون کی دستگیری (مدد) کی اور اس طرح چاک گریبان کا حق میری گردن پر ہے اگر گریبان چاک نہ ہوتا تو میرے آثارِ جنون ثابت نہ ہوتے۔

شعر (۲) نیرنگ بمعنی شعبدہ۔ بال بمعنی بازو۔ تپیدن بمعنی تڑپنا۔ کاغذ آتش زدہ سے مراد وہ کاغذ جو جل گیا ہو فرماتے ہیں میرا نیرنگ بیتابی کاغذ آتش زدہ کی طرح یک بال تپیدن پر ہزار دل باندھتی ہے یعنی جس طرح جلتے ہوئے کاغذ میں ہزاروں دل پیدا ہو جاتے ہیں۔ دل سے مراد وہ روشن نقاط ہیں جو کاغذ کے جلنے میں پیدا ہوتے ہیں شاعر کہتا ہے اسی طرح میرے دل کے جلنے میں ہزاروں دل جو دل کے ٹکڑوں سے مراد ہیں اسکے ساتھ جلتے ہیں شاعر نے اس شعر میں تپیدن کو کاغذ آتش زدہ سے تعبیر کیا ہے اور اسکے نقطہائے روشن کو دلوں سے مشابہ کیا ہے ؎

تنہا نہ ہمیں جان و دلم در تب و تاب است
چوں کاغذ آتش زدہ یک شہر شرارم (نواب علی حسن خاں)

شعر (۳) متاع بردہ یعنی لوٹی ہوئی متاع۔ یہ مضمون بھی بالکل واقعیات میں سے ہے جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم و ستم رسیدہ و فلک زدہ سمجھتے ہیں اور آخر دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہوگا اور ہمارا اقبال پھر عود کرے گا۔ (یادگار غالب)

شعر (۴) بے سبب رنج یعنی بے سبب آزردہ ہو جانے والا۔ آشنا دشمن یعنی دوستوں کا دشمن۔ فرماتے ہیں ہمارا اس بے سبب آزردہ ہو جانے والے اور دوستوں کے دشمن معشوق سے پالا پڑا ہے جو اپنی دیوار کے روزن میں شعاع مہر کو دیکھ کر اسے میری نگاہ سمجھتا ہے اور مجھ پر روزن در سے جھانکنے کی تہمت رکھتا ہے مفہوم یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ تو نے مجھے روزن در سے جھانکا تھا اور یہ شعاع آفتاب نہ تھی بلکہ تیری نظر تھی۔

شعر (۵) گلخن یعنی آتش گاہ، بھاڑ یعنی خانہ، خاشاک یعنی کوڑے اور تنکے۔ فرماتے ہیں اگر تو اپنی حقیقت کے معلوم کرنے کا خواہاں ہے تو فنا ہو جا کیونکہ کوڑے اور تنکے کا نصیبہ گلخن یعنی بھاڑ میں چمکتا ہے یعنی جب تنکا بھاڑ میں جا کر جلتا ہے تب اس میں فروغ پیدا ہوتا ہے مفہوم یہ ہے کہ فنا فی اللہ ہو کر معرفت الٰہی حاصل کر۔ بغیر فنا ہوئے تو اپنی حقیقت معلوم نہیں کر سکتا۔

شعر (۶) فرماتے ہیں ہمیں اسد کے حال پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ کس انداز کا بسمل ہے جو قاتل سے کہتا ہے کہ تو خون ناحق کا خوف نہ کر تو مشق ناز کئے جا اور مجھے اسی انداز سے قتل کرتا رہ دونوں عالم کا خون میری گردن پر ہوگا۔

(۳۶) لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور ۱ تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائیگا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا ۲ ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں ۳ مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے ۴ کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف ۵ کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہ شب چہار دہم تھے مرے گھر کے ۶ پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے ۷ کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی ۸ بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گذری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش ۹ کرنا تھا جوانمرگ گذارا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
۱۰ قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

شعر (۱) یہ تمام غزل زین العابدین عارف کے نوحہ میں ہے عارف مرزا کی بیوی کے بھانجے تھے مرزا کو ان سے کمال محبت تھی یہ ایک نہایت ہی خوش فکر نوجوان تھے علاوہ ازیں مرزا کے لائق ناز شاگرد بھی تھے ان کا انتقال عین عنفوان شباب میں ہوا مرزا غالب مدتوں انکے غم میں پریشان رہے اس غزل کے دردانگیز اشعار سے ظاہر ہے کہ یہ سب جلے ہوئے دل کے نکلے ہیں تمام اشعار تیر و نشتر ہیں جو صاحب ذوق آدمی کے دلکو مجروح کر دیتے ہیں عارف مرحوم کے تصور کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔ اگر تمہیں مرنا ہی تھا تو میرے ساتھ مرے ہوتے مگر تم نے جلدی کی اور میرے مرنے کا انتظار نہ کیا اور تم نے راہِ عدم کا رستہ تنہا طے کیا العذاب کچھ دن اور ٹھہرنا رہو۔ تنہا کیوں گئے تھے نہ تنہا جاتے اور نہ تنہا رہنا پڑتا۔

شعر (۲) فرماتے ہیں اگر تیرا سنگِ مزار نہ گھسے گا تو میری ناصیہ فرسائی کرنے سے میرا سر تو مٹ جائیگا تیرے سنگِ مزار پر میری ناصیہ فرسائی صرف چند دن کیلئے ہے مفہوم یہ ہے کہ میں عنقریب تم سے ملا چاہتا ہوں۔

شعر (۳) فرماتے ہیں ابھی دنیا میں آئے ہوئے تمہیں زمانہ ہی کیا گذرا ہے گویا کل ہی تو آئے ہو اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں میں نے مانا کہ تم ہمیشہ نہیں رہو گے لیکن کچھ دن تو اور ٹھہر جاؤ۔

شعر (۴) فرماتے ہیں، تم جاتے ہوئے کہتے ہو کہ قیامت کو ملیں گے کیا خوب! قیامت کا دن کوئی اور ہے ہمارے لئے تو تمہاری موت کی وجہ سے آج ہی قیامت ہے۔

شعر (۵) اس شعر میں آسمان سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں اے بڈھے آسمان عارف تو ابھی جوان تھا

اگر یہ کچھ دن اور نہ مرتا تو تیرا کیا بگڑتا؟

شعر (۶) فرماتے ہیں تم میرے گھر کیلئے چودھویں کے چاند تھے تمہاری وجہ سے میرے گھر میں اُجالا تھا اگر یہ غلط ہے تو تمہارے بعد میرے گھر کا وہ نقشہ کیوں نہ رہا اور یہ سیہ خانہ کیوں بن گیا نیز چودھویں کا چاند تو چھپ بتدریج گھٹ کر ہلال بنتا ہے تب کہیں جا کر چھپتا ہے اور تم تو یکبارگی چھپ گئے (شاعر نے چودھویں کا چاند رعایت جوانی کے لحاظ سے کہا ہے)

شعر (۷) فرماتے ہیں تم لین دین کے ایسے کون سے کھرے تھے کہ اُدھر ملک الموت نے تقاضا کیا اور ادھر تم نے اپنی جان اس کے سپرد کر دی اسے کچھ دن اور تقاضا کرنے دیتے۔

شعر (۸) فرماتے ہیں میں نے مانا کہ تمہیں مجھ سے نفرت تھی اور نیّر سے بھی لڑائی تھی مگر اس وجہ سے تمہیں جانا نہ چاہیئے تھا ابھی کچھ دن بچوں کا تماشا دیکھا ہوتا۔

(نیّر سے مراد نواب ضیاءالدین احمد خاں متخلص بہ نیّر ہیں۔ یہ لوہارو کے رئیس اور میرزا غالب کے شاگرد تھے اور عارف مرحوم کو مرزا سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے)

شعر (۹) فرماتے ہیں جہاں تم نے عمر کا اتنا حصّہ خوش و ناخوش بسر کیا تھا اے جوانمرگ کچھ دن اور دنیا میں بسر کر لیتے تو کیا ہوتا؟

شعر (۱۰) فرماتے ہیں تم لوگ نادان ہو جو یہ کہتے ہو کہ عارف کا داغ مفارقت اُٹھا کر اے غالب تم کیوں زندہ ہو حالانکہ تمہیں زندہ نہ رہنا چاہیئے مگر یہ تمہاری نادانی ہے۔ میں لذت حیات سے بہرہ ور ہونے کیلئے زندہ نہیں ہوں بلکہ میری قسمت میں کچھ دن اور موت کی تمنا کرنا ہے۔

ردیف "ز"

(۱۴۹) فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبحِ مہر   ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر ۲ ہوں گل فروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز
میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں ۳ خمیازہ کھینچے ہے بتِ بیداد فن ہنوز

شعر (۱) اس شعر میں شاعر نے جیبِ کفن کو صبح سے اور داغِ عشق کو آفتاب سے تشبیہ دی ہے فرماتے ہیں تم نے میرے مرنے پر مجھے تن آسانی کا الزام دیا ہے اور یہ سمجھ لیا ہے کہ میں غمِ عشق سے فارغ ہو گیا ہوں یہ غلط ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی مجھے فراغت نصیب نہیں ہوئی اور زخمِ جگر چاکِ کفن کی ابھی تک زینت بنا ہوا ہے۔ یعنی شغلِ عشق باقی ہے۔

شعر (۲) فرماتے ہیں جس طرح مفلس لوگ اپنی برباد شدہ دولت پر ناز کرتے ہیں اسی طرح میں ابھی تک اپنے داغہائے عشق کا ذکر کرتا ہوں جو میرے لئے بہت بڑی دولت تھے اور اب دل کے مٹ جانے سے مٹ چکے ہیں۔

شعر (۳) خمیازہ کھینچنا بمعنی انگڑائی لینا۔ فرماتے ہیں میرے جگر کے میخانے میں شرابِ خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہا لیکن وہ بتِ خونخوار ابھی تک انگڑائیاں لے رہا ہے اور میرے خون کا بدستور پیاسا معلوم ہوتا ہے۔

(۶۵) حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز ۱ دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز
نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود ۲ ہنوز تیرے تصور میں ہیں نشیب و فراز
وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں ۳ کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرواز
ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست ۴ گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالبؔ
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز ۵

شعر (۱) مرزا صاحب نے اس مطلع میں بالکل ایک نئی شوخی برتی ہے جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی۔ فرماتے ہیں کسی مشکل مقصد کے حل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا ناچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو یعنی ایسی چیز طلب کرینگے جو پہلے ہی دی جا چکی ہو۔ (یادگارِ غالب)

شعر (۲) بہرزہ یعنی بیکار۔ تیرے تصور میں نشیب و فراز ہیں یعنی تیرا تصور ناتمام اور قاصر ہے مطلب کہ وحدت وجود کا عقیدہ اختیار کرنا چاہیئے تاکہ وجود عالم اشیاء کے متعلق تمام اوہام سے نجات حاصل ہو جائے۔

نظم صاحب اس شعر کی شرح اس طرح فرماتے ہیں۔ وجود ماسوی اللہ سے مراد ہے اور نشیب و فراز کا یہی سبق ہے کہ تو وجود کیلئے مراتب سمجھے ہوئے ہے جس کا مرتبہ اعلیٰ وجوب اور مرتبہ ادنیٰ امکان ہے اور امکان میں بھی قیام بذاتہ و قیام بغیرہ جوہر و عرض واحد کیلئے وجود میں پستی و بلندی رکھتا ہے یعنی جادۂ مستقیم یہ ہے کہ ہر شے کو موجود بوجود سمجھ اور وجود کے لئے اقسام نہ نکال۔ یہ راستہ بہتر ہے۔

میرے خیال میں اس شعر کو اس طرح سمجھنا چاہیئے۔ جب تک تیرے تصور میں نشیب و فراز ہیں یعنی ماسوی اللہ کی محبت ہے اُس وقت تک ہستیٔ مطلق کی معرفت تجھے نصیب نہیں ہو سکتی ؎

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں
ایں خیال است و محال است و جنوں (مولانا روم)

شعر (۳) جلوہ تماشا یعنی جلوہ کا تماشہ دکھانے والا۔ فرماتے ہیں یہ صحیح ہے کہ وصالِ دوست طرح طرح کے جلوے دکھانیوالا ہے مگر زحمتِ انتظار برداشت کرنے کا حوصلہ کہاں سے لائیں انتظار کو آئینہ سے مشابہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ وصال کا جلوہ اسی میں نظر آتا ہے یعنی انتظار کے بعد وصال ممکن ہے۔

شعر (۴) فرماتے ہیں عاشق کی خاک کا ہر ایک ذرہ آفتاب کی پرستش کرنیوالا ہے۔ خاک ہونیکے بعد بھی جلوۂ ناز معشوق کی آرزو نہ مٹی مطلب یہ ہے کہ جس طرح خاک کا ہر ایک ذرہ آفتاب کی شعاعوں میں چمکتا اور رقص کرتا نظر آتا ہے اسی طرح خاک عاشق کے ذرے بھی آفتاب حسن یار سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔

شعر (۵) خاک انداز اس برتن کو کہتے ہیں جس میں مکان کا کوڑا کرکٹ جمع کر کے پھینکا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں اے غالب میخانہ جنوں کی وسعت کا حال نہ پوچھ۔ یہ آسمان کا پیالہ وہاں "خاک انداز" یعنی کوڑا کرکٹ پھینکنے کے برتن کی حیثیت رکھتا ہے۔

قطعہ
(۶۶) وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سرتاسرِ خاک ۱ گذرے ہے آبلہ پا ابرِ گہر بار ہنوز
یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
۲- نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیٔ رفتار ہنوز

شعر (۱) فرماتے ہیں کریموں کی کوشش کرم کی وسعت کو دیکھو کہ ابر آبلہ پائی کی حالت میں ابھی تمام زمین پر گہرباری کرتا گذرتا ہے۔ ابر کو آبلہ پا قطرات باراں کی بنا پر کہا گیا ہے اور یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ سعی کرم میں اسکے پاؤں میں آبلے پڑ گئے ہیں لیکن پھر بھی وہ اپنی شانِ کرم دکھانے میں مصروف ہے۔

شعر (۲) فرماتے ہیں ہمارے نقشِ پا (قدم) میں گرمیِ رفتار کا بخار ابھی باقی ہے جس سے تمام صحرا کاغذ آتش زدہ بن گیا ہے۔

قطعہ
(۶۷) کیونکر اس بُت سے رکھوں جان عزیز ۱ کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز
دل سے نکلا پہ نکلا دل سے ۲ ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
تاب لاتے ہی بنے گی غالب
۳- واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

شعر (۱) اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لیگا۔ اس لئے جان کو عزیز نہیں رکھتا اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بُت پر جان قربان کرنی تو عینِ ایمان ہے پھر اُس سے جان کیونکر عزیز رکھی جا سکتی ہے۔ (یادگار غالب)

شعر (۲) فرماتے ہیں تیرے تیر کا پیکان جو دل میں تھا وہ بظاہر تو میرے دل سے نکل گیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ابھی دل سے نہیں نکلا یعنی اس کا خیال ابھی بدستور موجود ہے۔

شعر (۳) اے غالب اب برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ اس میں شک نہیں کہ واقعہ تو سخت ہے یعنی واقعہ تو ایسا ہے کہ اس میں جان دیدی جائے مگر کیا کیا جائے جان بھی پیاری ہے۔

(۶۸) نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز ۱ میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تُو اور آرائشِ خمِ کاکل ۲ میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز
لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی ۳ ہم ہیں اور رازہائے سینہ گداز
ہوں گرفتارِ الفتِ صیّاد ۴ ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے ۵ ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں ۶ جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز
اے ترا غمزہ یک قلم انگیز ۷ اے ترا ظلم سر بسر انداز
تو ہُوا جلوہ گر مبارک ہو ۸ ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز
مُجھ کو پُوچھا تو کچھ غضب نہ ہُوا ۹ میں غریب اور تو غریب نواز
اسد اللّٰہ خاں تمام ہُوا
۱۰
وا دریغا وہ رند شاہد باز

شعر (۱) گلِ نغمہ سے مراد گلبانگ یعنی خوشی کی آواز۔ شکست یعنی ٹوٹنا۔ فرماتے ہیں نہ میں خوشی کی آواز ہوں اور نہ پردۂ ساز ہوں۔ میں درحقیقت اپنی شکست کی آواز ہوں جو سراپا درد ہے۔ مجھے عیش و طرب سے کوئی تعلق نہیں۔

شعر (۲) معشوق سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ تجھے تو صرف اپنے کاکول کے پیچ و خم کی آرائش کی فکر ہے اور میں طرح طرح کے اندیشیوں میں مبتلا ہوں کہ دیکھئے یہ آرائش میرے دل پر کیا ستم ڈھاتی ہے یا اس آرائش کرنے کے بعد تو کہیں بزمِ رقیب میں تو نہیں جائے گا۔ یا یہ کہ اور کتنے نئے عاشق پیدا ہونگے مفہوم یہ ہے کہ تیری آرائش کاکل میرے کمال محبت سے بدگمانی کے باعث سے ہے۔

شعر (۳) ہمارے یہ دعوی ہائے تمکیں فریبِ سادہ دلی کی وجہ سے ہیں یعنی ہم بربنائے سادہ دلی ابھی

تک یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری تمکینِ وفا ابھی تک قائم رہیگی لیکن یہ ناممکن ہے ہم کب تک ان رازوں کو جو سینہ گداز ہیں چھپا سکتے ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ سوزِ عشق نہیں چھپ سکتا ہے۔

شعر (۴) فرماتے ہیں میں تو صیاد کی اُلفت میں گرفتار ہوں ورنہ اُڑنے کے لئے طاقتِ پرواز ہنوز باقی ہے اگر نہیں اُڑتا تو الفتِ صیاد کی وجہ سے نہیں اُڑتا۔

شعر (۵) فرماتے ہیں ابھی تک تو میرے دل میں اس ستمگر کے ناز اُٹھانے کی حسرت ہے خدا وہ دن کرے کہ میں بجائے حسرت نانکے اس کے ناز اٹھاؤں۔

شعر (۶) فرماتے ہیں میرے دل میں کوئی قطرۂ خون ایسا نہیں جس نے مژگاں کو شاخِ گل نہ بنا دیا ہو شاعر نے اس شعر میں قطرۂ خون کو گل اور مژگاں کو شاخِ گل سے مشابہ کیا ہے مفہوم یہ ہے کہ دل کا تمام خون آنکھوں کے راستہ بہہ گیا ہے۔

حضرت آسی لکھنوی نے "گلباز" کو گلبازی لکھ کر اسکے معنی "خوشی" کئے ہیں۔ حضرت بیخودؔ دہلوی نے بھی "گلباز" کو گل بازی لکھ کر ایک قسم کا کھیل مراد لیا ہے۔ میرے خیال میں یہ مفہوم صحیح نہیں۔

شعر (۷) فرماتے ہیں اے معشوق تیرا غمزہ سراسر ناز ہے اور تیرا ظلم سر بسر انداز ہے۔

شعر (۸) فرماتے ہیں تو جلوہ گر ہوا اور مجھے تیرے لئے بہت سے سجدے کرنا مبارک ہوں۔ یا میرا سجدہ کرنا تجھ کو مبارک ہو۔

شعر (۹) فرماتے ہیں اگر تو نے مجھ کو پوچھا یا میرا حال پوچھا تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ اس لئے کہ یہ عین تیری شان کے مطابق تھا کیونکہ میں غریب ہوں اور تو غریب نواز ہے اور غریب نوازی کی شان کا تقاضا ہے کہ وہ غریب پر مہربانی کرے۔

شعر (۱۰) اسد اللہ خاں مر گیا۔ ہائے افسوس وہ رندِ شاہد باز یعنی عاشق کیسا اچھا انسان تھا۔

ردیف "س"

(۶۹) مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے ۱ دامِ خالی قفسِ مُرغِ گرفتار کے پاس
جگرِ تشنۂ آزار تسلّی نہ ہُوا ۲ جُوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس
مُندھ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے ۳ خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے ۴ دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس
دہنِ شیر میں جا بیٹھئے لیکن اے دل ۵ نہ کھڑے ہوجئے خوبانِ دل آزار کے پاس
دیکھ کر تجھکو چمن بسکہ نمو کرتا ہے ۶ خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

مرگیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے
۷ بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

شعر (۱) فرماتے ہیں اے ذوقِ اسیری لے اب تیری تمنا پوری ہوئی۔ مرغِ گرفتار کے پاس ایک دام خالی نظر آتا ہے چل اور اس میں گرفتار ہو جا۔ قاعدہ ہے کہ پرند جانوروں کو پکڑنے کیلئے جال کے پاس طائرانِ گرفتار کے پنجرے رکھ دیتے ہیں اور طائرانِ گرفتار کی آواز پر دوسرے ہمجنس پرندے جمع ہو جاتے ہیں جال پر دانہ بچھا ہُوا ہوتا ہے وہ اسکے کھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں صیاد جال کھینچ لیتا ہے۔

شعر (۲) فرماتے ہیں باوجودیکہ ہم نے ہر خارِ صحرا کے پاس صحرا گردی کی حالت میں لطفِ خلش حاصل کرنے کیلئے اپنے پاؤں کے تلوؤں سے خون کی ایک ندی سی بہادی لیکن ہمارا جگر جو تشنۂ آزار ہے اس کی تسلی نہ ہوئی اور وہ اور طالبِ آزار ہُوا مفہوم یہ ہے کہ عاشق مصائبِ عشق کو بخوشی گوارا کرتا ہے۔

شعر (۳) تم اپنے عاشقِ بیمار کی تیمارداری کو ایسے وقت میں آئے جبکہ اس پر نزع کی حالت طاری تھی حسرتِ دیدار نے اگرچہ اس کی آنکھیں کھول تو دیں لیکن کھولتے ہی بند ہو گئیں اس سے تو نہ آنا اچھا تھا۔

شعر (۴) فرماتے ہیں میرے غمخوار کے پاس جو مجھے نصیحت و ملامت کر کے عشق سے منع کرتا ہے اگر زبان کے بدلے ایک تیز سی چھری ہوتی جس سے میرا گلا کاٹ دیتا تو میں ملامت و فہمائش کی کُند چھری سے زخمی ہو کر سسک سسک کو جان نہ دیتا۔

شعر (۵) فرماتے ہیں اے دل شیر کے منہ میں جا بیٹھنا دل آزار معشوق کے پاس کھڑے ہونے سے بدرجہا بہتر ہے مفہوم یہ ہے کہ کسی بیوفا معشوق سے دل لگانے سے مرجانا کہیں اچھا ہے۔

شعر (۶) فرماتے ہیں تیرے جمال جہاں آرا کو دیکھ کر چمن کی قوت نمو اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ پھول خود بخود تیرے طرّہ دستار کے پاس پہنچ جاتا ہے تاکہ وہاں پہنچکر تجھے زینت دینے کا شرف حاصل کرے۔

شعر (۷) فرماتے ہیں۔ ہائے افسوس غالب وحشی اپنا سر پھوڑ کر مر گیا مگر ہم کو اب تک اس کا تیری دیوار کے پاس آکر سر پھوڑنے کی نیت سے بیٹھنا یاد ہے یعنی جب اسے تیرے دیدار کی خواہش ہوتی تھی تو وہ غریب دیوار کے پاس آکر بیٹھ جاتا تھا۔

ردیف "ش"

(۷۰) نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے ۱ لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش
فروغِ حُسن سے ہوتی ہے حلِّ مشکلِ عاشق
۲۔ نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

شعر (۱) خس جوہر سے مراد جوہر آئینہ فولادی ہے۔ نگار یعنی معشوق۔ فرماتے ہیں اگر جوہر آئینہ کو سبزۂ خط معشوق سے طراوت نہ پہنچے تو معشوق کا جمال جہاں آرا آئینہ میں آگ لگا دے۔ مفہوم یہ ہے کہ معشوق جب آئینہ دیکھتا ہے تو اُسکے چہرے کا خط سبز اپنی طراوت سے آئینہ کو اسکے حسن جہاں سوز کے اثر سے محفوظ رکھتا ہے ورنہ آئینہ میں آگ لگ جاتی۔

شعر (۲) فرماتے ہیں فروغِ حسن سے عاشق کی مشکل حل ہوتی ہے اور مثال یہ پیش کی ہے کہ اگر آگ شمع کے پاؤں سے کانٹا نہ نکالے تو وہ کبھی نہ نکلے خارِ شمع سے مراد شمع کی بتی یا ڈورا ہے جو اس کے اندر موجود ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے شمع روشن ہوتی ہے اگر شعلہ شمع کا جلوہ نہ ہو تو وہ کانٹا کبھی نہ نکلے۔

ردیف "ع"

(۶۱) جادۂ راہِ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نَو سے آغوشِ وداع

شعر (۱) فرماتے ہیں شام کے وقت جب آفتاب سفر کے لئے آمادہ ہوتا ہے تو آسمان ماہِ نو کے طلوع سے آفتاب کو رخصت کرنے کے لئے اپنی آغوش کھولتا ہے۔

شاعر نے تارِ شعاعِ شمس کو جو غروبِ آفتاب کے وقت آسمان پر نمودار ہوتا ہے آفتاب کیلئے جادۂ راہ قرار دیا ہے اور طلوعِ ماہِ نو کو آسمان کی آغوش کشادہ کہا ہے جو وہ آفتاب کو رخصت کرنے کیلئے کھولتا ہے مفہوم یہ ہے کہ شام کے وقت آفتاب سفر کی تیاری کرتا ہے اور آسمان اسے رخصت کرنے کیلئے تیار ہے۔

(۶۲) رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیٔ شمع ۱ ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیٔ شمع
زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگِ خاموشی ۲ یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع
کرے ہے صرف بایمائے شعلہ قصہ تمام ۳ بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیٔ شمع
غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ ۴ ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیٔ شمع
ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے ۵ بجلوہ ریزیٔ باد و بہ پرفشانیٔ شمع
نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پُوچھ ۶ شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیٔ شمع
جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو ۷ نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیٔ شمع

شعر (۱) رُخِ نگار بمعنی چہرۂ معشوق۔ سوزِ جاودانی سے مراد حیاتِ جاودانی ہے۔ آتشِ گل سے مراد سُرخیٔ رخسار رنگ معشوق ہے آبِ زندگانی سے مراد آبِ بقا یا آبِ حیات ہے۔ فرماتے ہیں میرے معشوق کے گل رخسار کے رشک سے شمع ہمیشہ جلتی ہے تو گویا آتشِ گل یعنی سرخیٔ رخسار معشوق شمع کے لئے آبِ بقا ہے مفہوم یہ ہے کہ اگر آتشِ رخسار معشوق روشن نہ ہوتی تو شمع کو یہ سوزِ جاودانی یعنی حیاتِ ابدی نصیب نہ ہوتی۔

شعر (۲) فرماتے ہیں اہلِ زبان کی زبان میں خاموشی کا نام موت ہے اور یہ بات محفل میں شمع کی زبانی روشن (معلوم) ہوئی مفہوم یہ ہے شمع جب بُجھ جاتی ہے تو اُسے شمع کُشتہ یا شمع مُردہ کہتے ہیں اور یہی شمع کا خاموش ہو جانا اور یہی اس کا مر جانا ہے اور اسلئے وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ خاموشی سے مراد مرگ ہے۔

شعر (۳) ایما بمعنی اشارہ، قصّہ تمام کرنا۔ زندگی تمام کرنا۔ اہلِ فنا بمعنی عارف، فرماتے ہیں شمع صرف شعلہ کے اشارہ سے اپنی زندگی ختم کر لیتی ہے اور شمع کی فسانہ خوانی اور اپنا قصّہ سنانا اہلِ فنا یعنی عارفوں کی طرح ہے۔

مولانا نظم اس شعر کی شرح اس طرح فرماتے ہیں "شمع صرف اشارے سے سارا قصّہ تمام کرتی ہے یعنی شعلہ سے لو لگا کر سر سے پاؤں تک فنا ہو جاتی ہے جس طرح صوفیان اہلِ فنا شعلہ عشق سے لو لگا کر فنا فی الذات ہو جاتے ہیں اور اپنی ہستی سے گذر جاتے ہیں۔"

شعر (۴) فرماتے ہیں اے شعلہ تیرے کانپنے سے شمع کی ناتوانی ظاہر ہوتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسرتِ پروانہ کا غم کرتی ہے اور تیرا لرزنا محض تیری ناتوانی کی وجہ سے ہے۔

شعر (۵) اہتزاز بمعنی جنبش کرنا۔ جلوہ ریزیٔ باد سے مراد ہوا کا چلنا۔ پرفشانیٔ شمع سے مراد شمع کا لرزنا فرماتے ہیں اے معشوق مجھے ہوا کے چلنے اور شمع کے لرزنے کی قسم تیرے خیال سے میری روح کو ایک جنبش سرور حاصل ہوتی ہے بجلوہ کی "ب" قسمیہ ہے۔

شعر (۶) فرماتے ہیں غمِ عشق میں جو داغ ہے اسکی بہار کی خوشی نہ پوچھ اگرچہ یہ داغ مثلِ گل شمع ہے جو اسکی بہار کو مبدّل بہ خزاں کر دیتا ہے مگر وہ گل خزانیٔ شمع ایسا ہوتا ہے کہ بہار بھی اُس پر نثار ہے کیونکہ گل خزانیٔ

شمع کی بہار اسکا انجام فنا ہے اور وہ عین بقا ہے اور گل گلشن کی بہار کا انجام خزاں ہے اور وہ فنا ہے اور گل داغ عشق کی بھی یہی صورت ہے مفہوم یہ ہے کہ غم عشق کے پژمردہ داغ بھی ایسے پر بہار ہیں کہ شگفتگی ان پر مٹی ہوئی ہے۔"

شعر (۷) فرماتے ہیں شمع کی جانب سے بدگمانی کا داغ میرے دل پر کیوں نہ ہو جب میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ مجھ کو بالین یار پر دیکھ کر جل رہی ہے گویا وہ بھی مجھے اپنا رقیب تصور کرتی ہے۔

ردیف "ف"

(۳۷) ہم بیمِ رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش ۱ مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیار حیف
جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے ۲ اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف

شعر (۱) وداع ہوش سے مراد بیہوش ہونا۔ فرماتے ہیں بزم معشوق میں اسکے جمال جہانسوز کو دیکھ کر رقیب کے ڈر سے ہم بیہوش بھی نہیں ہو سکتے اس لئے کہ ہماری بیہوشی سے وہ ہمارے راز عشق سے واقف ہو جائیگا یا معشوق سے بے تکلفی شروع کر دے گا۔ اے اختیار افسوس ہے کہ ہم اسقدر مجبور ہو گئے ہیں کہ ہمیں "بیم رقیب" اپنے ہوش و بیہوشی کا بھی اختیار نہیں رہا۔ ؎

مرے خیال میں وہ رند ہی نہیں ساقی
جو ہوشیاری و مستی میں امتیاز کرے

شعر (۲) فرماتے ہیں اے ناتمامی آہ شعلہ بار ہزار افسوس ہے تو ہم کو بتدریج جلا رہی ہے لیکن ہم اس بات کے تصور سے جل رہے ہیں کہ ہم ایک دم کیوں نہ جل گئے۔ مفہوم یہ ہے کہ جو آگ ہمارے سینہ میں جل رہی ہے اس کا تقاضا تو یہی ہے کہ ہم ایک ہی بار جل کر خاکستر ہو جائیں۔ لیکن ہماری نامرادی و ناتمامی ایک بار جل جانے سے روکتی ہے۔

ردیف "ک"

(۱) زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک ۱ کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک
گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل ۲ ورنہ ہوتا ہے جہاں کس قدر پیدا نمک
مجھ کو ارزانی رہی تجھ کو مبارک ہوجیو ۳ نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک
شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج ۴ گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک
داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ ۵ یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک
چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے ۶ دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک
غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ درد ۷ زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سر تا پا نمک

یاد ہیں غالب مجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
۸۔ زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

شعر (۱) فرماتے ہیں بے پروا لڑکے جو مجھے دیوانہ سمجھ کر پتھر مارتے ہیں میرے زخموں پر کہاں نمک چھڑکتے پھریں اگر انہیں پتھروں میں جو مجھے مارے جاتے ہیں نمک ہوتا تو کیا مزا آتا۔ تاکہ ان کے پتھر مارنے سے زخم بھی ہوتا اور نمک بھی چھڑکا جاتا۔

شعر (۲) فرماتے ہیں ہمارے دل کے زخموں کیلئے تو گردِ راہِ یار سامانِ نازش ہے ورنہ نمک تو دنیا میں بہت پیدا ہوتا ہے ہمیں ان سے کیا۔ اس شعر میں جو نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ نمک اگرچہ ابتداءً زخم کیلئے سخت تکلیف رساں ہے لیکن بعد میں زخم اس سے بھر جاتا ہے لیکن گرد (مٹی) زخم کو اور زیادہ کرتی ہے بھرتی نہیں۔

شعر (۳) اس شعر میں لف ونشر مرتب ہے۔ فرماتے ہیں مجھ کو نالۂ بلبل کا درد ارزانی رہے یعنی مبارک ہو اور تجھ کو خندۂ گل کا نمک مبارک ہو مفہوم یہ ہے کہ حق تعالٰی نے تجھے حسنِ گل کی طرح خندۂ نمکین عطا فرمایا ہے اور

اس خندۂ نمکین نے بلبل کا پر درد نالہ دیا ہے اسلئے دونوں قابل مبارکباد ہیں۔ وہ نمک تیرے لئے باعث نازش ہے اور یہ درد میرے سلئے باعث فخر ہے۔

شعر (۴) جولاں یعنی گھوڑے کا تیزی سے دوڑنا۔ فرماتے ہیں آج کنار دریا پر کس معشوق طناز نے اپنے گھوڑے کو تیزی کے ساتھ دوڑایا تھا کہ جس کی ٹاپوں سے ساحل کی گرد دریا کی موجوں کے زخموں کے لئے نمک بن گئی ہے۔

شعر (۵) فرماتے ہیں میرا معشوق جس جگہ نمک دیکھتا ہے مجھے یاد کرتا ہے اور میرے زخم جگر کی خوب داد دیتا ہے اور کہتا ہے کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اگر یہ نمک بھی اس کے زخموں پر چھڑکا جاتا۔

شعر (۶) فرماتے ہیں معشوق کا ایسے وقت میں عاشق کے زخمی جسم کو چھوڑ کر چلے جانا قابل افسوس ہے جبکہ دل زخم کا طالب ہے اور دوسرے اعضاء نمک کے خاستگار ہیں یعنی نہ دل میں زخم لگا ہے اور نہ زخموں پر نمک چھڑکا گیا ہے۔

شعر (۷) فرماتے ہیں درد زخم کے زیادہ ہونے کیلئے کسی غیر کا احسانمند نہ ہونگا۔ میرا زخم خندۂ قاتل کی طرح از سرتا پا نمک بنا ہوا ہے۔ مفہوم یہ ہے جیسے خندۂ قاتل نمکین ہے میرا زخم بھی اسی طرح خندہ اور نمکین ہے۔

شعر (۸) فرماتے ہیں اے غالب مجھے وہ دن بھی یاد ہیں جبکہ وجد شوق ایذا طلبی میں تیرے زخموں میں سے نمک کے ذرات گر پڑتے تھے تو میں ان کو پلکوں سے چنا کرتا تھا۔ اس شعر میں اس مشہور بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر نمک گرے تو اسے پلکوں سے اٹھانا چاہیئے۔

(۷۵) آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک ۱ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ ۲ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب ۳ دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن ۴ خاک ہو جائینگے ہم تم کو خبر ہونے تک
پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم ۵ میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل ۶ گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

شعر (۱) اس شعر میں لفظ "سر" خاص طور پر معنی خیز ہے۔ لغت میں اسکے معنی فکر و خیال اور زور و قوت، سردار قوم، میل و خواہش و بلندی اور ہر ایک شے کا خلاصہ اور کسی کام کا انجام پہنچنا یا فتح ہونا بیان کئے گئے ہیں اس شعر کی بھی شارحین نے مختلف شرحیں فرمائی ہیں جناب نظم صاحب فرماتے ہیں کہ "یہ محاورہ ہے کہ ہم اس بات کے سر ہوئے یعنی سر ہوگئے یعنی جب تک تیری زلف کے سر حال سے باخبر ہو میرا کام تمام ہو جائیگا"۔ جناب آسی لکھنوی نے سر ہونا کے دو معنی لکھے ہیں پہلے معنی تو وہی ہیں جو جناب نظم نے لکھے ہیں لیکن ہمارے خیال میں یہ معنی صحیح نہیں کیونکہ سر ہونا یعنی باخبر ہونا سین مکسور کے ساتھ ہے نہ کہ سین مفتوح کے ساتھ۔ لیکن حیرت ہے کہ اس لفظ کی انہیں معنوں کے ساتھ شرح کرتے ہوئے دونوں حضرات میں بعد المشرقین ہو گیا ہے ایک صاحب مشرق کو جا رہے ہیں اور ایک مغرب کو یعنی آسی صاحب فرماتے ہیں کہ "یہ ضرور ہے کہ ہماری آہ میں اثر ہوگا مگر بہت دیر میں ہوگا اور دیر میں تیری زلف پیچیدہ کے اسرار سے ہم باخبر ہونگے"۔ ہمارے خیال میں یہ معنی بھی صحیح نہیں بلکہ دوسرے معنی ہی صحیح ہیں۔ اور قاضی سعید الدین احمد صاحب نے بھی یہی معنی لکھے ہیں یعنی جب تک تیری زلف میرے قبضہ میں آئے یا تیری زلف تک میرا ہاتھ پہنچ سکے میری عمر تمام ہو جائے گی۔

میرے خیال میں اس شعر کی تشریح کیلئے عشق و محبت کا ایک تاریخی واقعہ لکھ دینا بھی نہایت ضروری ہے یعنی لیلیٰ کا قصہ۔ وہ معروف عاشق قیس عامری جسے لوگ مجنوں کے نام سے یاد کیا کرتے ہیں ایکدن موسم سرما میں آگ کا ایک الاؤ سامنے رکھے ہوئے جنگل میں بیٹھا تھا کہ اتفاقیہ لیلیٰ کا شوہر بھی ادھر آ نکلا اور مجنوں کے پاس بیٹھ گیا۔ مجنوں

نے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا کہ میں لیلیٰ کا خاوند ہوں مجنوں نے پوچھا کہ کیا تیرے ہاتھ لیلیٰ کی زلفیں تک کبھی پہنچتے ہیں؟ اس شخص نے کہا کہ ہاں پہنچتے ہیں۔ مجنوں نے یہ سنکر اور جوشِ حسرت و رقابت سے متاثر و بیتاب ہو کر فوراً دہکتے ہوئے کوئلے الاؤ میں سے اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا لئے اور جل کر کہا کہ کاش میرے ہاتھ لیلیٰ کی زلفوں تک پہنچے۔

شعر (۲) نہنگ ایک دریائی جانور ہے جسے گھڑیال بھی کہتے ہیں۔ کام کے معنی مراد و مقصود کے بھی ہیں لیکن اس جگہ تالو مراد ہے۔ مولانا حالی مرحوم یہ معنی فرماتے ہیں کہ موج میں سینکڑوں نہنگ منہ پھاڑے ہوئے ہیں دیکھیں قطرہ پر موتی بننے تک کیا کیا آفتیں گزرتی ہیں؟ مطلب جو اس شعر میں ادا کیا گیا ہے۔ وہ صرف اسی قدر ہے کہ انسان کو درجہ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

شعر (۳) اس شعر میں لفظ رنگ بھی خاص طور پر معنی خیز ہے۔ لغت میں لفظ رنگ کے ۳۲ معنی لکھے ہیں لیکن اس شعر میں صرف حیلہ و تدبیر کے معنی لئے جائینگے ایک اور شبہ کا بھی اسجگہ رفع کر دینا ضروری ہے کہ کوئی صاحب "رنگ کروں" کو "رنگ کردن" کا ترجمہ نہ سمجھ لیں کیونکہ رنگ کردن کے معنی ہیں دغا و فریب کرنا۔ عاشقی صبر طلب سے یہ مراد ہے کہ آئینِ عشق و محبت یہ ہے کہ صبر سے کام لیا جائے ورنہ جلد بازیوں سے تو کام اور بھی بگڑ جاتا ہے لیکن عاشق بیچارہ بھی کیا کرے کہ دل کی تمنائیں چین نہیں لینے دیتیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ جب تک جگر کا خون ہو، اس وقت تک کیا تدبیر و علاج کروں کہ دل ضبط میں رہے اس شعر میں لفظ رنگ اور خون میں بھی رعایت معنوی ملحوظ رکھی گئی ہے کیونکہ لفظ رنگ خون کے معنوں میں بھی آتا ہے۔

شعر (۴) یہ شعر نہایت صاف ہے اس میں کوئی پیچیدہ گتھی نہیں کہ سلجھائی جائے تغافل بمعنی غفلت خاک ہو جائیں گے یعنی ہمیں موت آجائیگی۔ یہ شعر بھی ایک طرح سے قریب قریب شعر اول کا ہم معنی ہے یعنی جب تک تمہیں ہمارے حال کی خبر ہو ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ حضرت خواجہ میر دردؔ نے بھی اسی مضمون کو اس سے پہلے دوسرے لفظوں میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

کی تو تھی تاثیرِ آہِ آتشیں نے اس پہ بھی
جب تلک پہنچے ہی پہنچے راکھ کا یاں ڈھیر تھا

شعر (۵) پرتو بمعنی سایہ، عکس، روشنی۔ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح شعاعِ آفتاب یعنی دھوپ شبنم (اوس) کو فنا کر دیتی ہے اسی طرح اگر آپ مجھ پر نظرِ عنایت کرتے تو میں بھی فنا ہو جاتا۔ چونکہ مرزا غالب وحدت الوجودی مشرب رکھتے تھے اسلئے اسکے صوفیانہ معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اس عنایت سے دراصل میری فنا بھی عین بقا تھی۔ شیخ علی حزیں کا بھی ایک شعر اسی رنگ کا ہے ؎

گراں جاں تر ز شبنم نیست جسمِ ناتوانِ من
اگر میبود با من روئے گرمی آفتابش را

شعر (۶) جناب آسی نے اس شعر میں لفظ شرر کے معنی شعلہ لکھے ہیں جو ہماری دانست میں صحیح نہیں شعر کا مطلب ہے کہ اے نادان زمانۂ حیات بہت قلیل ہے گرمیٔ محفل بس اسی قدر ہے کہ جتنا عرصہ ایک چنگاری کو اڑ کر اسکے بجھنے میں لگتا ہے ذوق مرحوم نے بھی ایک شعر اسی مضمون کا لکھا ہے ؎

کیا اعتبار ہستیٔ ناپائدار کا ؟
چشمک تھی برق کی کہ تبسم شرار کا !

شعر (۷) اس شعر میں لفظ شمع سے انسان کی سراپا سوز یعنی حسرت و غم میں جلنے والی زندگی مراد ہے اور جب تک موت نہ آجائے انسان اس سے مخلصی نہیں پا سکتا جس طرح جب تک صبح نہیں ہوتی شمع جلتی رہتی ہے آغا جان عیش نے بھی خوب کہا ہے ؎

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات
ہنسکر گذار یا اسے رو کر گذار دے

حضرت ذوق نے اس سے بھی بہتر الفاظ میں فرمایا ہے ؎

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

ردیف "گ"

(۷۶) گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دُعا نہ مانگ ۱ یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
۲۔ مجھ سے مرے گُنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

شعر (۱) اجابت بمعنی قبولیت۔ شعر کا مطلب ہے کہ اگر تجھ کو اپنی دعا کی قبولیت کا یقین ہے تو تو کوئی دعا نہ مانگ سوائے اس دُعا کے کہ تجھ کو دل بے مدعا ملے یعنی وہ دل کہ جسکی کوئی خواہش یا آرزو ہی نہ ہو۔

شعر (۲) اس شعر کے ذریعہ مرزا غالب جنابِ باری میں التجا کرتے ہیں کہ الٰہی مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ طلب کر۔ در پردہ مقصد یہ ہے کہ گناہوں کا حساب کیونکر دوں کیونکہ وہ شمار میں اس قدر ہیں کہ جب اُن کو گنتا ہوں تو وہ داغ جو تُو نے دنیا میں دیئے ہیں انکی تعداد اتنی ہے کہ جس کثرت سے میرے گناہ ہیں انکی گنتی یاد نہیں آتی۔ گناہ اور داغوں کی مساوات سے یہ مراد ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہُوا تو بہ سبب عدم استطاعت کے اس کو خاطر خواہ نہ کرسکا۔ کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی۔ مثلاً شراب پی تو وصل نصیب نہ ہُوا اور وصل میسر آیا تو شراب نہ ملی۔ پس جتنے گناہ کئے ہیں اتنے ہی داغ حسرت دل پر کھائے ہیں (یادگارِ غالب)

اسی مضمون کو مرزا غالب نے ایک اور شعر میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

"ردیف ل"

(۱۷۷) ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل ۱ بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
آزادئ نسیم مبارک کہ ہر طرف ۲ ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل
جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا ۳ اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل
خوشحال اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو ۴ رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بپائے گل
ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لئے بہار ۵ میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے ۶ مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل
سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی ۷ خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل
تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آجتک ۸ بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

غالبؔ مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل

شعر (۱) یعنی بلبل وفائے گل کی امید پر ایسی فریب خوردہ (مٹی ہوئی) اور ثبات رنگ پر یقین کیے بیٹھی ہے کہ اس کی اس توہم پرستی پر پھول خندہ زنی کر رہے ہیں گویا پھولوں کا کھلنا ہم معنی خندہ ہے بلبل کی اس خلل دماغی کا مرزا غالبؔ اس سے پہلے بھی ایک شعر میں خاکہ اڑا چکے ہیں ؎

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

شعر (۲) اس شعر میں نسیم سے مراد دراصل شمیم گل ہے اور ہوائے گل سے مراد شوق و اشتیاق گل ہے اور حلقۂ دام کے ٹوٹنے سے غنچوں کا شگفتہ ہونا مراد ہے مطلب یہ ہے کہ وہ نسیم خوشبو کہ جو غنچوں کے شگفتہ

ہونے سے نکلی ہے اسے آنا دانہ پھر نامبارک ہو کیونکہ وہ ایک طرح کی قید سے رہا ہوئی ہے اس شعر میں لفظ نسیم اور لفظ ہوا کی معنوی رعایت کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔

شعر (۳) اس شعر میں مرگیا سے مراد انتہائے عشق و محبت ہے لیکن قلفی سعید احمد صاحب فرماتے ہیں کہ چمن میں جس کو کوئی پھول تھا وہ موج رنگ کے دھوکے میں مرگیا یعنی اس دھوکہ میں کہ اسنے اس رنگ کو مستقل و پائدار سمجھا افسوس ہے کہ اب پھول دھوکے میں آنے پر خونیں نوا یعنی بڑی دلسوز اور غمناک آواز میں نالہ کر رہے ہیں اور ان کی یہ حالت قابل افسوس ہے ہمارے خیال میں یہ تو ایک قسم کی دور از فہم معنوی کھینچا تانی ہے مولانا آسی نے کسی قدر قریب الفہم معنی لکھے ہیں یعنی لوگ پھول کے نالۂ خونیں نوا کو رنگ کر فریفتہ ہو رہے ہیں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ہائے پھول کا گریہ خونیں کس قدر بے اثر ہے حیرت ہے کہ آسی صاحب نے گریہ خونیں کہاں سے پیدا کر دیا غنچوں کے چٹخنے کو تو ہم نالۂ خونیں سے تعبیر کر سکتے ہیں اور یہ خونیں نوائی بھی نالۂ خاموش کے ہم معنی سمجھی جائیگی۔

شعر (۴) سایۂ گل سے عاشق مستانہ اور گل سے مراد معشوق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ حریف سیہ مست بھی نہایت ہی خوش نصیب و ”دیوانہ بکار خویش ہشیار ہے“ کی حالت رکھتا ہے جو اپنی سیہ مستی میں بھی اپنا سر محبوب کے قدموں پر رکھے ہوئے بیہوش پڑا ہے۔

مرزا داغ نے بھی اپنی زبان میں قریب قریب یہی مضمون لکھا ہے ؎

غش کھا کے داغ یار کے قدموں پہ گر پڑا
بیہوش نے بھی کام کیا ہشیار کا

شعر (۵) نفس عطر سائے گل سے مراد خوشبو ہے مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ بہار پھولوں کو اس لئے شگفتہ کرتی اور ان میں اسلئے خوشبو پیدا کرتی ہے کہ تیرا دماغ اس سے معطر ہو اور تو گلگشت چمن کرے اور وہ پھول تیرے گلے کا ہار بنیں۔ یا تیرے لئے پھولوں کی سیج تیار کی جائے۔ گویا ایسی حالت میں پھول میرے رقیب ٹھہرے کیونکہ تیرے دل میں ان کا شوق اور محبت ہوگی۔

شعر (۶) جناب طباطبائی اور قاضی سعید الدین صاحب نے ایک جیسے معنی لکھے ہیں یعنی فرماتے ہیں کہ لوگ مجھے پر باغ کی سیر کرنے اور شراب پینے پر اعتراض کرتے ہیں تو میں ان دونوں چیزوں کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں کیونکہ اگر زمانہ بہار میں میرا شیشہ شراب سے اور دل ہوائے گل سے خالی ہوتا ہے تو مجھ کو بہار سے شرمندگی ہوتی ہے"

ہمارے خیال میں یہ ایک فضول کھینچا تانی ہے مولانا آسی نے جو نہایت مختصر مطلب ظاہر کیا ہے وہ بہت صحیح اور قریب الفہم ہے بلکہ درد اور حسرت و سوز میں ڈوبا ہوا ہے جسے ہم اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ موسم بہار میں جب میرا شیشہ بوجہ بے مائگی اور ناداری شراب سے اور دل تمنائے سیر گل سے خالی ہوتا ہے تو مجھے بہار سے شرمسار ہونا پڑتا ہے۔

شعر (۷) سطوت بمعنی دبدبہ رعب۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ تو ایک غیور حسین ہے اور تو نہیں چاہتا کہ تیرا عاشق تیرے گل عارض کے سوا کسی اور گل کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر دیکھے اسلئے تیرے حسن کے دبدبہ و رعب سے میں ایسا مرعوب ہوں کہ پھولوں کی رنگینی میری نگاہوں میں برنگ خون نظر آتی ہے اور میں انہیں ایک خون آلودہ شے سمجھ کر نفرت سے دیکھتا ہوں۔

شعر (۸) قفا بمعنی گدی اور مجازاً پیچھے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو ایک پھول کے بعد دوسرا پھول کھلتا چلا جا رہا ہے گویا ایک پھول کے پیچھے دوسرا پھول پے در پے دوڑا چلا آتا ہے کہ شاید صحن چمن میں تو جلوہ افروز ہے۔ فارسی میں ایک شعر اسی مضمون کا ہے ؎

تا گل برنگ بوئے کہ ماند کہ در چمن!
گل در پس گل آمدہ در جستجوئے گل!

شعر (۹) ہم آغوشی آرزو میں اضافت منقلب ہے یعنی آرزوئے ہم آغوشی، یعنی میں اس محبوب سے ہم آغوش ہونے کی خواہش رکھتا ہوں کہ جس کے خیال کو پھول نے بصورت گل اپنے جیب قبا کی زینت بنا رکھا ہے۔

ردیف "میم"

(۱۸۶) غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس ۱ برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم
محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال ۲ ہیں ورق گردانیِ نیرنگ یک بتخانہ ہم
باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں ۳ ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم
ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو ۴ ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمّتِ مردانہ ہم
دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
۵- جانتے ہیں اس دل پرخوں کو زنداں خانہ ہم

شعر (۱) قاضی صاحب اس شعر کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ ہم آزادوں کو دم بھر سے زیادہ غم نہیں ہوتا چنانچہ ہم اپنے ماتم خانہ کی شمع کو برق سے جو ایک لمحہ میں غائب ہو جاتی ہے روشن کرتے ہیں کیونکہ اس میں زیادہ روشنی کی ضرورت ہی نہیں یعنی بالفاظ دیگر آزادوں کو غم نہایت ہی عارضی اور فوری ہوتا ہے اور ان کے ماتم خانہ کی روشنی بجلی ہے کہ جس کی چمک بھی دم بھر سے زیادہ نہیں“

ہماری رائے میں اس شعر میں یک نفس سے مراد ایک آہِ آتشیں ہے جسے برقِ تپاں سے تعبیر کر سکتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اگر ہمیں کوئی صدمہ پہنچتا بھی ہے یا ہماری آرزوؤں کا خون ہوتا ہے اور دنیا ہماری نگاہوں میں اندھیر ہو جاتی ہے تو ہم آہِ آتشیں کی بجلی سے اسے روشن کر لیتے ہیں یعنی صرف ایک آہ کر کے پھر تمام مصائب و غم بھول جاتے ہیں

شعر (۲) گنجفہ شطرنج وغیرہ کی طرح از قسم بازی ایک کھیل کا نام ہے مطلب شعر کا یہ ہے کہ ہمارا خیال گزشتہ صحبتوں اور محفلوں کی یاد ہمیں دلاتا رہتا ہے یعنی ایک خیال کے بعد دوسرا خیال پیدا ہونا محفلوں کو درہم برہم کرنا ہے بتخانہ سے مراد اس جگہ تصویر گنجفہ ہے یعنی ہم پرانی محفلوں کی تصاویر کے ورق الٹ پلٹ کرنے والے ہیں

شعر (۳) مطلب یہ ہے کہ باوجودیکہ ہم تمناؤں اور آرزوؤں کا ایک جہان اپنے دل میں آباد کئے ہوئے ہیں

لیکن پھر بھی اس میں کسی قسم کی گرم بازاری اور شور و شغب کی رونق نہیں اور ہماری تمنائیں ان چراغوں کی مثال ہیں جو پروانے کے دل میں جلتے ہیں۔

ہمارے خیال میں ہنگامہ پیدائی کی جگہ اس شعر میں لفظ ہنگامہ پیرائی ہوگا۔ واللہ اعلم،

شعر (۴) مطلب یہ ہے کہ اولو العزم لوگوں کے لئے قناعت ایک قسم کا سہارا ہوا کرتی ہے لیکن ہم نے جو یہ ترک جستجو کی ہے تو ازروئے قناعت یعنی تھوڑی چیز پر راضی ہو جانے کے خیال سے نہیں بلکہ ہماری پست ہمتی اور کمزوری کی وجہ سے ہے اسلئے ہماری یہ کم ہمتی جسے لوگ قناعت سمجھے بیٹھے ہیں ہمت مردانہ کی تکیہ گاہ نہیں ہو سکتی بلکہ برعکس اس کے ایک قسم کا وبال ہے۔

شعر (۵) دائم الحبس۔ ہمیشہ کی قید یا عمر قید۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے سینہ پر خوں کی لاکھوں آرزوئیں جو کبھی بر نہیں آئیں یعنی کبھی ہمیں ارمانوں اور حسرتوں کو نکالنے کا موقع نہیں ملا اور وہ ایک دم سے ہمیشہ کیلئے قید ہو چکی ہیں اس لئے ہم اپنے سینہ کو قید خانہ ہی سمجھتے ہیں۔

(۷۹) بہ نالہ حاصلِ دلبستگی فراہم کر
متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

شعر (۱) فراہم۔ جمع۔ متاع۔ اثاثہ البیت۔ مال و دولت۔ صدا۔ آواز۔ مطلب یہ ہے کہ تعلقات دنیوی جسے متاع خانۂ زنجیر سے تعبیر کیا گیا ہے اس میں سوائے چیخ پکار، شور و شیون اور نالہ و فریاد کے اور کیا ہوتا ہے شاعر کہتا ہے کہ اگر تو جمعیت خاطر یا دل بہلاؤ کا سامان چاہتا ہے تو بس حاصل دلبستگی یہی ہے کہ تو نالہ و فریاد کیا کر۔

(۸۰) مجھکو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجو میرے دعوائے وارستگی کی شرم

شعر (۱) دیار غیر یعنی پردیس۔ مطلب یہ ہے کہ غریب الوطنی یعنی پردیس میں ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے لیکن اس پر بھی خدا کا شکر اسلئے ادا کیا گیا ہے کہ اگر وہاں بے گور وکفن پڑے رہے تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ کون تھا اور کس مرتبے کا آدمی تھا لیکن وطن میں مرنا جہاں ایک زمانہ واقف حال ہو لیکن خریدار اور غمخوار کوئی نہ ہو وہاں مُردے کی اس طرح مٹی خراب ہوتی سخت رسوائی اور ذلت کی بات ہوتی پس خدا کا شکر ہے کہ اُس نے پردیس میں مار کر میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔ اس میں گو بظاہر خدا کا شکر ہے۔ مگر فی الحقیقت سراسر اہل وطن کی شکایت ہے جس کو عجیب پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔ (یادگار غالب)

مولانا ناطق نے بھی اسی خیال کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

روٗنے والے نہ تھے غربت کی اجل پر نہ سہی
ہنسنے والا تو وہاں کوئی دلِ زار نہ تھا

شعر (۲) وارستگی۔ آزادی۔ کمین۔ گھات۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کی زلف کے حلقے یا حلقہ ہائے زنجیر تعلقات دنیوی مجھے اسیر کرنے کی گھات میں ہیں اور میں نے اپنے آپ کو آزاد مشہور کر رکھا ہے پس یا الٰہی مجھے ان تعلقات یا زلف محبوب کی گرفتاری سے بچا لینا ورنہ میرا دعویٰ آزادی غلط ہو جائیگا

”ردیف ن“

(۸۱) یُوں دام بختِ خفتہ سے یک خواب خوش ولے
غالبؔ یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

شعر (۱) لفظ دام کے بہت سے معنی ہیں لیکن اس جگہ قیمت یعنی ایک قسم کے سکہ سے مراد ہے مطلب یہ ہے کہ میرے نصیب تو [illegible] ہیں اور میں خود بیخواب یعنی جاگ رہا ہوں دل تو یہ چاہتا ہے کہ بخت خفتہ کے دام سے ایک میٹھی نیند [illegible] تب [illegible] کروں لیکن مشکل یہ ہے کہ میٹھی نیندیں میری قسمت ہی میں نہیں اب بتا دلہ ہو تو کیونکر ہو ؟

(۸۴) وہ فراق اور وہ وصال کہاں ۱ وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں؟
فرصتِ کار ہائے شوق کسے ۲ ذوقِ نظارۂ جمال کہاں؟
دل تو دل وہ دماغ ہی نہ رہا ۳ شورِ سودائے خط و خال کہاں؟
تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے ۴ اب وہ رعنائی خیال کہاں؟
ایسا آساں نہیں لہو رونا ۵ دل میں طاقت جگر میں حال کہاں؟
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق ۶ واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں؟
فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں ۷ میں کہاں اور یہ وبال کہاں؟

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
۸
وہ عناصر میں اعتدال کہاں؟

شعر (۱) یہ تمام غزل ایک ہی رنگ، ایک ہی مضمون اور ایک ہی خیال کی ہے۔ مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ نہ تو اب صدمہ ہائے فراق کا خوف ہے اور نہ ہی وصال کی لذتوں سے بہرہ اندوز ہونے کا خیال ہے نہ وہ جوانی کی راتیں نہ مرادوں کے دن نہ وہ بہار کے مہینے نہ وہ نئے سال کی مسرتیں۔

شعر (۲) اب، وہ وقت ہی نہیں رہا کہ شوق و اشتیاق سے کوئی خاص اہتمام محبت کیا جائے کیونکہ دیدارِ حسیناں کا اب دل میں ذوق و جذبہ ہی نہیں رہا۔

شعر (۳) دل تو خیر ایک طرف رہا وہ تو مردہ ہو ہی چکا تھا لیکن اب وہ پہلا سا دماغ بھی نہیں رہا جس میں حسن و عشق کے خیالات کی جلوہ سامانیاں تھیں۔

شعر (۴) رعنائی، خوبصورتی۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے خیالات میں جو طرح طرح کی خوبصورتی تھی وہ اب نہیں رہی کیونکہ وہ ایک حسین ہی کے تصوّر و خیال کی ممنونِ احسان تھیں۔ سبحان اللہ "رعنائی خیال" کا ٹکڑا شعر کی جان ہے۔

شعر (۵) مطلب ہے کہ جیسا پہلے دیدۂ خونبار کو اشک خونیں بہانا آسان تھا اب جبکہ دل و جگر میں وہ طاقت افعال ہی نہیں رہی اور خون ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ دیدۂ خونچکاں بھی اب اجا بیتے نظر آتے ہیں تو لہو کون روئے؟

شعر (۶) قمار خانہ۔ جہاں جُوا کھیلا جائے۔ مطلب ہے کہ قمار خانۂ عشق میں تو نقد دل کی بازی لگتی ہے۔ دولت حواس کی شرط لگائی جاتی ہے لیکن یہاں تو اب وہ دل ہی رہا نہ دماغ ہی رہا اب ہم قمار خانۂ عشق میں جائیں تو کس بل بوتے پر جائیں؟

شعر (۷) مطلب ہے کہ میں تو اب افکار دنیوی میں سرگرداں رہتا ہوں اور دن رات تفکرات روزگار میں مغز مارتا رہتا ہوں بھلا عشق و محبت کا وبال اب کون سر مول لے؟

شعر (۸) عناصر۔ آب و آتش و خاک و باد۔ پرانے حکما کا یہ ایک مسلمہ نظریہ ہے کہ انسان انہیں اربعہ عناصر کے مجموعہ کا نام ہے گو جدید سائنس نے اس نظریہ کی تغلیط کردی ہے کہ عناصر صرف چار تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ انکی تعداد سینکڑوں تک پہنچ چکی ہے لیکن مرزا غالب کے زمانہ میں چونکہ یہ نظریہ مسلمات میں داخل تھا اس لئے مرزا صاحب نے صحیح فرمایا ہے کہ جب عناصر میں اعتدال ہی نہیں رہا تو لازمی ہے کہ میرے قویٰ میں اضمحلال و ضعف اور ناتوانی پیدا ہو جائے کیونکہ از روئے اصول طب یونانی عناصر میں اعتدال نہ رہے تو انسان کی صحت میں فرق آجاتا ہے۔

(۸۳) کی وفا ہم سے تو غیر اسکو جفا کہتے ہیں ۱ ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے ۲ کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو ۳ جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں
دل میں آجائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے ۴ اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں
ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود ۵ قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں
پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے ۶ خار رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں
اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائیگا کیا ۷ آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

دیکھئے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ ۸ اُس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
۹ مر گیا غالبؔ آشفتہ نوا کہتے ہیں

شعر (۱) اس شعر کی شرح نہ تو جناب طباطبائی صاحب نے کی ہے اور نہ ہی قاضی سعید الدین صاحب نے۔ صرف اتنا کہہ کر کہ "کی" کا فاعل معشوق ہے یعنی معشوق نے "باقی مطلب صاف ہے" آگے چل دیتے ہیں البتہ جناب آسی صاحب نے کچھ تشریح کی ہے یعنی آپ فرماتے ہیں کہ ہم سے معشوق نے وفا کی تو دشمن اسکو جفا کہتے ہیں اور معشوق کو ظالم کا خطاب دیتے ہیں مگر یہ کوئی نئی بات نہیں ہے یہی دنیا کا قاعدہ ہے کہ اچھوں کو برا کہا ہی کرتے ہیں اس میں معشوق کو اچھا کہہ کر اپنے ساتھ وفا کرنے پر تعریض لائی ہے، ہم اس خلوط وجدانی والے ٹکڑے کی شرح کو تو بہ نظرِ استحسان دیکھتے ہیں لیکن پہلے حصہ کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے کیونکہ اس میں اس شعر کی کوئی خاص خوبی نہیں ظاہر کی گئی۔ ہماری رائے میں اس شعر کا مطلب اس طرح ظاہر کرنا چاہیئے کہ چونکہ معشوق ہم سے وفا کر رہا ہے اور رقیبوں کو اس کا یہ فعل بہت برا معلوم ہوتا ہے بھلا انہیں کیونکر گوارا ہو سکتا ہے کہ معشوق ہم سے مراسم محبت قائم رکھے اور اس جلاپے کی بنا پر وہ اسے بدنام، رسوا اور اس کی تشہیر کر رہے ہیں اور بظاہر کسی کو اسلئے بدنام کیا جاتا ہے کہ اسکے افعال کو ظلم و جفا سے تعبیر کیا جائے لیکن درحقیقت معشوق کا یہ فعل اچھا ہے اور دنیا والوں کا یہ دستور ہے کہ وہ اچھوں کو برا کہا کرتے ہیں۔

شعر (۲) خاطر بمعنی دل۔ مطلب یہ ہے کہ آج ہم اس خیال سے انکے پاس جا رہے ہیں کہ اپنے دل کی پریشانی کا حال کہیں گے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کھٹکا لگا ہوا ہے کہ نہیں معلوم انکے سامنے جا کر انکے رعب حسن سے ہماری کیا حالت ہو اور جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہاں کہہ بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ یا جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں اسے سنکر وہ کس طرح پیش آتے اور کیا کہتے ہیں۔ کسی شاعر کا مشہور مصرعہ ہے کہ ع خدا جانے وہ کیا پوچھیں ہمارے منہ سے کیا نکلے!

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ فرماتے ہیں ؎

اس سے میں شکوہ کی جا شکر ستم کر آیا کیا کروں دل میں جو نہ تھا وہی زباں پر آیا

شعر (۳) جناب طباطبائی صاحب نے اس شعر پر ایک چھچلتی نظر ڈالتے ہوئے نہایت ہی مختصر اور مبہم سی شرح فرمائی۔ جناب قاضی صاحب نے کچھ اس سے زیادہ۔ جناب آسی صاحب نے کسی قدر وضاحت سے کام لیا ہے۔ لیکن پھر بھی غیر تسلی بخش اور شعر کا اصل مفہوم ابھی تک پردۂ اخفا ہی میں ہے۔ آسی صاحب فرماتے ہیں کہ "مے و نغمہ کو پرانے آدمی کہتے ہیں کہ اندوہ ربا اور غم غلط ہے اور آج کل کے زمانہ میں یہ صفت باقی نہیں رہی ہے کہ اندوہ غم اس سے کم ہو جائے سو ان لوگوں سے اس بنا پر جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں ہے شراب و نغمہ میں پہلے یہ خاصیت ہوگی جیسا کہ لوگ کہتے ہیں اگرچہ آج نہیں ہے۔"

ہمارے خیال میں مرزا غالب نے یہ شعر لکھ کر شراب و راگ کی نسبت جو قدیم مسلمہ نظریہ چلا آتا تھا اس کی تغلیط کرتے ہوئے مے و نغمہ کے افعال و خواص پر ایک نہایت ہی گہری اور فلسفیانہ نظر ڈالی ہے یعنی مرزا غالب کا مطلب ہے کہ مے و نغمہ دنیوی غم و اندوہ کو رفع کر سکے تو کر سکے لیکن عشق و محبت کیلئے یہ اندوہ ربا اور غم غلط کرنے والے نہیں ہو سکتے کیونکہ شراب کا یہ خاصہ ہے کہ عشق و محبت کی حالت میں اگر اسے استعمال کیا جائے تو بجائے اس کے کہ غم جدائی جاتا رہے بلکہ محبت کی آگ اور تیز ہوتی ہے اور معشوق کا خیال اور زیادہ بڑھ جاتا ہے اسی طرح اگر کوئی خوش آواز موسیقی دان کسی عاشق مزاج کے سامنے درد محبت میں ڈوبی ہوئی غزل سوز و ترنم کیساتھ گائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عاشق کا درد محبت اور غم عشق اور زیادہ ہوگا۔ ہم نے خود متعدد دفعہ اس حقیقت کا مشاہدہ کیا ہے کہ ایک شخص گا رہا ہے اور دوسرا عاشق مزاج ہجراں نصیب زار زار رو رہا ہے۔ دیکھئے یہ شعر بھی اسی فلسفہ کی تائید کر رہا ہے ؎

محبت میں کوئی ڈوبی ہوئی جب وہ غزل گائیں
تو میرا درد دل ظاہر برنگ اشک حسرت ہو

ایک اور شعر بھی اس کی تائید میں سن لو ؎

بتا دے اے پری زہرہ جبیں شیریں گلو دلبر   جو دل میں چھید کر ڈالے یہ گانا کس سے سیکھا ہے

شعر (۴) اس شعر کی تشریح جناب آسی نے نہایت اچھی اور طباطبائی صاحب نے مختصر مگر بلحاظ مفہوم جامع کی ہے مطلب یہ ہے کہ شاعر نے صرف نالۂ رسا کا نام سنا ہے لیکن اسے رسا ہوتے کبھی دیکھا نہیں ہے اور وہ بطور استفہام پوچھتا ہے کہ نالۂ رسا اور کیا ہوتا ہے؟ یہی نا کہ عشق سے فاقہ ہوا اور نالۂ دل میں آموجود ہوا اس صورت میں گویا ہمیں معلوم ہی نہیں کہ نالۂ رسا اسکو کہتے ہیں کہ جسکی رسائی اثر تک ہو اپنی ناکامی اور حرماں نصیبی کا تجربہ بتا کر رکھدیا گیا ہے۔

شعر (۵) قبلہ جس کی طرف بحالت نماز مسلمان سجدہ کرتے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم قبلہ کو سجدہ نہیں کرتے بلکہ قبلہ کو صرف قبلہ نما تصور کرتے ہیں کیونکہ اس میں یکسوئی اور یکجہتی کا تعین ہے ورنہ ہمارا مسجود و معبود تو وہ ہے کہ جو ادراک یعنی عقل و ہوش فہم و فراست کی حد سے بہت دور اور سمت و جہات سے منزہ و مبرا ہے ع

بسوئے کعبہ سجدہ ہے مگر مسجود تو ہی ہے

شعر (۶) مہر گیا - مہر گیاہ - عربی میں یبروج الصنم اور ہندی میں لکھمنا لکھمنی اور لچھمنا لچھمنی بھی کہتے ہیں کتب طبیہ میں اسے بیخ لفاح بوری کہتے ہیں کہ جو شکل میں مثل دو انسانوں کے ہوتی ہے کہ جنکے منہ ایک دوسرے کے سامنے ہوتے ہیں روایت مشہور ہے کہ جو شخص اس جڑ کو اپنے پاس رکھتا ہے لوگ اسپر مہربان ہوتے ہیں بعض لوگ سورج مکھی کو بھی مہر گیا کہتے ہیں۔ افگار بمعنی زخمی،

شعر کا مطلب یہ ہے کہ تجھ کو ہمارے زخمی پاؤں پر کہ جس میں تیری راہ کے کانٹے چبھے ہوئے ہیں جس دن سے رحم آیا ہے ان کانٹوں کو ہم کانٹے نہیں بلکہ مہر گیا سمجھتے ہیں کیونکہ انکی وجہ سے تجھے ہم پر رحم آیا۔ اس شعر میں لفظ رحم اور لفظ مہر کی معنوی مناسبت بھی ہے۔

شعر (۷) ہوا بمعنی سانس اور شرر سے مراد روح حیوانی ہے جو بمنزلہ ایک شرارے کے ہے اسکی سوزش و حرارت سے ہم کیوں گھبرائینگے بلکہ ہم تو اسی آگ کو بھڑکانے اور سلگانے کیلئے ہوا کھاتے ہیں یعنی ہمارا سانس لینا محض اشتعال حرارت کے خیال سے ہے اسکے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہمارے دل میں آتش عشق کا شرر ایک شرارہ ہے اس سے ہم کیا خوف کھائیں گے اس لئے تو ہم اسے ہوا یعنی ہیچ کہتے ہیں کیونکہ یہ ہمارے حوصلے

اور ظرف کے مقابلے میں بہت کم ہے ہمیں تو آگ مطلوب ہے جناب طباطبائی صاحب نے بھی اس پر خوب روشنی ڈالی ہے یعنی اس مضمون کو مصنف نے تو ایک قضیہ شعریہ کی طرح نظم کر دیا لیکن دوران خون کا مسئلہ جب سے ثابت ہوا ہے اس سے ظاہر ہو گیا کہ واقع میں ایسا ہی ہے کہ ہر سانس میں ہوا سے دمِ حیوانی کو اشتعال مطلوب ہے اور جو ہوا کہ نکلتی ہے یہ بعینہ ویسی ہی ہے جیسی ہوا کہ چراغ کی لَو سے پیدا ہوتی ہے اس شعر سے مصنف کے فلسفیانہ مذاق کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اسی خیال کو مرزا غالب نے ایک اور پیرایہ میں بیان کیا ہے ؎

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

شعر (۸) نخوت، غرور و تکبر۔ مطلب یہ ہے کہ ہم جو اسکی ہر ایک غلط یا صحیح بات پر آمنّا و صدقنا کہنے کے خوگر ہو گئے ہیں اور اسکے ہر ایک ناز و نخرے کی بلائیں لینے لگ جاتے ہیں اور اسکی بیجا حرکتوں پر بھی واہ وا اور سبحان اللہ کہہ سکتے ہیں اب دیکھئے اس سے متاثر ہو کر اس کا غرور و تکبر کیا رنگ لاتا ہے یعنی اس کا کیا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔

شعر (۹) وحشت سے مراد غلام علی خاں وحشت اور شیفتہ سے نواب مصطفٰے خاں شیفتہ مراد ہیں دونوں حضرات حکیم مومن خاں مومن کے مشہور تلامذہ میں سے تھے البتہ جناب شیفتہ حکیم مومن خاں کے بعد فارسی میں مرزا غالب سے بھی اصلاح لیا کرتے تھے مرزا صاحب نے نہایت ہی حسرت بھرے لہجہ میں اپنی بیکسی کی موت کا رونا رویا ہے سچ پوچھئے تو اپنا مرثیہ خود ہی لکھ گئے ہیں مطلب یہ ہے کہ یارانِ محفل اور نکتہ شناسانِ سخن تو سب اُٹھ گئے شاید اب غالب کا مرثیہ وحشت و شیفتہ ہی لکھیں تو لکھیں۔

(۸۴) آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن میں نہیں ۱ ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں
ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں ۲ رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں
ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب ۳ ذرّے اُسکے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے ۴ پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں
رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے ۵ انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں
زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن ۶ غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں
بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے ۷ جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے دامن میں نہیں
قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا ۸ خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں
لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری ۹ موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں
ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود ۱۰ قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
۱۱۔ بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

شعر (۱) اس شعر میں لفظ آبرو اور لفظ خاک نے آب و خاک کی مناسبت اور لفظ ننگ اور لفظ پیراہن نے ایک خاص رعایت معنوی پیدا کردی ہے اس شعر کی جناب آسی اور جناب قاضی صاحب نے اور جناب طباطبائی صاحب نے محض عامیانہ اور مبہم سی شرح کی اور اصل بات کو کھول کر بیان نہیں کیا خیر اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ جو پھول باغ میں نہ کھلے اس کی کیا قدر و منزلت ہو سکتی ہے یعنی وہ پھول جو جنگل میں کھل کر مرجھا جائیں اور خاک میں ملجائیں تو ان پھولوں کا ہونا نہ ہونا برابر ہے وہ پھول نہ تو کسی کے گلے کا ہار بنے نہ کسی نے گلدستہ بنا کر محفل میں رکھا نہ وہ کسی کی دستار کا طرہ بنے اور نہ ہی زیب بستر ہوئے اسی طرح وہ گریبان لباس کے لئے باعث شرم ہے کہ جو دامن میں نہ ہو اور گریبان دامن میں جبھی پہنچتا ہے جب وہ چاک ہو جائے اور چاک ہو تو گل سے مشابہت ہو جائیگی۔

شعر (۲) گریہ۔ رونا اس شعر میں مرزا غالب نے گریہ کو مخاطب کیا ہے یہ بھی ایک قسم کی جدت ہے مطلب یہ ہے کہ گریہ شاید یہ خیال کرتا ہو کہ عاشق خون کے آنسو کیوں نہیں روتا تو مرزا غالب جواب دیتے ہیں کہ غم و اندوہ کی وجہ سے میں اتنا لاغر و ناتواں ہو گیا ہوں کہ اب مجھ میں خون نام کو نہیں رہا اور جسقدر بھی میرے بدن میں خون تھا وہ اس طرح

خشک ہو گیا ہے کہ جس طرح رنگ خام اُڑ جایا کرتا ہے۔

لفظ دامن بھی اس شعر میں خاص طور پر توجہ طلب ہے یعنی اگر جسم عاشق میں خون ہوتا تو عاشق ضرور اشک خونیں بہاتا اور پھر دامن سے اشک خونیں پونچھے جاتے تو دامن خون سے رنگین ہو جاتا۔ جب آنسو ہی خون کے نہیں تو دامن پر خون کیسے نظر آئے؟

شعر (۳) روزن، سوراخ، روشندان۔ اجزائے نگاہ آفتاب سے مراد سورج کی روشنی کے ذرے ہیں۔ ماشاءاللہ کیا ہی پیاری ترکیب الفاظ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کی دیواروں کے روزنوں میں جو ذرے نظر آ رہے ہیں حقیقت میں یہ ذرے نہیں ہیں بلکہ نگاہ آفتاب کے منتشر اجزا ہیں جو ان روزنوں میں آ کر جمع ہو گئے ہیں یعنی آفتاب بھی اس حسین پردہ نشین کو روزن دیوار سے تاکتا جھانکتا ہے۔

شعر (۴) تاریکی۔ اندھیرا۔ زندان۔ قید خانہ۔ پنبہ۔ روئی۔ مطلب یہ ہے کہ میں اپنے قید خانۂ غم کی تباہی اور اندھیرے کا حال کیا بیان کروں کہ وہ تو ایسا تاریک اور ظلمت کدہ بنا ہوا ہے کہ اگر اسکے روزن میں روئی رکھ دی جائے تو وہ نور صبح بن جاتی ہے حالانکہ روئی روزن میں اسلئے رکھی جاتی ہے کہ روشنی بند ہو جائے اور تاریکی زیادہ ہو جائے اور یہ شدت تاریکی کا سبب ہے کہ روئی رکھنے سے نور صبح کا گمان ہوتا ہے اور مرزا صاحب اسے بھی ایک قسم کا اندھیر یعنی غضب سمجھتے ہیں۔ اسی خیال کو مرزا غالب ایک جگہ اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

عیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے خرابے کی
شب مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

شعر (۵) خرمن۔ یہ لفظ دو طرح پر آتا ہے یعنی خائے مکسور سے بھی اور خائے مفتوح سے بھی۔ بالکسر صاف کئے ہوئے غلہ کا ڈھیر یا بغیر صاف کئے ہوئے ہر چیز کا ڈھیر اور بالفتح اس غلہ کا ڈھیر کہ جو ابھی تک خوشوں میں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی کی تمام رونق عشق خانہ خراب کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ یہ شعر بھی اس شعر کی تشریح کا مؤید ہے۔

دل کو آباد کیا عشق میں ویراں ہو کر
گھر کی آرائشیں کیں بے سر و ساماں ہو کر

یادگار غالب میں اس کی شرح اس طرح کی گئی ہے کہ تمام دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے وہ عشق و محبت کی بدولت ہے خواہ زن و فرزند کی محبت ہو خواہ مال و دولت خواہ ملک و ملت کی خواہ کسی اور چیز کی پس اگر خرمن میں برق نہیں یعنی دلوں میں محبت نہیں تو اسکی مثال اُس انجمن کی ہے جس میں شمع کی روشنی نہیں

شعر (۶) چارہ جوئی۔ علاج۔ سوزن۔ سوئی۔ مطلب ہے کہ غیر جو زخموں کے سلوانے پر طعنہ زنی کر رہا ہے اور وہ یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ میں زخموں کی تکلیف کی وجہ سے شاید اپنا علاج کرا رہا ہوں لیکن اس نادان کو خبر ہی نہیں کہ میں تو ایک ایذا پسند دل رکھتا ہوں یعنی سوئی جب ٹانکے لگاتی ہے تو اسکی نوک سے بھی تو ایک زخم کی ایذا پہنچتی ہے اور ہم اس ایذا میں بھی ایک قسم کی لذّت محسوس کرتے ہیں۔

شعر (۷) دفن۔ قبر۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ ہم ایک ہمہ ناز کے کشتہ و مقتول ہیں اور اسی کے تصوّر میں ہم نے جان دی اسلئے ہماری قبر میں گرد و خاک نہیں دکھائی دیتی۔ بلکہ ہر طرف گل و گلزار ہی کی بہار ہے مرزا صاحب اس قسم کا ایک اور مضمون اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

شعر (۸) ہیولیٰ۔ مادہ۔ قاعدہ ہے کہ ہیولیٰ سے ایک صورت فنا ہوتی ہے اور دوسری پیدا ہوتی ہے مطلب ہے کہ میرے بدن میں ہر ایک قطرۂ خون ایک نئے ناسور کا مادہ ہے یعنی جس جس جگہ خون کے قطرے گرینگے وہاں ناسور ڈال دینگے اور خون چونکہ تمام بدن میں دَورہ کرتا ہے اسلئے ہر قطرہ ناسور ڈالتا ہوا نکلتا چلا جائیگا یعنی میرا خون بھی تلاش درد میں دورہ کر رہا ہے اور ذوق درد کا اس میں مادہ ہے۔

شعر (۹) قلزم آشامی۔ سمندر پی جانا۔ رگ گردن بطور مجاز غرور و تکبر۔ چنانچہ مرزا غالب خود

ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے
غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے

مینا۔ شیشۂ شراب۔ مطلب یہ ہے کہ ساقی کے پاس جو مینائے مے تھا اس پر وہ مغرور تھا اور اترایا ہوا تھا کہ اتنی شراب کون پی سکتا ہے یا اپنی دریا دلی پر نازاں تھا لیکن میں ایسا بلانوش اور قلزم آشام ثابت ہوا کہ ساقی کا نشۂ غرور ہرن ہو گیا اور شیشۂ مے میں کوئی موجِ مے نہ رہی یعنی میں تمام کا تمام شیشہ صاف کر گیا۔ اور ساقی سے ابھی اور تقاضا تھا کہ ساقیا اور بھی لا۔ اپنی قلزم آشامی کی مثال ایک شاعر نے اس طرح دی ہے ع

خم کے خم پی جاتے ہیں رہتے ہیں پر ہشیار ہم!

شعر (۱۰) فشار مصدر فشردن سے ہے جس کے معنی ہیں نچوڑنا، بھینچنا۔ مطلب یہ ہے کہ ضعف نے مجھ کو چاروں طرف سے اسقدر دبایا ہے کہ میری ناتوانی بھی ظاہر نہیں ہو سکتی اسلئے کہ قد جو کثرت ناتوانی سے جھک جاتا ہے (اور جس سے کہ ناتوانی ظاہر ہوتی ہے) وہ بھی چاروں طرف سے ناتوانی کے غلبہ کی وجہ سے جھک نہیں سکتا کیونکر جھکے تو کدھر جھکے۔ پس میری ناتوانی ظاہر ہو تو کس طرح ہو؟ (ہدیہ سعید)

شعر (۱۱) گلخن اور گُلخن دونوں طرح آتا ہے بمعنی آتش خانہ اور خاکستر خانہ لیکن اس جگہ مضموم سے مراد ہے اور یہ مخفف ہے گل خانہ کا یعنی گل بمعنی چنگاری اور خن مخفف خانہ کا۔ ہندی میں اسے بھاڑ کہتے ہیں جہاں غلہ بھونا جاتا ہے۔ غالباً مولانا حالی نے گِلخن مکسور ہی لکھا ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ "اپنے کو مثل خس کے اور وطن کو گلخن سے تشبیہ دی ہے مطلب یہ ہے کہ جس طرح پھونس گلخن میں ہوتا ہے تو جلتا ہے اور گلخن میں نہیں ہوتا تو کچھ قدر نہیں ہوتی۔ یہی حال میرا ہے کہ وطن میں تھا تو جلتا تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر ہوں۔

لیکن مولانا سید ہاشمی صاحب نے مولانا حالی کی اس شرح پر اعتراض کیا ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ "راقم الحروف کو اس معنی میں اختلاف ہے شاعر کا اصل مطلب معلوم ہوتا ہے کہ دیس پردیس کہیں بھی میرے مخفی جوہر ظاہر

نہ ہو سکے اور دونوں جگہ میں ایسا ہی ناکارہ سمجھا گیا جیسا کہ گھاس پھونس کا ایک ڈھیر جو بھٹی میں نہ ڈالا جائے تو محض ایک کوڑا ہے اور بادی النظر میں بالکل بیکار اور بے حقیقت شے ہے حالانکہ اگر وہ اپنے موزوں مقام یعنی گلخن میں ہوتا تو اس کے کمالات ظاہر ہوتے اور وہ روشن اور منور ہو جاتا خس اور گلخن کے اس نادر مضمون کو مرزا صاحب نے ایک اور شعر میں بھی تحریر کیا ہے ؎

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

ہمارے خیال میں مولانا طباطبائی نے بھی اس شعر کی تشریح میں ایک خاص بات پیدا کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ ظاہر ہے کہ مشتِ خس اپنے وطن میں ہے تو خارزار میں ہے اور اگر وطن سے باہر نکل کر کہیں قدم رکھا تو جاروب کشوں نے نکال باہر کیا وطن میں اذیت اور غربت میں ذلت کا سامنا ہے اس کیلئے فروغ اور شان اگر ہے تو گلخن میں ہے۔ اس شعر میں مذاق تصوف ہے یعنی جس طرح ہر شے آگ میں گر کر آگ ہو جاتی ہے اسی طرح عارف کو شاہد حقیقی کے ساتھ اتحاد حاصل ہو جاتا ہے اور نہیں تو ایک مشتِ خس ہے جس کا وطن عدم اور غربت امکان ہے اور امکان پر جس طرح عدم سابق ہے اسی طرح عدم لاحق بھی ہے کہ امکان وجود بین العدمین ہی کا نام ہے۔ جو ممکن عدم سے آیا ہے وہ عدم میں چلا بھی جائیگا پس حیات ابدی اس میں ہے کہ واجب الوجود سے ملحق ہو جائے اور فنا فی الذات ہو کر ترانہ انا ولا غیری بلند کرے۔" چونکہ مرزا غالب وحدت الوجودی مذہب رکھتے تھے اس لئے یہ شرح ان کے حسب حال ہو سکتی ہے۔

(۸۵) عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا ۱ گر اک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں
حلقے ہیں چشمہائے کشادہ بسوئے دل ۲ ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں
میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش ۳ تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں
ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ ۴ ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

شعر (۱) یعنی میں اسکی بہ تمام و کمال ستائش گری اور اسکے ناز و ادا کی طرح سرائی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا اگر اسکی صرف کوئی ایک ہی ادا ہو تو سمجھوں کہ میں نے یہ فرض ادا کر دیا اور اس قضیئے سے فارغ ہو گیا۔ مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ شارحین کلام مرزا غالب نے اس شعر کی شرح فرماتے ہوئے لفظ قضا پر غور نہیں فرمایا اور انہوں نے اس جگہ لفظ قضا سے موت کے معنی اخذ فرمائے ہیں حالانکہ یہ قطعی غلط ہے دراصل قضا کے معنی ہیں حکم کرنا۔ ادا کرنا۔ تمام کرنا، بیان کرنا اور وہ عبادت جس کا وقت گزر گیا ہو وغیرہ وغیرہ جناب طباطبائی صاحب تو اتنا کہہ کر ٹال گئے ہیں کہ شعر صاف اور پہلے مصرعہ میں "میں" محذوف ہے جناب قاضی صاحب فرماتے ہیں "یعنی میں اس کے ناز کی پوری پوری تعریف نہیں کر سکتا اگر اس میں ایک ادا ہو تو میں اسے اپنی قضا سمجھوں لیکن وہاں تو جان کی لیوا سینکڑوں ادائیں ہیں۔

اب ذرا جناب آسی صاحب کی شرح بھی سن لیجئے فرماتے ہیں ہیں "اسکے ناز کی تعریف نہیں کر سکتا اگر اس میں ایک ادا ہو تو یہ کہہ کر فراغت پا جاؤں کہ اس پر میری جان جاتی ہے مگر یہاں تو ہزاروں ادائیں ہیں"

قارئین کتاب سے ہم داد طلب ہیں کہ وہ ہماری مختصر مگر جامع شرح پر بھی غور فرمائیں کہ کونسی شرح صحیح ہے۔

شعر (۲) یعنی تیری زلفوں میں جو حلقے پڑے ہوئے ہیں وہ ایسے ہیں جیسے کھلی ہوئی آنکھیں گویا حلقہائے زلف کی آنکھیں بھی میرا دل چھیننے کی تاک میں ہیں اور جس حالت میں کہ حلقہائے زلف کو آنکھوں سے تشبیہ دی ہے تو مناسب ہے کہ ہر تار زلف کو نگاہ سرمگیں کہہ دیں۔

شعر (۳) نوا۔ آواز۔ مجازاً نالہ و فریاد یعنی مطلب یہ ہے کہ جب تو میری فریاد سنتا ہی نہیں تو مجبوراً مجھے خاموش ہونا ہی پڑتا ہے اس مضمون کو ذوق مرحوم نے اس طرح ادا کیا ہے۔

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی مرے سب کے جواب میں

شعر (۴) منفعل، شرمسار۔ خدا نہ کردہ یعنی خدا ایسا نہ کرے۔ مرزا صاحب کی اس مضطربانہ گفتگو

سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو محبوب کا بیوفا کہنا کسی صورت میں پسند نہیں مطلب یہ ہے کہ مجھ میں اور میرے گمان میں ایک بحث کی صورت پیدا ہو گئی ہے یعنی میرا گمان تو تجھے بیوفا سمجھتا ہے اور میں تجھے وفادار کہنا چاہتا ہوں پس اے ظالم تو خدارا اپنی بیوفائی سے باز آ اور مجھ کو میرے گمان کے سامنے شرمندہ و شرمسار نہ کر یعنی جب اسکی آنکھوں کے سامنے معشوق کی بیوفائی کا نقشہ آتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اسکے بیوفا کہنے پر مجبور پاتا ہے لیکن معاً چونکہ اسکا مصفا ہے اور خدا سے دعا مانگتا ہے کہ خدایا مجھے وہ دن نہ دکھانا کہ مجھے اُسے بیوفا کہنا پڑے۔

(۸۶) مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت ۱ میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے ۲ بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
۳- کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

شعر (۱) انقطاع تعلقات کے بعد عرصہ دراز گزر جائے اور پھر ایک فریق کو دوسرے فریق سے ضروری کام کیلئے ملنے کی خواہش ہو اور وہ از سر نو تعلقات پیدا کرنے چاہے تو ضرور یہ خیال پیدا ہوگا کہ شاید یہ شخص جو ناراض ہو چکا ہے میرے بلانے پر آئے یا نہ آئے لیکن مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اگر آپ مہربان ہو کر مجھے بلانا چاہیں تو میں فوراً حاضر ہو جاؤں گا اور میں کوئی وقت نہیں ہوں کہ جا کر پھر نہ آ سکوں اس شعر میں دو دفعہ لفظ وقت آنا خاص طور پر معنی خیز اور لطف انگیز ہے اس غزل کے تینوں شعر ایک ہی رنگ کے ہیں حکیم مومن خاں مومن کے کلام میں اس رنگ کے اکثر اشعار پائے جاتے ہیں ؎

دل آگ ہے اور لگائیں گے ہم
کیا جانے کسے جلائیں گے ہم

شعر (۲) سر نہ اٹھانا۔ شرمندہ ہونا یا ضعف سے سر نہ اٹھانا کے معنوں میں آتا ہے لیکن اس جگہ یہ مقصود ہے کہ دشمن جو ضعف و ناتوانی کی حالت میں دیکھ کر جواب دینے یا انتقام نہ لینے کا طعنے دیتے ہیں

لیکن بات کوئی سر تو نہیں ہے کہ اُٹھا نہ سکوں گا۔ میں تو باوجود ضعف کے اُسے برداشت کر دوں گا۔

شعر (۳) جب کہتے ہیں کہ اُن کو فلاں کام کرنے کی قسم ہے تو اسکے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اسکو اس کام کے کرنے سے انکار ہے۔ پس عاشق معشوق سے ملنے کی قسم کیونکر کھا سکتا ہے کہ زہر تجھ پر تیرے ملنے کی قسم نہیں ہے کہ میں کھا بھی نہ سکوں۔ (یادگار غالب)

(۱۸۷) ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایکدن ۱ ورنہ ہم چھیڑینگے رکھ کر عذرِ مستی ایکدن
غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو ۲ اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایکدن
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں ۳ رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے ۴ بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایکدن
دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
۵۔ ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیشدستی ایکدن

شعر (۱) کھل جاؤ یعنی بے تکلف ہو جاؤ۔ مطلب ہے کہ مرزا صاحب اپنے ایک معشوق سے از راہ شوخی و ظرافت عرض کرتے ہیں کہ بادہ نوشی کے وقت ہم سے بے تکلف ہو جاؤ ورنہ ہم خود بے تکلف ہو جائیں گے یعنی ہماری چھیڑ چھاڑ پر ناراض نہ ہوں کیونکہ ہمارے پاس پہلے ہی معقول عذر موجود ہے کہ نشہ کی حالت میں ہم سے ایسی حرکت ہو گئی۔ اس شعر میں مے پرستی سے مے نوشی مراد لی گئی ہے۔

شعر (۲) غرّہ۔ غرور و ناز۔ اوج۔ بلندی۔ عالمِ امکان۔ دنیا۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ تو دنیوی جاہ و جلال بلندی عمارات پر مغرور و نازاں نہ ہو اور یہ نہ سمجھ کہ میں ہمیشہ اسی شان و شوکت سے رہونگا۔ یا ہمیشہ دنیا میں ہونگا اور دنیا کی بلندی عمارت اسی طرح قائم رہیگی۔ ایک نہ ایک دن ضرور اس عروج کو ذلت اور اس کمال کو زوال آئیگا۔ بصورت انقلاب زمانہ بھی اور بصورت قیامت بھی۔ اوج و پستی میں صنعت تضاد ملحوظ رکھی گئی ہے۔

شعر (۳) رنگ لائیگی یعنی کسی نہ کسی دن جھگڑا پیدا کریگی۔ مطلب ہے کہ مرزا غالب شراب تو میخانہ

سے اُدھار پیتے تھے لیکن ساتھ ہی دل میں یہ بھی کھٹکا لگا ہوا تھا کہ کہیں رسوائی کی نوبت نہ آجائے یعنی میخانہ والے تقاضانہ کر بیٹھیں اور فاقہ مستی یعنی تنگدستی سے ہم مجبور ہیں۔ اور آخر مرزا صاحب کو روز بد دیکھنا نصیب ہوا جس کی بنا پر یہ شعر کہا گیا۔ چنانچہ تذکرہ آبحیات میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ مرزا بہت قرضدار ہو گئے قرضخواہوں نے نالش کر دی جوابدہی میں طلب ہوئے مفتی صدرالدین آزردہ کی عدالت تھی جس وقت پیشی میں گئے یہ شعر پڑھا۔ ممکن ہے میخانہ والوں کا قرضہ نہ ہو اور مرزا صاحب اپنی دیگر خانگی ضروریات کیلئے قرض لیتے رہے ہوں، اور فاقہ مستی کی رعایت کے لئے مے کا لفظ استعمال کیا ہو۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ دنیا کے ظالم لوگوں نے اہل کمال لوگوں کی کوئی عزت اور قدر نہ کی۔ اور ان کو ذلیل و رسوا کر کے چھوڑا۔

شعر (۴) یعنی اے دل اگر خوشی کے نغمے نہیں تو نہ سہی تو غم کے نغموں کو ہی غنیمت سمجھ کہ آواز تو آرہی ہے کیونکہ ایک دن ایسا ہوگا کہ تیرا سازِ ہستی ٹوٹ جائیگا۔ اور اس سے کوئی آواز نہ نکلے گی یعنی نہ خوشی کی آواز اور نہ غم کی آواز۔ اسی مضمون کو مرزا صاحب نے ایک اور جگہ ان الفاظ میں لکھا ہے ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

نیز اس شعر میں لفظ نغمہ اور لفظ غم کی لفظی مناسبت قابل غور ہے۔

شعر (۵) دھول دھپہ۔ مار پیٹ۔ ہاتھا پائی۔ دراز دستی۔ مطلب ہے کہ دنگہ مشتی یا مار پیٹ کرنا تو اس نازنین کی عادت نہیں یہ جو کچھ ہماری گت بنی یہ ہمارے ہی اعمال کی سزا ہے کیونکہ کچھ گستاخانہ پہل ہم ہی سے وقوع میں آئی تھی۔

(۸۸) ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں ۱ اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں
کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا ۲ پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز ۳ نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

بوسہ نہیں نہ دیجیے۔ دشنام ہی سہی ۴ آخر زباں تو رکھتے ہو تم۔ گر دہاں نہیں
ہر چند جانگدازیٔ قہر و عتاب ہے ق ۵ ہر چند پشتِ گرمیٔ تاب و تواں نہیں
جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے ۶ لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں
خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم ۷ دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں
ہے ننگِ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو ۸ ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں
نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب ۹ دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں
کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں ۱۰ گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں
پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی ۱۱ روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
۱۲ غالبؔ کو جانتا ہے کہ نیم جاں نہیں

شعر (۱) یعنی وہ جو ہم پر جفا کرتے ہیں وہ اسلئے نہیں کہ انہیں ہم پر کسی قسم کی بیوفائی کی بدگمانی ہے یا انہیں ہماری دعاؤں کا امتحان مدنظر ہے نہیں نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے وہ تو یونہی ایک قسم کا مذاق اور دل لگی کر رہے ہیں اس شعر میں لفظ جفا خاص طور پر معنی خیز ہے عوام الناس لفظ جفا سے ظلم وستم کے معنی اخذ کیا کرتے ہیں جو قطعی غلط ہے کیونکہ ظلم وستم اور شے ہے اور جفا اور شے۔ ظلم وستم عداوت اور دشمنی کے موقع پر پیدا ہوتا ہے اور جفا میں ایک قسم کی شان محبت پنہاں ہوتی ہے مثلاً ؎

اس میں بھی محبت کی دیکھی ہے جھلک میں نے
کیونکر نہ پسند آئے انداز جفا مجھکو

شعر (۲) غالباً یہ شعر حمد میں کہا گیا ہے کہ خدائے پاک کی حمد کس منہ سے ادا کروں کہ موقع پر میری خبر لیتا ہے اور ہمیشہ امداد کرتا ہے اور پھر مجھ سے گفتگو ہے بول چال اور اگر تاویل کیجیے تو رنگ تغزل سے بھی باہر

نہیں یعنی وہ اغیار سے میری حالت دریافت کرتا ہے مگر مجھ سے براہِ راست کبھی بات نہیں کرتا مرزا صاحب نے ہی رنگ کا ایک اور شعر اس طرح لکھا ہے۔

کیوں نہ ہو بے التفاتی اس کی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسشہائے پنہانی مجھے

یعنی وہ مجھ سے بے التفاتی کیوں نہ کرے وہ اس سے مطمئن ہے کہ ہم یوں جو کسی کسی سے اس کا حال پوچھ لیا کرتے ہیں وہ اسی میں خوش اور محو ہے۔ (آسی)

شعر (۳) لفظ عزیز عربی زبان کا لفظ ہے اور عربی میں لفظ عزیز کے معنی عزت والے کے ہیں لیکن فارسی میں پیارے کے معنوں میں آیا ہے مطلب یہ ہے کہ ہم کو اس کا ستم پیارا معلوم ہوتا ہے اور چونکہ ہم شوق سے اسکے تختۂ مشق ستم بنے رہتے ہیں اسلئے وہ ہمیں عزیز رکھتا ہے الغرض اسکی نامہربانی سے بھی اسکی مہربانی کی ایک شان پائی جاتی ہے یہ انداز بیاں حکیم مومن خاں مومن کے کلام میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے چنانچہ اسی زمین میں ان کی بھی ایک غزل ہے جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

باتیں تری وہ ہوش ربا ہیں کہ کیا کہیں
جو کوئی رازداں ہے مرا رازداں نہیں

شعر (۴) دشنام۔ گالی۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے آپ سے بوسۂ دہن طلب کیا تھا لیکن اس پر آپ چپ ہیں چلو بوسۂ دہن نہ دینے سے ہم نے تسلیم کر لیا کہ آپ دہن رکھتے ہی نہیں، کیونکہ شاعروں کے معشوق کی نہ کمر ہوتی ہے نہ دہن ہوتا ہے، لیکن زبان تو ہے پس جب زبان سے سوالِ بوسہ پر ناراض ہو گئے ہو تو گالیاں ہی دیدو۔

شعر (۵ و ۶) ہر چند۔ جتنا کچھ۔ جس قدر۔ پشت گرمی تاب تواں۔ گرمی تابِ تواں برداشت نہیں کر سکنا مضروب۔ گویا۔ ہل من مزید۔ اور زیادہ طلب کرنا۔ زمزمہ راگ، الاماں۔ خدا اپنی پناہ میں رکھے۔ نیاز مانگنا ہے پردہ سنج زمزمۂ الاماں نہیں یعنی اب الاماں کی آواز نہیں نکلتی۔ اس شعر میں لفظ پردہ یا پردہ سنج خاص

طور پر معنی خیز ہے افسوس ہے کہ شارحین کلام غالب نے لفظ پردہ کی اس جگہ کوئی وضاحت و تشریح نہیں فرمائی۔ آؤ ہم بتائیں کہ لفظ پردہ اس جگہ کیوں استعمال کیا گیا ہے بات اصل میں یہ ہے کہ فارس کے موسیقی دانوں نے اپنی موسیقی کے بارہ مقام یعنی بارہ پردے مقرر کئے ہیں یعنی جس طرح ہندوستان میں چھ راگ مشہور ہیں اسی طرح فارس میں بارہ مقام یا بارہ پردے مشہور ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ رہادی۔ حسینی۔ راست۔ حجاز۔ بزرگ۔ کوچک۔ عراق۔ صفاہان۔ نوا۔ عشاق۔ زنگلہ۔ بوسلیک۔ تو گویا پردہ کے معنی راگ کے ہوئے اسی طرح پردہ سرا کے معنی گویا کے ہیں پس جس طرح نغمہ سنج یا زمزمہ سنج کے الفاظ استعمال ہوا کرتے ہیں اسی طرح مرزا غالب نے اس جگہ پردہ سرا کی جگہ پردہ سنج لکھ دیا ہے اب شعر کا مطلب سمجھنے کیلئے نہایت آسانی ہو جائیگی یعنی ہر چند کہ قہر و عتاب سے جان گھلی جا رہی ہے اور مجھ میں برداشت کرنے کی طاقت نہیں لیکن پھر بھی میں الاماں نہیں پکارتا بلکہ میری جان نہایت طرب انگیزی سے ہل من مزید کا ترانہ گا رہی ہے کہ اگر کوئی اور بھی ستم باقی ہے تو میں اسکی خواہشمند ہوں اس شعر میں الفاظ مطرب۔ ترانہ۔ پردہ اور زمزمہ کی معنوی رعایتیں قابل داد ہیں۔

شعر (۷ و ۸) دو نیم۔ دو ٹکڑے۔ مژہ۔ پلک۔ خونچکاں۔ لہو ٹپکانے والا۔ آذر۔ آگ بجلی نفس سانس آہ۔ آتشکدہ۔ آگ کا گھر۔ مطلب ان دونوں شعروں کا یہ ہے کہ اگر تیرا دل عشق نے دو ٹکڑے نہیں کیا تو خنجر خوا سے اسکے دو ٹکڑے کر دے کیونکہ ایسا دل جس پر عشق کا وار نہیں ہے اسے کاٹ دینا ہی بہتر ہے۔ اسی طرح اگر تیری پلکوں پر قطرات خون نظر نہیں آتے یعنی تیری آنکھوں سے اشک خونیں نہیں ٹپکتے تو دل میں چھری بھونک دے کیونکہ یہ آنکھوں تک اپنا خون نہیں پہنچاتا مرزا صاحب ایک اور جگہ بھی لکھتے ہیں ؎

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے؟

اسی طرح وہ دل سینہ میں رہنے کے قابل ہی نہیں کہ جو آتشکدہ بنا ہوا نہ ہو اور وہ سانس یا آہ دل کیلئے موجب شرم و عار ہے جو آتش فشاں یا برق تپاں نہ بن جائے۔ مندرجہ ذیل اشعار بھی انہیں خیالات کی تائید کرتے ہیں ؎

ایسا دل تو سینے میں رہنے کو قابل ہی نہیں　　جو حسینوں کی جبینوں کا تمنائی نہ ہو
ایسے سر کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہیئے　　جو تمہارے گیسوئے مشکیں کا سودائی نہ ہو
وہ عبادت ہی نہیں ہے اور وہ سجدہ ہی نہیں　　تیرے قدموں پر اگر اپنی جبیں سائی نہ ہو

شعر (۹) گراں بہا دل۔ جسکا مطلب ہے کہ اگر میرے دیوانہ پن اور وحشت مزاجی سے گھر ویران ہوتا ہے تو کیا نقصان ہے کیونکہ میرے گھر کی زیادہ سے زیادہ سو گز زمین ہو گی لیکن اسکے عوض میں صحرا ملیگا کہ جس کی زمین ہمارے گھر کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ وسیع ہو گی۔ یہ سودا تو ایک طرح سے بہت فائدہ بخش ہے گھر برباد ہوتا ہے تو ہماری بلا سے۔

شعر (۱۰) سرنوشت، تقدیر۔ جبیں۔ پیشانی۔ مطلب ہے کہ اے دوستو! میری قسمت اور میری تقدیر کے متعلق کیا پوچھ رہے ہو۔ کیا تمہیں میری پیشانی پر سجدوں کا نشان نظر نہیں آ رہا گویا یہ صاف نظر آ رہا ہے کہ بتوں یعنی حسینوں کے سامنے سجدے کرنا میری تقدیر میں لکھا ہے۔

شعر (۱۱) روح القدس۔ جبریل علیہ السلام۔ یہاں ہمزبان کے لفظ میں ابہام ہے۔ ظاہر معنی تو یہی ہیں کہ انسان اور فرشتہ کی زبان ایک نہیں ہو سکتی۔ اور در پردہ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جیسی فصیح میری زبان ہے ویسی روح القدس (جبریل علیہ السلام) کی نہیں (یادگار غالب)

شعر (۱۲) بہائے بوسہ قیمت بوسہ۔ مولانا آسی اس شعر پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ اسکے ایک بوسہ کی قیمت جان ہے مگر وہ ابھی مجھ سے نہیں کہتا کہ اگر اپنی جان دیدو تو ایک بوسہ لو۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ غالب ابھی ہیجان میں نہیں ہے جب میں ہیجان ہو جاؤنگا تب وہ مجھ سے کہیگا کہ جان دو اور بوسہ لے لو۔ میں جان [illegible] مرنے تیار ہو جاؤنگا تو اسوقت یہ کہیگا کہ ہیجان اسکی قیمت نہیں ہے بلکہ پوری جان اسکی قیمت ہے۔ اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ جان سے مراد روح کا جسم میں ہونا ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک روح جسم میں ہے تب تک جان [illegible] نصف اور ثلث باقی نہیں رہا کرتی ہوتی ہے تو پوری ہوتی ہے اور نہیں ہوتی تو بالکل نہیں

ہوتی۔ مگر شاعر نے معشوق کی ستم ظریفی کا ایک نقشہ کھینچ کر دکھایا ہے۔

ہمارے خیال میں لفظ جان، قوت و طاقت کے معنوں میں بھی آتا ہے ممکن ہے کہ مرزا صاحب نے یہی معنی لئے ہوں یا جس طرح نیم مردہ کا لفظ مستعمل ہے نیمجان بھی انہیں معنوں میں ہوا تو پھر ظاہر ہے کہ ایسی نیم مرد حالت میں کوئی بوسہ بینا بھی چاہے تو کیا خواہش اور کیا لذت حاصل ہو سکتی ہے؟

(۸۹) مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں ۱ ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں
شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہ جہاں ۲ جادۂ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں
حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے ۳ جادۂ راہ وفا جز دم شمشیر نہیں
رنج نومیدیٔ جاوید گوارا رہیو ۴ خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں
سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے ۵ لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں
جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے ۶ کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں
غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
۷ آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

شعر (۱) چکر۔ پھرنے کی دھت۔ کہتے ہیں کہ اس کے پاؤں میں چکر ہے یعنی اسکو پھرنے کی دھت ہے کہتا ہے کوئی تدبیر مجھے دشت نوردی سے روک نہیں سکتی۔ پس زنجیر جو اس غرض سے میرے پاؤں میں ڈالی گئی ہے اسے زنجیر نہ سمجھو بلکہ چکر سمجھو۔ (یادگار غالب)

اس تخیل کی تائید مندرجہ ذیل شعر سے بھی ہوتی ہے:-

بیمار محبت کا بڑھتا ہے مرض اس سے
اے چارہ گرو دیکھو میری نہ دوا کرنا

شعر (۲) دشت جنگل۔ جادہ۔ وہ باریک راہ جو سیدھی جنگل کو جائے۔ اور صرف آمد و رفت کی

وجہ سے جس کی نمود ہو۔ غیر از نگہِ تصویر۔ حیرت کے سوا۔ معدوم۔ آسی صاحب شرح فرماتے ہیں کہ مجھکو شوق جنون لیے جنگل کی طرف لئے جاتا ہے کہ جہاں سوائے نگاہ دیدۂ تصویر کے کوئی راستہ نہیں یعنی جہاں راستہ بالکل معدوم ہے یا جہاں سوائے جادۂ حیرت کے اور کوئی راستہ نہیں۔

اس تخئیل کی تائید مندرجہ ذیل شعر سے بھی ہوتی ہے ؎

گم گشتگان حیرت منزل کو ڈھونڈتے ہیں
دل اُن کو ڈھونڈتا ہے وہ دلکو ڈھونڈتے ہیں

شعر (۳) لفظ دم کے بہت سے معانی ہیں لیکن اس جگہ صرف تلوار کی تیزی مراد ہے یعنی مرزا صاحب نے اپنا دیرینہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ عشق و محبت میں جو کچھ آزار اور دکھ پہنچتا ہے اسکی لذت کو کچھ ہمیں نتے ہیں بلکہ ہم اس لذت آزار کی خوگر ہونا اور جی بھر کے لذت اندوز ہونا چاہتے ہیں جیسا کہ شیوۂ عشاق ہے مثلاً

؎ اس کی لذت کو مجھ سے پوچھے کوئی — درد دل کی دوا نہیں نہ سہی
یا ؎ رکھا عدو کو عشق کی لذت سے بے نصیب — تا آج حزیں کو خوگر آزار کر دیا

لیکن افسوس ہے کہ راہِ وفا سوائے تلوار کی دھار کے اور کوئی نظر نہیں آتی اور دم شمشیر ایک دم میں ہمارا سب ہی دم (خون) پی لیتی ہے اور لذت آزار کی حسرتیں ہمارے دل ہی دل میں رہ جاتی ہیں۔

اس شعر میں لفظ جادہ۔ دم شمشیر اور راہِ وفا کی مناسبتوں اور رعایتوں سے بہت صحیح معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

شعر (۴) نومیدی جاوید۔ ہمیشہ کی ناامیدی، زبونی۔ عاجزی، بدحالی۔ مطلب ہے کہ مجھے ہمیشہ کے لئے مایوس اور ناامید رہنا منظور اور مجھے اس سے رنجیدگی نہیں اور نہ ہی اسے اپنی ذلت و عاجزی سمجھتا ہوں لیکن یہ ذلت و عاجزی گوارا نہیں کہ میرا نالہ تاثیر کا احسانمند ہو۔ اس قسم کے خیال کی تائید اس شعر سے بھی ہوتی ہے ؎

زندگی درد محبت سے ہی وابستہ ہے
کیوں ہو شرمندۂ احسان مسیحا کوئی

شعر (۵) جہاں۔ جس وقت۔ لذتِ سنگ باندازہ تقریر یعنی پتھر کھانے (پتھر کا زخم کھانا) میں مجھ ایسی لذت حاصل ہوتی ہے کہ زبان سے اس کا مزہ بیان ہونا مشکل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس وقت سر کا زخم ا ہو جاتا ہے تو وہ پھر کھجانے لگ جاتا ہے یعنی زخم سنگ کھانے کی پھر حسرت پیدا ہوتی ہے۔ سر کھجانا ایک عام محاورہ ہے جس کے معنی سر کوبی کی خواہش کرنے کے ہیں۔

شعر (۶) کرم بخشش۔ مہربانی۔ تقصیر اول بمعنی گناہ۔ تقصیر بمعنی کوتاہی۔ خجلت۔ شرمساری مطلب یہ ہے کہ اگر کریم از راہ کرم بیباکی و گستاخی کی اجازت دے تو اس وقت گناہ کرنے میں کوتاہی کرنا سب سے بڑا گناہ ہے۔ امیر مینائی فرماتے ہیں ؎

موقوف جُرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا
بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا

شعر (۷) یعنی اے غالب ہمارا بھی وہی عقیدہ ہے جو شیخ امام بخش ناسخ کا ہے کہ جو حضرت میر تقی میر دہلوی کو شاعری اور سخن آفرینی میں اُستاد نہیں مانتا وہ خود حقیقت شاعری سے بے نصیب ہے بلکہ وہ جاہل ہے۔ ذوق مرحوم بھی ایک غزل میں لکھتے ہیں کہ ؎

نہ ہُوا پر نہ ہُوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

---

(۹۰) مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

شعر (۱) مردمکِ دیدہ۔ آنکھ کی پتلی۔ سویدائے دل۔ دل میں ایک سیاہ نقطہ ہوتا ہے اُسے سویدائے قلب کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میری آنکھ کی پتلی میں یہ نگاہیں نہیں ہیں بلکہ آنکھ کے دل میں آہیں جمع ہو گئی ہیں

یہی ایک قسم کا سیاہ دھواں ہی ہوتا ہے اور آنکھ کی پتلی بھی سیاہ اور سویدائے دل بھی سیاہ اسلئے ان کی رعایتوں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

(۹۱) برشگال گریۂ عاشق ہے دیکھا چاہیئے ۱ کھل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن

الفتِ گل سے غلط ہے دعویٰ وارستگی
۲- سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

شعر (۱) برشگال۔ برسات۔ کھل گئی۔ پھٹ گئی۔ مطلب یہ ہے کہ گریۂ عاشق نے برسات کی صورت اختیار کر لی ہے اور عموماً دیکھنے میں آتا ہے کہ برسات کے دنوں میں اکثر مکانوں کی دیواریں پھٹ جاتی ہیں پس سیلاب گریۂ عاشق سے گل صد چاک کی طرح دیوارِ چمن بھی کھل گئی یعنی شق ہو گئی ہے۔

شعر (۲) وارستگی۔ آزادی۔ سرو کو آزاد کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی کیسا ہی آزاد اور وارستہ اور آزاد مزاج ہو دنیا میں عشق و محبت کے پھندے سے نہیں چھوٹ سکتا۔ (یادگار غالب)

(۹۲) عشق تاثیر سے نومید نہیں ۱ جانسپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آتی ہے ۲ جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلّی تری سامانِ وجود ۳ ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے ۴ ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے ۵ غمِ محرومیِ جاوید نہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
۶- ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

شعر (۱) نومید۔ ناامید کا مخفف ہے مطلب یہ ہے کہ عشق میں تاثیر و جذبہ دل سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے بس میں اپنے آپ کو فنا کر دینا اور رجحان سے دنیا رنگ لایا کرتا ہے کیونکہ یہ عشق کوئی بید کا درخت نہیں

کہ اس میں کوئی پہل ہی نہیں آتا ہے

ہرگز اثر دل کبھی زائل نہیں ہوتا
وہ کون ہے جو جذب کا قائل نہیں ہوتا

شعر (۲) اس شعر میں لفظ جام اور لفظ خاتم و جمشید خاص طور پر معنی طلب ہیں۔ جام پیالہ شراب اور نام ایک شہر کا بھی ہے۔ جام جہاں نما یا جام جہاں بیں بادشاہ کیخسرو نے بنایا تھا کہ جس سے تمام زمانے کا حال معلوم ہوتا تھا اور ایک جام بادشاہ جمشید سے بھی نسبت رکھتا ہے! اب لفظ جمشید کی تشریح بھی ضروری ہے کہ لفظ جمشید ایک بادشاہ کا نام ہے۔ اگر یہ لفظ خاتم۔ نگین! اسپ۔ تخت۔ باد۔ آصف۔ ماہی طیور وغیرہ کے ساتھ مستعمل ہو تو اس سے مراد سلیمان علیہ السلام ہونگے۔ اور اگر سد۔ آئینہ۔ آب حیواں وغیرہ کیساتھ مستعمل ہو تو اس سے مراد سکندر بادشاہ ہوگی۔ اور اگر یہ لفظ جام، شراب، بزم، جشن نوروز وغیرہ کیساتھ استعمال ہو تو اس سے مراد جمشید بادشاہ ہوگی اور خاتم کے معنی انگوٹھی کے ہیں اب اس شعر کے سمجھنے میں بہت آسانی ہوجائیگی مطلب یہ ہے کہ جام شراب بمنزلہ ایک سلطنت کے ہے کہ جو جمشید کے زمانے سے دست بدست منتقل ہوتی چلی آتی ہے پھر بھلا ہمارے ہاتھوں تک جام مے کیوں نہ پہنچتا کیونکہ یہ جام مے تھا نہ کہ جمشید کی انگشتری کہ اس پر صرف اسی کا نام کھدا ہوتا۔ وہ تو صرف حضرت سلیمان علیہ السلام کی خاتم یعنی انگشتری تھی کہ جو صرف انہیں کے لئے مخصوص تھی۔

شعر (۳) یہ شعر درحقیقت توحید وجودی کے رنگ میں لکھا گیا ہے۔ تجلی بمعنی آشکارا کرنا۔ روشن کرنا جلوہ گری۔ غلبہ نور الٰہی۔ وجود بمعنی مطلب کا پانا۔ ہستی بمعنی عالم ایجاد میں ظاہر ہونا۔ مجازاً جسم و بدن۔ چونکہ وحدۃ الوجودی صوفیوں کی اصطلاح میں ایک وجود اللہ تبارک تعالیٰ کا جاننا اور اسکے ماسوا جو وجود عالم ایجاد میں ہیں انکو محض اعتبارات و تعینات سمجھنا ہے جیسے دریا میں موج۔ حباب۔ بھنور اسی طرح قطرات۔ برف ژالہ وغیرہ کو پانی ہی تصور کیا جاتا ہے اسلئے اب اس شعر کا مطلب سمجھنا چاہئیے کہ جس طرح آفتاب کے عکس روشنی کے بغیر ذرہ کا وجود ظاہر نہیں ہوسکتا اسی طرح بغیر تیری تجلی کے عالم امکان کا وجود میں آنا ناممکن و محال ہے۔

تیری جلوہ آرائی سے ہی ظہور کائنات ہے۔

مرزا صاحب اسی مضمون کو ایک اور جگہ اس طرح لکھتے ہیں ؎

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

مولانا حسرت نے اسکے صحیح مختصر صوفیانہ معنی لکھے ہیں یعنی جس طریقے سے ذرّے میں پرتو خورشید نظر آتا ہے اسی طرح تمام موجودات عالم تیری ذات کا مظہر ہیں۔

شعر (۴) مطلب یہ ہے کہ شاید لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ اس میں کیا بھید ہے کہ باوجود اس معشوق ہرجائی کی بیوفائیوں کے عاشق تنگ آکر اور کچھ کھا کر نہیں مرجاتا لیکن مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اس میں بھید وغیرہ کوئی نہیں ہے تو محض اس خیال سے کچھ کھا کے نہیں مرجاتا کہ اس سے میرے معشوق کی اور رسوائی ہوگی۔ مشہور ہوگا کہ فلاں بیوفا کا عاشق کچھ کھا کے مرگیا ہے ورنہ مرجانا کچھ بڑی بات نہیں ہے جیسے اس خیال کو اس شعر میں ایک دوسرے پیرایہ میں شاعر نے ظاہر کیا ہے یعنی بطور طنز کہا ہے کہ ؎

تہمت نہ کوئی دیگا اب تو تمہیں کسی کی
لو تم پہ مرنے والے کچھ کھا کے مر گئے ہیں

شعر (۵) گردش رنگ طرب سے مراد محفل عیش و مسرّت کی رونق کا ناپائدار اور زوال پذیر ہونا ہے یا زمانہ عیش کا ہمرنگ انقلابات زمانہ ہونا ہے۔ ایک معنی تو اسکے یہ ہو سکتے ہیں کہ مجھے خوشی حاصل ہونے کے ساتھ ہی زوال مسرّت کا ایسا جانگداز کھٹکا لگا ہوا ہے کہ جو میرے لئے موجب تکلیف و اذیت ہے اس سے تو یہی بہتر ہے کہ ہمیشہ کے لئے محروم طرب ہو جاؤں۔

دوسرے معنی اسکے یہ ہو سکتے ہیں کہ اے نادان تجھے اس عالم بے ثبات کے چند روزہ عیش و مسرت کے زوال کا تو خوف لگا ہوا ہے اور آخرت کی محرومی جو ہمیشہ کی محرومی ہوگی اس کا کوئی غم و فکر اور ڈر نہیں؟

شعر (۶) ایک مشہور مثل ہے کہ دنیا بامید قائم۔ یعنی انسان امید کے سہارے پر زندہ ہے لیکن مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ جب یہ یقینی بات ہے کہ زندگی ہی کا کوئی اعتبار نہیں تو پھر ہم کس امید پر زندہ رہ سکتے ہیں۔

بقول شخصے ؎ کیا بھروسہ ہے زندگانی کا — آدمی بلبلا ہے پانی کا

ترے وعدے پر ستمگر ابھی اور صبر کرتے — اگر اپنی زندگی پر ہمیں اعتبار ہوتا

(۹۳) جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں ۱ خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
دلِ آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے ۲ سویدا میں سیرِ ارم دیکھتے ہیں
ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم ۳ قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کر اے محوِ آئینہ داری ۴ تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
سُراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے ۵ کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
۶- تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں!

شعر (۱) خیاباں۔ باغ کی کیاری۔ خیاباں خیاباں کثرت کیلئے استعمال ہوا ہے۔ ارم وہ باغ کہ جسے بادشاہ شداد (جس نے خدائی کا دعویٰ بھی کیا تھا) نے باغِ جنت کے مقابلے میں تیار کیا تھا مطلب یہ ہے کہ ہر نقشِ قدم میں وہ رنگینی اور بہار آفرینی ہے کہ وہ ہمیں خیابانِ ارم کی صورت میں نظر آرہا ہے۔

شعر (۲) کنج۔ گوشہ۔ سیر تماشہ مطلب یہ ہے کہ ہم عاشق مزاج لوگ تیرے دہنِ بے نشان کے خالِ سیاہ میں عدم کا تماشہ دیکھتے ہیں کیونکہ اول تو عاشق، معشوقوں کے دہن کے وجود ہی کے قائل نہیں دوسرے سیاہی میں بھی کچھ نظر نہیں آتا اور کچھ نظر نہ آنا بھی صورتِ عدم سمجھنا چاہیئے۔

شعر (۳) اسکے ایک معنی تو یہ ہیں کہ تیرے سروِ قامت سے فتنہ قیامت کم ہے اور دوسرے یہ معنی ہیں کہ تیرا قد اسی میں سے بنایا گیا ہے اسلئے وہ (فتنہ قیامت) ایک قدِ آدم کم ہو گیا ہے (یادگارِ غالب)

شعر (۴) مطلب یہ ہے کہ اے آئینہ کو دیکھ کر اپنے ہی حُسن و جمال پر فریفتہ اور محو ہو جانے والے ذرا ہماری طرف بھی دیکھ کہ ہم تجھے کس حسرت سے دیکھ رہے ہیں اسکے ایک اور معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اے آئینہ کو دیکھ کر حیران ہونے والے آئینہ کو چھوڑ اور ہماری طرف دیکھ کہ ہم تجھے محو آئینہ دیکھ کر خود بصورت آئینہ بنے ہوئے ہیں۔

شعر (۵) سراغ۔ کھوج۔ تف۔ گرمی۔ بخار۔ شبرو۔ رات کو چلنے والا۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح صبح رات کے مسافر یا چور کے نقش قدم کا پتہ چل جاتا ہے اسی طرح میرے داغ دل سے میرے نالۂ شب کی تپش کا پتہ چل جائے گا۔

شعر (۶) اہل کرم یعنی سخی لوگ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو بڑے بڑے لوگ دنیا میں دولتمند بنے ہوئے ہیں تو ہم ازراہ دلگی ان کی آزمائش کر رہے ہیں کہ آیا ان میں کچھ سخاوت کا مادہ بھی ہے یا نہیں؟ یا کہ صرف اپنی ہی تن پروری یا شکم پُری کر رہے ہیں اور انہیں اہلِ احتیاج کی مصیبتوں اور ضرورتوں کا بھی احساس ہے یا نہیں؟ مرزا صاحب کا ایک اور شعر بھی اسی مضمون کا ہے ؎

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دلگی
سائل بنے تو طالب اہلِ کرم ہوئے

(۴۹) ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں ۱ کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
کبسے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں ۲ شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر ۳ آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں ۴ میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
مجھ تک کب اُنکی بزم میں آتا تھا دورِ جام ۵ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
جو منکرِ وفا ہو فریب اُس پہ کیا چلے ۶ کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں
میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے ۷ ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے ۸ جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے ۹ ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا ۱۰ لاکھ بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے ۱۱ جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے ۱۲ جس سحر سے سفینہ رواں ہو شراب میں
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
-۱۳
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

شعر (۱) التہاب۔ آگ کا بھڑکنا۔ شعلہ زن ہونا۔ خو۔ عادت۔ مطلب ہے کہ اس آتشیں مزاج معشوق کی عادت غضبناک ہونے اور بھڑک اٹھنے کی ہے اور آگ میں بھی چونکہ یہی خواص ہیں اسلئے اگر مجھے عذاب نار میں مبتلا کیا جائے تو میں اس میں بھی ایک قسم کی راحت محسوس کرونگا۔ کیونکہ محبوب کی ہر ادا مجھے مرغوب و محبوب ہے اور آگ کی صفت محبوب کی خصلت ملتی جلتی ہے تو اس عذاب کو اگر میں موجب تکلیف سمجھوں تو ایک قسم کا کفرانِ نعمت ہوگا

شعر (۲) جہان خراب۔ دنیا۔ مطلب ہے کہ میں کیا بتاؤں کہ میری عمر اسوقت کس قدر ہے یعنی اگر اپنی زندگی کے ماہ و سال کا حساب کروں اور ساتھ ہی فرقت کی لمبی راتوں کو بھی جمع کرتا جاؤں تو میں اپنی عمر کا پورا پورا حساب بیان ہی نہیں کرسکتا کیونکہ ہجر کی ایک ایک لمبی رات ہزار ہزار سال کے برابر گذرتی رہی ہے حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ اس مضمون کو اس سے پہلے بیان کر گئے ہیں ؎

زہے عمرِ دراز عاشقاں گیرند شب ہجراں حساب عمر گیرند

ایک اردو کے شاعر نے اس مضمون کو دوسرے پیرایہ میں بیان کیا ہے ؎

کیا کیا درازیٔ شب غم جانگداز ہے
عاشق کی، عمر خضر سے بھی کچھ دراز ہے

شعر (۳) اس شعر میں ظالم معشوق کی ستم ظریفی کا ایک عجیب پہلو دکھایا گیا ہے یعنی معشوق نے خواب میں وعدہ کیا ہے کہ میں تمہارے پاس آؤنگا اب یہ لازمی ہو گیا کہ دن بھر تو عاشق جاگتا ہی رہے گا۔ لیکن اس خیال میں اسے رات بھر بھی جاگنا پڑے گا کہ شاید رات کو ہی کسی وقت وہ وعدہ کی بنا پر تشریف لے آئے کہیں ایسا نہ ہوں کہ میں سو جاؤں اور وہ دروازہ بند دیکھ کر واپس چلا جائے اس طرح تمام عمر جاگنے ہی میں گذر جائیگی جاگنا تو خیر تمہارا عمر کا روگ، تھا ہی سب سے بڑھ کر ظلم کی بات یہ ہے کہ اگر کہیں عاشق کو نیند آ جائے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اُسے خواب میں پھر دیدار معشوق ہو جائے۔

شعر (۴) پہلا مصرعہ صاف ہے دوسرے مصرعہ میں بطور طنز کے کہتا ہے کہ جو کچھ وہ جواب میں لکھیں گے مجھے سب معلوم ہے یعنی وہ کچھ نہیں لکھنے کے اسلئے قاصد کے واپس آنے سے پہلے ایک اور خط لکھ رکھوں (یادگار غالب)

شعر (۵) اس شعر میں پہلے مصرعہ کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے "پھر آج جو خلاف عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی ہے" اس حذف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے۔ ایسا حذف جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو اور جو الفاظ حذف کئے گئے ہیں وہ بغیر ذکر کئے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہوں محسنات شعر میں شمار کیا جاتا ہے (یادگار غالب) ممکن ہے کہ رقیبوں کی سازش سے ساقی نے جام شراب میں زہر کی آمیزش کر دی ہو۔

شعر (۶) مطلب یہ ہے کہ میرا معشوق جو کسی کی وفا اور اخلاص کا قائل ہی نہیں ہوتا اس پر کسی رقیب کے جھوٹے دعاوی وفا و محبت کا کیا فریب جادو چل سکتا ہے پس ایسی حالت میں مجھے اپنے دوست کی نسبت ہرگز بدگمان نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ غیر سے میل جول رکھنے کی بنا پر غیر کی دوستی و وفا کا بھی قائل ہو گیا ہے۔ اسی قسم کا ایک شعر پہلے بھی آ چکا ہے ؎

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا؟

شعر (۷) مضطرب۔ بیقرار۔ مطلب یہ ہے کہ میں تو رقیب کے خوف سے آج لطف وصال کے موقعہ پر بھی

بےچین ہو رہا ہوں کہ خانہ خراب رقیب نہ آ جائے لیکن وہم نے تمہیں کس پیچ و تاب میں مبتلا کر رکھا ہے کہ تم مجھ سے بھی زیادہ گھبرائے ہوئے ہو یعنی مجھے تو رقیب کے خوف سے واقعی گھبرانا چاہیئے لیکن تمہیں کس کا خوف ہے جو گھبرائے ہو رقیب اگر آ بھی جائے تو تمہاری بلا سے تم کیا اسکے دبیل ہو اور وہ تمہارا بگاڑ ہی کیا سکتا ہے؟ بقول شخصے ؎

خوف رقیب و اقربا میرے لئے فریب ہے
ڈرتا نہیں خدا سے جو غیر سے کیوں ڈرا کرے

شعر (۸) حظ۔ نصیب۔ خوشی۔ خداساز بات، تقدیری معاملہ۔ خدا کی قدرت۔ مطلب یہ ہے کہ بھلا میں اور میرے نصیبوں میں اُس کی خوشی۔ یہ تو خدا کی خاص عنایت و قدرت ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ اس نعمت غیر مترقبہ کے شکریہ و خوشی میں اپنی جان ہی بطور نذر پیش کر دیتا یعنی مجھے شادی مرگ ہو جاتا لیکن اضطراب مسرت میں یہ بات بھول گیا۔

شعر (۹) افسوس ہے کہ جناب آسی، جناب طباطبائی اور جناب قاضی صاحب نے اس شعر کی شرح قریب قریب ہم معنی الفاظ میں فرمائی ہے اور کسی نے بھی لفظ طرف کے معانی میں غور نہیں فرمایا مثلاً آسی صاحب فرماتے ہیں کہ "نقاب میں جو شکن پڑی ہوئی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ معشوق کے ماتھے پر شکن پڑی ہوئی ہے وہ ہم سے برہم ہے" حالانکہ لفظ طرف بفتحتین تو بمعنی کنارہ۔ جانب، کسی چیز کا حصّہ یا ٹکڑا لیکن اس شعر میں یہ لفظ بفتح اول و دربہ سکون ثانی موزون ہوا ہے جسکے معنی ہیں آنکھ۔ پلک ہلانا۔ دیکھنا۔ گوشہ۔ کنارہ۔ کمر پٹہ سونے چاندی کا جسکو ڈاب کہتے ہیں۔ گھوڑے کی ساخت کے معنوں میں بھی آتا ہے لیکن اس جگہ یقیناً بمعنی چشم نقاب یہ لفظ مستعمل ہوا ہے پس اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ ان معنوں کے ساتھ شعر کی شان کس قدر بڑھ گئی ہے۔ تیوری کا لفظ دہلی میں بوزن فاعلن استعمال ہوتا ہے اور لکھنؤ میں بوزن فعلن۔

شعر (۱۰) سبحان اللہ کیا پاکیزہ شعر ہے مرزا صاحب یہ فرماتے ہیں کہ تیرا ایک نگاہ کا چرانا لاکھوں لگاوٹ سے بڑھکر ہے اور تیرا ایک غصّہ میں بگڑنا لاکھوں بناؤ کے برابر ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ مرزا غالب کے اس شعر کی

سادگی اور بیساختگی پر لاکھوں رنگینیاں، لاکھوں سخن آفرینیاں اور لاکھوں بناوٹیں یعنی صنائع و بدائع قربان ہیں اہل ذوق و وجدان ہی اس کی داد دے سکتے ہیں۔

شعر (۱۱) خس۔ تنکا۔ گھاس۔ یہ شعر ایک حالت استعجاب کا پتہ دیتا ہے یعنی حیرت کا مقام ہے کہ میرے نالہ کی اس بے رحم کے دل میں پر کاہ کے برابر بھی کوئی وقعت اور تاثیر نہیں حالانکہ میرا نالہ تو ایسا ہے کہ وہ آفتاب کے دل میں بھی شگاف کر دیتا ہے۔

شعر (۱۲) سحر۔ جادو۔ سفینہ۔ کشتی۔ سراب۔ وہ ریت جو موسم گرما میں تابش آفتاب سے جنگل میں ایک تشنہ لب مسافر کو پانی کی طرح نظر آتی ہے اور چاندنی رات میں بھی یہی دھوکا ہوتا ہے کہ آب رواں موجزن ہے یہ شعر بھی دراصل شعر بالا ہی کے رنگ میں لکھا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے اس معشوق سنگدل کا دل نرم کرنے کیلئے ایسے ایسے زبردست سحر جادو سے کام لیا ہے کہ جس سحر سے سراب یعنی ریت میں کشتی چلنے لگ جائے لیکن تعجب ہے کہ ایسے سحر سے میری مطلب براری نہیں ہوتی۔

شعر (۱۳) روز ابر جس دن آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہوں۔ شب ماہتاب۔ چاندنی رات مطلب یہ ہے کہ اے غالب گو میں نے شراب کا پینا ترک کر دیا ہے لیکن ابر اور چاندنی رات کو دیکھ کر طبیعت مچل جاتی ہے اس لئے ان دنوں میں ضرور پی لیتا ہوں۔

(۹۵) کل کیلیے کر آج نہ خست شراب میں ۱ یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند ۲ گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
کیوں جاں نکلنے لگتی ہے تن سے دم سماع ۳ گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے ۴ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے ۵ جلنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے ۶ حیران ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر ۷ یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی ۸ ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
آرائش جمال سے غافل نہیں ہنوز ۹ پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ۱۰ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
۱۱- مشغول حق ہوں بندگیٔ بو تراب میں۔

شعر (۱) کل سے مراد قیامت خست۔ کنجوسی۔ سوئے ظن۔ بدگمانی۔ ساقی کوثر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ کوثر۔ حوض بہشت مطلب یہ ہے کہ اے ساقی! تو قیامت کے خیال سے آج کنجوسی نہ کر یعنی ہمیں فراخدلی سے شراب پلا۔ تیرا اس قسم کی خست کرنا جناب ساقی کوثر کی شان میں گستاخی و بدگمانی کا ہم معنی ہے کیا آج تیرے زیادہ شراب پلا دینے سے کل وہ بھی تنگدلی سے کام لیں گے۔

شعر (۲) مطلب یہ ہے کہ اس شعر میں آدم اور فرشتوں کے اُس قصہ کی طرف اشارہ ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا کہ کیا تو دنیا میں اس شخص یعنی نوع کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس میں فساد و خونریزی کرے وہاں سے ارشاد ہوا تم نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں اور پھر آدم سے ان کو زک دلوائی اور حکم دیا کہ فرشتے آدم کو سجدہ کریں۔ کہتا ہے کہ ہم آج دنیا میں اس قدر کیوں ذلیل ہیں کل تک تو ہماری ایسی عزت تھی۔ (یادگار غالب)

شعر (۳) سماع۔ سننا۔ اصطلاح صوفیائے کرام میں عشق الٰہی اور راز و نیاز کے مضامین جو خوش گلو قوالوں سے سنے جائیں، چنگ و رباب سازوں کے نام ہیں۔ چونکہ بوقت سماع حالت وجد میں اکثر سامعین کی روحیں شوق ملاقات کے جذبہ سے متاثر ہو کر پرواز کر جاتی ہیں لیکن مرزا صاحب ایک عجیب پیرایہ میں بطور استفہام و تنبیہ سامع فرماتے ہیں کہ اگر چنگ و رباب میں خدا ہی کی آواز سنائی ہوتی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس کی سماعت سے سامعین کی جان ہوا ہو

جاتی ہے کیونکہ اس کی صدا تو جان بخش اور روح افزا ہے۔ مولانا نظم کا شعر بھی اس رنگ میں خوب موزوں ہوا ہے۔

صدائے چنگ سے مجھ کو یہی آواز آتی ہے
کوئی کہتا ہے اب پردے سے ہم باہر نکلتے ہیں

شعر (۴) رخش۔ گھوڑا۔ اس شعر میں انسان کی مجبوری کی طرف اشارہ ہے سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اسکے قابو سے باہر ہو جانا چابک سواروں کی زبان اس سے بہتر نہیں بیان ہو سکتا اور عمر کو ایسے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینا حسن تشبیہ کا حق ادا کر دیا ہے۔ (یادگار غالب)

شعر (۵) حقیقت، اصلیت، بعد۔ دوری۔ غیر۔ ماسوائے خدا۔ یہ شعر بھی عین تصوف اور وحدت الوجودی رنگ میں ہے مطلب یہ ہے کہ جتنا مجھے غیریت کا وہم اور دھوکا ہے اور غیر کو سمجھتا ہوں اتنا ہی میں اپنی اصلیت سے دور ہوں۔ اس شعر کی تشریح نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ تلمیذ حضرت مومن کے ان اشعار سے بخوبی ہو سکتی ہے ؎

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا   وہ سایہ ہوں جو محو ہوا آفتاب میں
سالک کی یہ مراد کہ مجھ سا ہو نفس بھی   رہزن کی یہ مراد کہ رہرو ہو خواب میں
سب اس میں محو اور وہ سب سے علیحدہ   آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں

شعر (۶) یہ شعر بھی مرزا صاحب کے شعر بالا ہی کی طرح سراسر تصوف اور وحدت الوجود کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ شہود کے معنی ہیں حاضر ہونا۔ دیکھا جانا اور اصطلاح تصوف میں وہ حالت جو مراتب کثرت سے گزر کر مقام توحید عیانی پہنچ جائے اور تمام خلق میں صورت خالق نظر آئے اور شاہد کے معنی حاضر، دیکھنے والا۔ مشہود جو چیز دیکھی جائے۔ مشاہدہ۔ دیکھنا۔ حاضر ہونا۔ روبرو ہونا۔ وغیرہ۔

اس شعر کی شرح جناب طباطبائی صاحب نے بہت خوب فرمائی ہے یعنی جب تمام عالم بوجود واحد موجود ہے تو شاہد و مشہود ایک ہی ہوئے اور ایک کے سوا دوسرا موجود نہیں ہے اور اس کا بھی وجود و شہود کوئی شے عارضی نہیں ہے بلکہ وجود عین ذات موجود ہے اسلئے کہ اگر ذات میں اور وجود میں مغائرت ہو تو ذات اسکے وجود کی طرف محتاج

ہوگی اور اس کا ازلی و ابدی اور سرمدی ہونا ثابت نہ ہوگا۔ غرض کہ وجود شہود بھی عین شاہد و مشہود ہے اور مشاہدہ میں مغائرت ہونا ضرور ہے اور جب مغائرت ہی یہاں نہیں تو پھر مشاہدہ کیسا جس کی امید آخرت میں لوگ رکھتے ہیں لیکن کہنے والے یوں بھی کہتے ہیں ؎

جب تک کہ حجابات ہستی میں مقید ہیں
یہ رنگِ شہود اس کا دھوکہ نظر آتا ہے

شعر (۷) مشتمل۔ شامل ہونے والا۔ چاروں طرف احاطہ کرنے والا۔ نمود۔ ظہور۔ صور۔ جمع صورت یہ شعر بھی دراصل شعر بالا ہی کی تفسیر ہے، مطلب یہ ہے کہ قطرہ و موج و حباب کی دراصل کوئی ہستی نہیں اور یہ جو مختلف صورتیں نظر آرہی ہیں دراصل وجود بحر کا پتہ دیتی ہیں۔ اس شعر کی تشریح مندرجہ ذیل اشعار سے بخوبی ہوسکتی ہے ؎

میں نے جو نظر ڈالی عرفان حقیقت میں
توحید کا دریا بھی قطرہ نظر آتا ہے
وحدت کی نظر والے توحید کے عاشق ہیں
وہ جلووں کی کثرت میں یکتا نظر آتا ہے
ساقی کی محبت کا دریا ہے وہ بے پایاں
ہر قطرہ یہاں مجھکو دریا نظر آتا ہے

شعر (۸) اس غزل کے پے درپے اکثر اشعار صوفیانہ توحید سے رنگین و متکیف ہیں اس شعر کا یہ مطلب ہے کہ شرم اک ادائے معشوقانہ ہے اور یہ کمال ناز میں داخل ہے کہ اگر کوئی غیر بھی موجود نہ ہو تو خود بخود شرمائے جا رہے ہوں لیکن انکی حجاب یعنی پردے میں رہنے کی غرض یہ ہے کہ وہ آزاد رہیں اور وہ اگرچہ حجاب میں ہیں مگر ان کا یہ حجاب بھی ایک قسم کی بے حجابی ہے کیونکہ حجاب کرنے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ کوئی انکی ادائے معشوقانہ نہ دیکھنے پائے لیکن عاشق سے اس طرح چھپ جانا بھی ایک کھلی ادا ہے پس ایسے حجاب میں ضرور بے حجابی پائی جاتی ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے بھی اس خیال کو بہت اچھے پیرایہ میں ظاہر فرمایا ہے ؎

چھپے جو مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی
وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری

شعر (۹) آرائش جمال۔ بناؤ سنگار۔ دائم ہمیشہ۔ مطلب یہ ہے کہ گو میرا محبوب ایک پردہ نشین معشوق ہے اور اسے ضرورت نہیں کہ کوئی اسکے حسن و جمال سے بہرہ اندوز ہو لیکن وہ پھر بھی اپنے بناؤ سنگار سے فارغ نہیں مولانا طباطبائی صاحب فرماتے ہیں کہ نقاب استعارہ ہے عالم قدس سے اور آئینہ اس میں ماکان و مایکون ہے اور آرائش جمال سے فارغ نہ ہونا کل یوم ہو فی شان ہے۔

شعر (۱۰) مولانا حالی اس شعر کی شرح میں فرماتے ہیں کہ تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آنے اس کو شہود کہتے ہیں اور غیب الغیب سے مراد مرتبہ احدیت ذات ہے جو عقل و ادراک بصر و بصیرت سے وراء الورا ہے کہتا ہے کہ جس کو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں وہ درحقیقت غیب الغیب ہے اور اسکو غلطی سے شہود سمجھنے میں ہماری ایسی مثال ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ خواب ہی میں ہے یہ مثال بالکل نئی ہے اور اس سے بہتر مثال اس مضمون کیلئے نہیں ہو سکتی۔

شعر (۱۱) بوتراب۔ کنیت حضرت علیؓ کی۔ ندیم۔ مصاحب ہمنشین۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت علیؓ چونکہ خدا کے مصاحب ہیں اور مصاحب ہمنشین بھی میرے دوست کے۔ اور دوست سے مراد اس جگہ خداوند تعالیٰ کی ذات پاک ہے اسلئے حضرت علیؓ کی بندگی کرنا دراصل خدا کی بندگی کرنا ہے اسی قسم کا مضمون ناسخ نے بھی ایک جگہ لکھا ہے ؎

بیعت خدا سے ہے مجھے بالواسطہ نصیب
دست خدا ہے نام مرے دستگیر کا

چونکہ حضرت علیؓ کو ید اللہ بھی کہتے ہیں اس لحاظ سے اس جگہ دست خدا سے مراد حضرت علیؓ ہیں لیکن ہماری رائے میں یہ شعر غلط ہے یہ دعویٰ اور یہ شعر اس صورت میں صحیح ہو سکتا تھا اگر حضرت علیؓ کی زندگی میں ناسخ صاحب نے حضرت علیؓ سے بیعت کی ہوتی۔

(۹۶) حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں ۱ مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ۲ ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار ۳ اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں
ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے ۴ کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ بے نام و ننگ ہے ۵ یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دیر ہر اک تیز رو کے ساتھ ۶ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار ۷ کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں
پھر بیخودی میں بھول گیا راہ کوئے یار ۸ جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا ۹ سمجھا ہوں دلپذیر متاع ہنر کو میں

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
۱۰۔ دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

شعر (۱) نوحہگر۔ بحالت ماتم وغم چلا کر رونے والا مطلب یہ ہے کہ میرے دل وجگر دونوں زخمی ہو چکے ہیں اب میں حیران ہوں کہ دل کا رونا روؤں یا جگر کا ماتم کروں اور نہ ہی بوجہ مفلسی مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ اُجرت دے کر کسی ماتم کرنے والے کو بلاؤں۔

شعر (۲) مطلب یہ ہے کہ تیری محبت میں رشک یعنی رقابت کا خیال اور جذبہ اس قدر میرے رگ و پے اور دل و دماغ میں سرایت کر گیا ہے کہ میں کسی سے تیرے گھر کا نام لیکر پتہ دریافت کرنا بھی باعث رشک و رقابت سمجھتا ہوں اور بحالت اضطراب دیوانوں کی طرح ہر ایک سے یہ پوچھتا ہوں کہ میں کدھر کو جاؤں)؟

شعر (۳) مطلب یہ ہے کہ جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تیری نشست و برخاست اب رقیب خانہ خراب ہی کے گھر پر رہتی ہے تو ناچار بار بار تیری تلاش میں مجھے رقیب ہی) کے گھر آنا پڑا۔ افسوس صد افسوس مجھے یہ معلوم ہی نہ ہوتا کہ تیری آمد و رفت اسکے گھر میں ہے اور مجھے یہ راستہ ہی معلوم نہ ہوتا کہ مجھے ایسی ذلت برداشت نہ کرنی پڑتی۔ حضرت مومن مرحوم نے اس خیال کو اور بھی نہایت عمدہ پیرایہ میں بیان کیا ہے ؎

اس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

شعر (۴) کمر کسنا، کمر باندھنا کسی اہم کام اور مہم کی تیاری کے لئے ہوا کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ معشوق جو مجھے یہ دھمکی دے رہا ہے کہ میں تمہارے قتل کے لئے کمربستہ ہو گیا ہوں تو ایسی جھوٹی دھمکیوں سے میں بلا ڈرے کیا مجھے معلوم نہیں کہ میرے معشوق کے تو کمر ہی نہیں وہ کیا کس کر باندھے گا؟

شعر (۵) مطلب ہے کہ جس بیوفا کی خاطر ہم دنیا میں بے ننگ و نام ذلیل اور رسوا ہوئے تباہ و برباد ہوئے اب وہ بھی ہمارا واقف نہیں بنتا اور ہم سے دور بھاگتا ہے بلکہ الٹا ہم پر طعن کرتا ہے کہ اس بے ننگ و نام سے میرا کیا واسطہ؟ شاعر کہتا ہے کہ افسوس اگر مجھے پہلے ان باتوں کا علم ہوتا تو میں اپنا گھر تباہ و برباد نہ کرتا۔

شعر (۶) طالب راہ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے اسکو اس تمثیل میں بیان کیا گیا ہے طالب، اول اول جس شخص میں کوئی کرشمہ یا وجد و سماع و جوش و خروش دیکھتا ہے اسکے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور اسکے ساتھ ساتھ پھرتا ہے پھر جب کوئی اس سے بڑھ کر نظر آتا ہے تو اس کا تعاقب کرتا ہے اور وجہ اس تذبذب اور تنزلزل کی یہی ہوتی ہے کہ وہ کاملین کو پہچان نہیں سکتا۔ (یادگار غالب)

مولانا نے جو شرح فرمائی ہے وہ صحیح ہے، لیکن ہماری رائے میں تو مرزا غالب نے آج سے بہت عرصہ پیشتر آج کل کے لیڈروں اور لیڈرگروں کے افعال و حرکات کا صحیح چربہ اتار کر رکھ دیا ہے۔

شعر (۷) بطور طنز مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ لوگ کیسے جاہل و نادان ہیں کہ اپنی خواہشات نفسانی کی بنا پر میری نسبت بھی یہی خیال کئے بیٹھے ہیں کہ میں بھی انہیں کی طرح کسی جذبۂ نفسانی کے ماتحت اس بت کی پوجا کر رہا ہوں یعنی میری محبت صادق کو وہ پرستش قرار دے رہے ہیں حالانکہ میری محبت جو پرستش کے درجہ تک پہنچ گئی ہے یہ تو ایک کمال خلوص کا نمونہ ہے یا میں اسے بت سمجھ کر پوجا ہی نہیں کرتا۔ بقول شخصے ؎

اللہ کی پرستش اس بت نے ہے سکھائی   وہ تو خدا کا گھر ہے بیت الصنم نہیں ہے

یاس
دنیا نے اُنھیں دیکھا ہے معشوق سمجھ کر
پر مجھ سے نہ پوچھو کہ وہ کیا کچھ نظر آئے

شعر (۸) بیخودی۔ اپنے آپ میں نہ ہونا اپنے ہوش و حواس کو گم کر دینا۔ مطلب یہ ہے کہ میں پھر ایک دفعہ اسکے کوچے میں جاکر اپنے ہوش و حواس کھو آیا ہوں اور مجھے معلوم نہیں کہ میں اب کہاں ہوں اور کوچۂ یار کہاں ہے اسلئے اب اپنے ہوش و حواس اور دل و جان کی بھی خبر نہیں لا سکتا کہ ان پر وہاں کیا گذری اور وہ کس حال میں ہیں جیسے یہ کہا گیا ہے ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

شعر (۹) اپنے پہ یعنی اپنے آپ پر۔ اہلِ دہر۔ اہلِ زمانہ، مرغوب۔ دلپسند۔ متاع۔ سامان نفع بخش مطلب یہ ہے کہ میں اپنی غلط فہمی سے دوسرے اہلِ دنیا کو بھی اپنے جیسا سمجھ رہا ہوں یعنی جس طرح میں علم دوست ہوں اور اہلِ فن کی عزت و قدر کرنا ضروری سمجھتا ہوں دوسرے لوگ بھی شاید ایسے ہی ہونگے بلکہ اس زمانہ میں متاعِ ہنر ایسی عزیز جنس نہیں کہ لوگ اہلِ ہنر کی قدر کریں بقول شخصے ع

اب شخصیت کی قدر ہے قدرِ ہنر گئی

شعر (۱۰) سمندِ ناز۔ اٹکھیلیوں سے اور خراماں خراماں چلنے والا گھوڑا۔ عالی گہر۔ بلند مرتبہ، عالی نسب بہت بڑی ذات والا۔ یہ ایک عاشقانہ شعر ہے۔ علی بہادر کوئی مرزا غالب کے ممدوح ہونگے باقی مطلب صاف ہے۔

(ں ۹) ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں ۱ غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں
وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق ۲ مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں
شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم ۳ لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ۴ ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی ۵ عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں
میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمہیں ۶ کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں
ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہے ۷ تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں
صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ ۸ وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
۹- میرے دعوی پہ یہ حجّت ہے کہ مشہور نہیں

شعر (۱) مطلب یہ ہے کہ اس ظالم کو مجھ سے ایسی عداوت اور دشمنی ہو گئی ہے اور میرے نام اور ذکر سے ایسی چڑ اور ضد ہے کہ اگر کوئی برائی اور شکایت کے ساتھ بھی ذکر کرے اور نام لے تو اُسے سننا گوارا نہیں اور چونکہ میرے رقیب کی یہ عادت میں داخل ہے کہ ہر وقت میری برائی اسکے سامنے کرتا رہتا ہے تو کیا عجب ہے کہ میرے رقیب کی الٹا اس کی اس بات پر بگڑ جائے۔ بقول شخصے ؎

اس حالتِ ابتر میں پنہاں ہے تبختر کیا
وہ میری سفارش ہے غیروں کی شکایت بھی

شعر (۲) خوشا۔ بہت خوشی کی بات ہے۔ الف آخر میں واسطے افادہ معنی کثرت کے ہوا کرتا ہے طالع قسمت، نصیب، مژدہ۔ خوشخبری۔ مقدر۔ وہ چھوڑا ہوا اور پوشیدہ لفظ جو عبارت میں بوقت تحریر لکھا نہ جائے لیکن اسکے معنی لئے جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس نے میرے ساتھ ملکر سیر چمن کا وعدہ کیا ہے اور میں بھی یہی چاہتا تھا کہ کسی دن مجھے یہ بات حاصل ہو اگر واقعی اس کا یہ وعدہ سچا ہے تو یہ میرے شوق دل کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ درپردہ لفظ مقدر کی طرح اسے میرا قتل کر دینا منظور ہے جس کا اس نے ذکر نہیں کیا خیر کچھ بھی ہو مجھے یہ بھی منظور ہے۔

شعر (۳) شاہد معنی معشوق۔ ہستی مطلق۔ ذات باری تعالیٰ۔ مولانا حسرت فرماتے ہیں کہ شاعر نے

دنیا کے موہوم ہونے کی یہ علت بیان کی ہے۔ کہتے ہیں کہ عالم شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے اور اس سے انکی یہ مراد ہوتی ہے کہ جیسے شاہد کی کمر نہیں ہوتی اسی طرح وجود عالم بھی موہوم ہے لیکن ہم کو یہ بھی منظور نہیں ہے کیونکہ جب کہتے ہیں کہ عالم شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے تو اگرچہ اسکے یہی معنی ہوتے ہیں کہ عالم معدوم ہے لیکن "ہے" جو لفظ اثبات ہے کا لفظ شے معدوم کیلئے کسی طرح استعمال کرنا نہیں چاہیے۔

شعر (۴) تنگ ظرفی۔ کم ظرفی، برتن کا چھوٹا ہونا۔ مطلب ہے کہ ہماری ہستی بھی جو بظاہر ایک قطرہ معلوم ہوتی ہے۔ حقیقت میں دریا ہے کیونکہ قطرہ دریا سے جدا نہیں لیکن ہم یہ بھی مناسب نہیں سمجھتے کیونکہ منصور نے تنگ ظرفی کی بنا پر نعرۂ انا الحق لگانا شروع کر دیا تھا ہم بھی اپنے آپ کو انا البحر کہنے لگتے یعنی دعویٰ خدائی کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ حضرت خواجہ سید بہاء الدین شہنشاہ نقشبند فرماتے ہیں کہ اگر عزیزان کی زنبیلی کے مریدوں میں سے کوئی شخص منصور کے زمانہ میں ہوتا تو منصور کا قصہ زبان دار تک جانا مرید سے یہاں انکی اپنی ذات مراد ہے یعنی آپ فرماتے ہیں کہ اگر میں منصور کے زمانے میں ہوتا تو منصور کو اس مقام سے نکال لیتا۔

دراصل یہ ایک حالت اور مقام ہوتا ہے جس میں سے سالک کو ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ بلند استعداد والے تو اس مقام سے آگے نکل جاتے ہیں لیکن تھوڑی استعداد والے اسی میں پھنسے رہتے ہیں اور اپنے آپ کو خدا کہنے لگ جاتے ہیں حالانکہ اس حالت کو دوام اور قرار نہیں لیکن عوام بھی انکے اس مستی و ذوق کی حالت کے کلام کو دوام پر محمول کر لیتے ہیں جو صریح غلطی ہے۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اگر لوہے کو آگ میں ڈال دیا جائے تو وہ کچھ عرصہ آگ میں رہنے کے باعث آگ کے خواص ضرور پیدا کرے گا اور اس حالت میں ہم لوہے کو بھی آگ ہی کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس وقت آگ اور لوہے میں کوئی مغایرت نظر نہیں آتی لیکن لوہا جب ٹھنڈا ہو جائے تو ہم اسے آگ نہیں کہہ سکتے۔

شعر (۵) عربدہ۔ جنگجوئی۔ گوں۔ ڈھب۔ مطلب ہے کہ عشق خانہ خراب نے مجھے ایسا ناتوان و کمزور کر دیا ہے کہ میں اب اس جنگجو کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور اپنی اس بے بسی پر مجھے افسوس ہے کیونکہ اب صعوبات

سختی برداشت کرنے کی مجھ میں طاقت ہی نہیں رہی ۔

شعر (۶) رعونت ۔ غرور و تکبر ۔ سرکشی ۔ مطلب یہ ہے کہ میں اس سے چھیڑنے کی غرض سے کہتا ہوں کہ قیامت میں تو ہمارے ہی قبضہ میں ہوگا ۔ تو وہ عجب غرور سے کہتے ہیں کہ میں بھی کوئی حور ہوں جو تو مجھے حاصل کریگا یعنی ہماری شان کچھ حور سے بھی بڑھ کر ہے ۔ ایک اور جگہ مرزا صاحب کہتے ہیں ؎

ان پری زادوں سے لینگے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

شعر (۷) دریغ ۔ حسرت و افسوس ۔ تکلیف ۔ تغافل ۔ غفلت ۔ تمام شارحین کلام غالب نے لطف دریغ کے قریب قریب یہی معنی کئے ہیں کہ "اگر تجھے لطف و مہربانی کرنے میں کچھ تکلیف محسوس ہوتی ہے حالانکہ یہ معنی اسوقت پیدا ہو سکتے تھے جب "لطف دریغ" کی بجائے "دریغ لطف" ہوتا ۔ ہماری رائے میں اس شعر کے معنی یہ ہیں کہ اگر مجھے تکلیف پہنچانے ہی میں تجھے لطف حاصل ہوتا ہے تو ظلم ہی کر ۔ کیونکہ بجائے مہربانی کرنے کے تجھے ظلم کرنے میں تو کوئی عذر نہیں ہو سکتا ۔ پس تو تغافل سے کام نہ لے تیرا شیوہ ستم سے تغافل ہمیں پسند نہیں میں اسکو تیری مہربانی سمجھوں گا کہ تو نے مجھ پر ظلم کیا اور لوگ بھی کہیں گے کہ ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

شعر (۸) دُردی ۔ شراب کی تلچھٹ ۔ پیمانۂ جم ۔ جام جمشید ۔ وائے ! افسوس ۔ بادہ ۔ شراب افشردہ نچوڑ ۔ مطلب یہ ہے کہ شراب انگوری چونکہ بادشاہ جمشید کی ایجاد کردہ ہے ہم اسی کے پیرو ہیں یعنی شراب انگوری ہی پیتے ہیں خواہ اسکی تلچھٹ ہی کیوں نہ ملے بھلا وہ بھی کوئی شراب ہے کہ جو انگور کا نچوڑ نہ ہو ۔ ایک طرح سے نہیں ہر ایک دوسری شراب کی حالت پر افسوس بھی آتا ہے کہ ہم نے اسے منہ نہیں لگایا ۔

شعر (۹) ظہوری شعرائے ایران میں ایک بہت بڑے پایہ کا شاعر گزرا ہے اور مرزا غالب کو اس کا

رنگ بہت مرغوب تھا۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ میں زیادہ مشہور نہیں ہوں اسلئے مجھے خفائی سمجھنا چاہیئے۔ یعنی ظہوری کا مدمقابل خفائی بمعنی مخفی۔ اس شعر میں لفظ ظہوری اور خفائی کا لفظی تقابل ہے۔ ازراہ حسنِ عقیدت ظہوری کی نسبت مرزا صاحب فارسی میں لکھتے ہیں ؎

بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالبؔ
رگ جاں کردہ ام شیرازہ اوراق کتابش را

---

(۹۸) نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں ۱ ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں
عشق و مزدوریِ عشرتگہِ خسرو کیا خوب ۲ ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم ۳ دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب ۴ لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں
وائے محرومیِ تسلیم و برا حالِ وفا ۵ جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں
رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے ۶ گر چراغانِ سرِ راہگذرِ باد نہیں
سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں ۷ مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں
نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا ۸ دی ہے جائے دہن اسکو دمِ ایجاد "نہیں"
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت ۹ یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
۱۰ تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

شعر (۱) مطلب ہے کہ اے ظالم معشوق! میں جو نالہ فریاد و آہ و فغاں کا شور اٹھائے رکھتا ہوں تو یہ اسلئے نہیں کہ معاذ اللہ مجھے تیری شکایت مدِنظر ہے نہیں نہیں میری فریاد میں بھی ایک قسم کا حسنِ طلب پنہاں ہے

یعنی میں چاہتا ہوں کہ تو مجھ پر اور بھی ظلم کرے پس جب میں کثرت سے نالہ کرونگا تو تو اور بھی برہم ہو کر مجھ پر جفا کرے گا۔

شعر (۲) یہ شعر بطور طنز و تشنیع کہا گیا ہے یعنی یہ بات جو لوگوں میں مشہور ہو چکی ہے کہ فرہاد نے یہ بہت بڑا کام کیا کہ اُس نے خسرو کے عشرتکدے کیلئے پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالی تاکہ فرہاد کو اسکے معاوضہ میں شیریں کا وصل نصیب ہو اور فرہاد نے یہ جو کچھ کیا عشق صادق کے جذبہ کی بنا پر کیا اور فرہاد یہ کارنمایاں کرکے کوئی نیک کام کر گیا۔ سچ پوچھئے تو ہمیں اس سے قطعی انکار ہے کیونکہ یہ ایک غیور عاشق کی شان کے خلاف ہے کہ وہ اپنے رقیب کے عشرتکدہ کی تکمیل کیلئے اپنی جان کو مصیبت میں ڈالے۔ ہم تو اسے مزدوروں کا کام سمجھتے ہیں۔

شعر (۳) یعنی میرا گھر بھی ویران و خراب ہونے میں جنگل سے کم نہیں لیکن اتنا وسیع نہیں کہ میرے جیسا دیوانہ اس میں آزادی سے دشت نوردی کر سکے پس میں اسی لئے جنگل میں مارا مارا پھرتا ہوں اور اس میں جو مجھے وہ عیش حاصل ہے کہ مجھے اپنا گھر یاد ہی نہیں رہا۔ لیکن حضرت مومن اسکے برعکس فرماتے ہیں ؎

جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں
کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی

شعر (۴) لطمۂ موج۔ موج کا تھپیڑا۔ سیلی۔ طمانچہ۔ حوادث۔ مصائب۔ مکتب۔ مدرسہ۔ اہل بینش۔ عقلمند۔ مطلب یہ ہے کہ سمجھ دار لوگ کثرت حوادث سے ناراض ہو کر ہمت نہیں ہار دیا کرتے بلکہ یہ آفتیں انہیں درس عبرت کا کام دیتی ہیں اور طوفان حوادث کا ہر ایک تھپیڑا انہیں استاد کا طمانچہ معلوم ہوتا ہے۔

شعر (۵) محرومی۔ ناکامی۔ بُرا حال۔ بدحالی۔ مطلب یہ ہے کہ ہم جو تسلیم و رضا کے خیال سے اُس کے مظالم پر صبر کرتے اور وفاداری سے مُنہ نہیں موڑتے لیکن افسوس ہے ہماری اس ناکامی تسلیم اور بدحالی ذوق کہ اُس نے ہمارے صبر و وفا کو تسلیم ہی نہیں کیا بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ہم فریاد کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے۔

شعر (۶) چراغ راہگذر باد۔ وہ چراغ جو ہوا کے راستہ میں رکھا ہو۔ تمکین۔ مجازاً قدر و منزلت

مطلب ہے کہ اگر گل و لالہ تیز ہوا میں جلنے والے چراغوں کے مانند نہیں تو کیا وجہ ہے کہ انکی رنگت اتنی جلدی اڑ جاتی ہے۔ پریشانی رنگ سے رنگ کا اڑنا مراد ہے اور رنگین گل و لالہ سے جلوہ و رونق بھی مراد ہے۔

شعر (۷) سبد۔ ٹوکرا۔ تلے۔ نیچے۔ گلچین۔ پھول توڑنے والا۔ مژدہ۔ خوشخبری۔ صیاد۔ شکاری۔ مطلب ہے کہ اے بلبل تیرے لئے خوشی کا موقع ہے کہ تجھے جس نے گرفتار کیا ہے وہ صیاد نہیں بلکہ گلچیں ہے اور اس کی قید بھی تیرے لئے خوشی کا محل ہے کہ اس نے بجائے قفس میں بند کرنے کے پھولوں کے ٹوکرے میں بند کیا ہے اگرچہ تو قید ہے لیکن پھولوں کی صحبت تجھے حاصل ہے بیشک ایسی قید تو ہر عاشق کیلئے بہجت و وصل ہے کہ جس میں اس کا معشوق بھی موجود ہو۔

شعر (۸) نفی۔ نہیں، اثبات۔ ہاں۔ ثابت کرنا۔ تراوش۔ ٹپکنا۔ دم ایجاد۔ پیدائش کے وقت جائے دہن سے مراد بجائے دہن ہے مطلب ہے کہ میرا معشوق جو ہر بات کے جواب میں نہیں نہیں کہتا ہے کیا اس کو پیدائش کے وقت دہن کی بجائے صرف نہیں ملی لیکن اسکے نہیں کہنے سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ اسے ضرور کوئی چیز ملی ہے جس سے نہیں کا لفظ ادا کرتا ہے۔

شعر (۹) جلوہ گری سے مراد اس جگہ حسن و آرائش ہے مطلب ہے کہ بہشت کا نقشہ اگرچہ تیرے کوچہ ہی کے مانند ہے لیکن پھر بھی وہ تیرے کوچہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا کیونکہ جو رونق تیرے کوچہ میں ہے وہ اس میں نہیں تیرے کوچہ میں ہر وقت ہجوم عشاق رہتا ہے اور وہاں یہ بات نہیں ہے۔

شعر (۱۰) غربت۔ مسافرت، بے مہری۔ ناقدردانی۔ سنگدلی۔ بے پروائی مطلب ہے کہ اے غالب اگر پردیس میں بوجہ ناواقفیت تیرے کمال کی لوگ قدر نہیں کرتے تو تمہیں انکی اس بے توجہی پر نالاں نہیں ہونا چاہیئے اور انکی شکایت نہیں کرنی چاہیئے کیا تمہیں اپنے اہل وطن کی کرتوت یاد نہیں؟ انہوں نے تیرے ساتھ کون سا اچھا سلوک کیا تھا اور تیری کیا عزت و قدر کی تھی۔ فاقوں پر فاقے تجھے آتے رہے۔ قرضخواہوں نے عدالتوں میں تمہیں کھنچوایا۔ قید خانہ بھجوایا وغیرہ وغیرہ اسی مضمون کا ایک شعر پہلے بھی گزر چکا ہے۔

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

---

(۹۹) دونوں جہان دیکے وہ سمجھے کہ خوش رہا ۱ یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے ۲ تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم ۳ ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کریں

شعر (۱) دونوں جہان سے مراد دنیا و آخرت۔ مطلب یہ ہے کہ بظاہر تو یہ بڑی بات معلوم ہوتی ہے کہ خدا نے ہمیں دونوں جہان دیدیئے لیکن دیکھنے کی بات ہے کہ اس جہان یعنی دنیا میں ہمیں کس قسم کی راحت اور آرام ملا۔ بچپن میں دوسروں کے محتاج۔ ہوش سنبھالا تو فکرِ معاش۔ غمِ روزگار۔ بیوی بچوں کے تفکرات۔ بیماریاں۔ مصیبتیں۔ ضعیفی میں بیچارگی۔ اب دوسرے جہان کو لیجیئے کہ مدتوں قبر میں سڑتے گلتے رہو۔ پھر پل صراط، یوم الحساب، ہنگامۂ محشر، دوزخ کا کھٹکا۔ کیا کیا مصیبتیں ہیں ہماری خاموشی پر اس نے سمجھا کہ انسان غالباً اسی پر خوش ہے لیکن یہ تو ہماری شانِ عبودیت ہے کہ ہم اس پر چپ ہو گئے اور خیال کیا کہ اپنے خالق و مالک اور معبود کے سامنے تکرار کرنا شیوۂ عبودیت نہیں اور ہمیں شرم آگئی کہ ہمارا حق ہی کیا ہے کہ جو اس کے بجائے کچھ اور مانگیں یا زیادہ طلب کریں۔ قناعت ہی اچھی ہے۔

شعر (۲) ہر مقام سے مراد اس جگہ مقاماتِ سلوک و معرفت ہیں جو اہلِ تصوف و حقیقت کو طے کرنے پڑتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تیری تلاش و جستجو میں جس قدر اہلِ طلب نکلے وہ اصل منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکے حسبِ استعداد و طاقت کوئی کسی مقام میں تھک کر رہ گیا کوئی کسی مقام میں یعنی کوئی شبلی و منصور بن گیا اور کوئی جنید و بایزید وغیرہ وغیرہ کیونکہ تیری ذات تک پہنچنا انسانی طاقت سے باہر ہے آخر یہ لوگ تھک کر نہ جائیں تو کیا کریں اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تیرا پتہ ملنا ہی ناممکن ہے۔ خواجہ میر دردؔ فرماتے ہیں ؎

شب و روز اسے درد دیرلے ہیں جس کے کسی نے بھی اس کو نہ سمجھا نہ دیکھا

اور یہ شعر بھی خوب ہے ؎

تجھ سے ملنے کا کوئی بھی راستہ ملتا نہیں
کون سا پتھر مری قسمت میں حائل ہو گیا

شعر (۳) مصرعہ اولیٰ میں استفہام اقراری ہے۔ ہوا خواہ۔ خیر خواہ۔ مطلب یہ ہے کہ کیا ہم اہل محفل شمع سوزاں کے خیر اندیش نہیں ہیں یعنی ہمیں اسکے گھل گھل کے جان دینے پر اور اسکے گریہ غم پر ضرور رحم آ رہا ہے لیکن کیا کریں یہ مرض ہی ایسا اور یہ غم ہی روح فرسا ہے کہ اس کا کوئی علاج اور مداوا نہیں ہو سکتا غمخواروں کے بنائے کچھ نہیں بن سکتا اور اسکی جانگدازی ہم معنی موت ہے۔ مرزا صاحب خود ایک اور جگہ لکھتے ہیں ؎

درد ہو تو دوا کرے کوئی مرنے والے کا کیا کرے کوئی

(۱۰) ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اسکو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

شعر (۱) مطلب یہ ہے کہ چونکہ چالاک رقیب میرے معشوق کے بہت منہ لگا ہوا ہے اور ہر وقت میٹھی میٹھی باتیں کر کے اور محبت کے بہت بڑے دعووں سے اسے اپنے بس میں کر لیا ہے اور ہم چونکہ خاموش رہتے ہیں اور چرب زبانی و لسانی سے کام لینا عشق و محبت کے خلاف سمجھتے ہیں اور اس اصول پر کاربند ہیں کہ ؎

چو درس عشق میخوانی کتاب نطق را طے کن
کہ ارباب محبت را زباں دانی زیاں دانی

لیکن ہمارا نادان معشوق اسے عدم محبت پر محمول کرتا ہے اور رقیب کی محبت کا قائل ہو گیا ہے اس شعر کو اگر عام دنیوی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ پہلو بھی صاف نکلتا ہے کہ فی زمانہ جو لوگ میٹھو حاکموں حتیٰ کہ مشائخ اور پیروں کے زیادہ منہ لگے ہوئے ہیں اور ہر وقت جھوٹی چرب زبانی سے اپنے خلوص اور کمال عقیدت و ارادت کا اظہار

کرتے رہتے ہیں وہی زیادہ مقرّب و مخلص سمجھے جاتے ہیں اور انہیں کو سب سے پہلے خلافتیں ملا کرتی ہیں اور رئیسوں سے بھی لسّان لوگ انعام و اکرام اور حکّام کی جھوٹی خوشامدیں کرکے بڑے بڑے عہدے اور خطاب حاصل کرتے ہیں۔

(۱۰۱) قیامت ہے کہ سُن لیلےٰ کا دشتِ قیس میں آنا ۱ تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں
دلِ نازک پہ اسکے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ ۲ نہ کر سرگرم اس کافر کو اُلفت آزمانے میں

شعر (۱) قیامت ہے۔ غضب ہے۔ افسوس ہے۔ سُن۔ سُنکر۔ مطلب یہ ہے کہ میرے غیور۔ پردہ نشین بے پروا معشوق نے جب مجھ سے یہ سُنا کہ لیلیٰ مجنوں سے ملنے کیلئے اس جنگل میں گئی کہ جہاں مجنوں رہا کرتا تھا تو وہ نہایت تعجب زدہ اور حسرت زدہ ہو کر پوچھنے لگا کہ کیا دنیائے عشق و محبت میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ معشوق خود چل کر عاشق کی ملاقات کیلئے جائے؟ ہمارے خیال میں تو مرزا غالبؔ کے معشوق کا تعجب کرنا صداقت پر مبنی ہے۔ لیلیٰ کا ملاقات مجنوں کے لئے آنا ایک اور شاعر نے بھی لکھا ہے یعنی ؎

کشش دکھائی وہ مجنوں کے عشقِ کامل نے
اِدھر خیال چلا اور اُدھر چلی لیلےٰ

لیکن ایک اور شاعر نے اس کا دنداں شکن جواب بھی دیا ہے ؎

غلط، غلط ہے سراسر غلط یہ جس نے کہا ”اِدھر خیال چلا اور اُدھر چلی لیلےٰ“
بھلا وہ سُوکھ کے ہوجاتا چوبِ صحرا کیوں کبھی جو قیس کو مل جاتی آن کر لیلےٰ

شعر (۲) اس جگہ سرگرم سے مراد آمادہ کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے غالبؔ تو اپنے معشوق کو اپنی اُلفت آزمانے کیلئے آمادہ نہ کر یعنی تیری اُلفت آزمائی تو اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ وہ تجھے قتل کرے اور دیکھے کہ تو قتل ہونے کیلئے سینہ سپر ہے یا نہیں؟ بقول شخصے ؎

تیغ لیکر آج ہی تم آزماتے کیوں نہیں مقتلِ عشاق میں سینہ سپر ہوتا ہے کون

یعنی مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ اُس کا دل بہت نازک ہے اور بحالت قتل جب وہ خون کے فوارے نکلتے دیکھے گا تو مارے ڈر کے اُس کا دل بیٹھ جائے گا پس مجھے اسکے نازک دل پر رحم آتا ہے ۔

(۱۰۷) دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا ۱ بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی دادیاں
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام ۲ مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیاں

شعر (۱) دل لگا کر۔ عاشق ہو کر مطلب یہ ہے کہ ہمارا معشوق بھی جو ہماری محبت کی داد نہیں دیتا تھا۔ بلکہ ہماری خلوت نشینی اور گریہ کا تمسخر اُڑایا کرتا اور اپنا وقت سیر و تفریح میں گزارا کرتا تھا آخر وہ بھی کسی پر عاشق ہو کر تنہا نشین ہو گیا اور ہماری طرح گریہ و غم کرتا ہے اور یہ جو کچھ ہے ہماری بیکسی اور صبر کی داد ہے۔

شعر (۲) زوال آمادہ۔ فنا ہو جانے والا۔ اجزا۔ سامان۔ آفرینش۔ پیدائش۔ دنیا۔ غرض اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان یا دنیا کا ذرہ ذرہ فنا ہونے کیلئے تیار کھڑا ہے یہاں تک کہ آفتاب بھی جو زمین سے کئی گنا بڑا ہے وہ بھی اس چراغ کی مانند ہے جو ہوا میں جل رہا ہے یعنی ہوا کا ایک ذرا کا جھونکا آیا نہیں کہ وہ گل ہوا۔

(۱۰۸) یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں ۱ کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے ۲ کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو ۳ یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
۴ ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

شعر (۱) صبا کو بھی عموماً شعرا پیغام بر تصور کیا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تو بحالت فراق شدت انتظار میں گھبرا کر بار بار کبھی دیوار کی طرف اور کبھی دروازے کی طرف دیکھتے ہیں تو اس سے دیوار و در دیکھنا مد نظر نہیں بلکہ دیوار کی طرف تو اسلئے دیکھتے ہیں کہ صبا جو اپنی لطافت کی وجہ سے ہر جگہ بلا روک پہنچ جاتی ہے اور کوئی چیز اسکی سد راہ نہیں ہو سکتی کہ دیوار سے گزر کر ہمارے محبوب کا پیغام ہم تک پہنچاتی ہے اور دروازہ کی طرف اس لئے

دیکھتے ہیں کہ کب نامہ بر ہمارے خط کا جواب لیکر آتا ہے یا دونوں میں سے کون پہلے آتا ہے۔

شعر (۲) یعنی یہ بات تو ایک طرح سے ناممکنات میں داخل ہے کہ ایک غریب عاشق کے تنگ و تاریک اور شکستہ و کہنہ مکان میں ایک امیرانہ ٹھاٹھ والا عالی مرتبہ معشوق کبھی جلوہ افروز ہو سکے معلوم ہوتا ہے کہ شاید کسی نے عاشق سے یہ جھوٹ بات کہدی ہو کہ تمہارے معشوق نے وعدہ کیا ہے کہ وہ تجھ سے ملنے کیلئے آئیگا تو اسی خیال سے عاشق کہتا ہے حیرت سے کبھی ہم محبوب کے جاہ و جلال کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی اپنے ٹوٹے پھوٹے مکان کی طرف دیکھتے ہیں۔

شعر (۳) مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو میرے سینے کے زخم کی گہرائی کو بار بار دیکھتے ہیں اور دل میں کہتے ہیں کہ باوجود نازنین و نازک اندام ہونیکے اُس نے ایک قاتل پرفن کی طرح کاری زخم لگایا ہے مجھے ڈر ہے کہ ان لوگوں کے اس حیرت و استعجاب سے میرے نازک اندام قاتل کے دست و بازو کو نظر بد نہ لگ جائے مجھے اپنے زخم کی تو کوئی پروا نہیں لیکن مجھے ان لوگوں کا اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا پسند نہیں مبادا میرے محبوب کو کوئی تکلیف پہنچے۔

شعر (۴) جواہر یعنی لعل و گوہر وغیرہ۔ طرف۔ گوشہ۔ کلہ۔ کلاہ۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تیرے گوشہ کلاہ کے لعل و گوہر کو نہیں دیکھ رہے شاید تو یہ سمجھتا ہو کہ یہ بہت قیمتی اور قدر و منزلت والی چیزیں سمجھ کر ہم دیکھ رہے ہیں نہیں نہیں بلکہ ہم ان جواہر کے نصیبوں وہ خوش قسمتی کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ ان کو بھی تیرے گوشہ کلاہ تک رسائی کی عزت اور مرتبہ مل گیا۔

(۴۰) نہیں کہ مجھکو قیامت کا اعتقاد نہیں ۱ شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں
کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے ۲ بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں
جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں ۳ جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیرباد نہیں
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں ۴ کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں
علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب ۵ گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام ۶ دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالبؔ
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں ۷

شعر (۱) روزِ جزا۔ قیامت کا دن۔ مطلب یہ ہے کہ میرا طول قیامت اور اس کی سختیوں پر ضرور اعتقاد ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی عقیدہ رکھتا ہوں کہ میری شبِ فراق کی درازی کے مقابلہ میں قیامت کا دن زیادہ ہولناک اور زیادہ طویل نہیں۔

شعر (۲) شبِ ماہ۔ چاندنی رات۔ ابر و باد۔ کالی گھٹاؤں اور ٹھنڈی ہواؤں کا چلنا مطلب یہ ہے کہ یہ مانا کہ ابر و باد میں بادہ نوشی کا زیادہ لطف آتا ہے اور آج وہ بات حاصل نہیں لیکن رات کو تو ضرور چاندنی نکلیگی اور شبِ ماہ میں بھی شراب نوشی کا خوب لطف حاصل ہوتا ہے گویا چاندنی رات ابر و باد کا نعم البدل ثابت ہوگی

شعر (۳) مرحبا۔ شاباش۔ یہ لفظ عرب میں مہمان کی تعظیم کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ خیر باد۔ انجام اچھا ہو، یہ رخصتی دعا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا معشوق میرے ساتھ اس بے توجہی۔ و عدم التفات اور اجنبیت سے پیش آتا ہے کہ اگر کبھی شوق سے اسے ملنے جاؤں تو اتنا بھی نہیں کہتا کہ آئیے تشریف لائیے اور دل برداشتہ ہو کر اٹھ آتا ہوں تو اتنا بھی نہیں کہتا کہ ذرا اور بیٹھو یا خدا حافظ تک نہیں کہتا۔

شعر (۴) مطلب یہ ہے کہ اول تو وہ تغافل شعار اور شرارت پسند کسی کو اپنی محفل میں یاد ہی نہیں کرتا اور اگر کبھی بھولے سے یاد بھی کرے تو اس شوخی سے یاد کرتا ہے کہ آج ہماری محفل میں کچھ گرمی نہیں فتنہ و فساد نہیں شاید وہ جنگجو۔ لڑاکا۔ رقابت کے جھگڑے پیدا کرنے والا نہیں آیا۔

شعر (۵) عموماً عید کے دن اس گھر سے بھی کچھ نہ کچھ خیرات مل جاتی ہے کہ جس گھر سے دوسرے دنوں میں فقیر کو کبھی خیرات نہ ملی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ کوچۂ میخانہ ہی وہ اہلِ سخاوت کا کوچہ ہے کہ جہاں عید ہو شبرات ہو خواہ کوئی دن ہو اس کوچہ سے کبھی کوئی سائل نامراد اور خالی نہیں گیا۔ ہر روز کچھ نہ کچھ کاسۂ سائل میں ڈال دیا جاتا ہے

مرزا صاحب ایک فارسی شعر میں اس مضمون کو اس انداز سے بیان فرماتے ہیں ؎

غمگیں کسے نہ میرود از کوئے میکدہ
تا ہم پیالۂ مہ عیدش نمے کنند

شعر (۶) دنیا میں مشہور ہے کہ شادی و غم کا باہم اتصال ہے یا خوشی کے بعد رنج اور رنج کے بعد ضرور خوشی نصیب ہوتی ہے لیکن مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ دنیا میں شادی و غم بہم ہوا کریں ہمیں اس سے کیا کام ہمیں تو خدا نے وہ دل دیا ہے کہ جسے کبھی خوشی نصیب ہوتی ہی نہیں۔ پھر میرے لئے شادی و غم بہم ہوئے تو کیا۔

یہ شعر بھی اسی رنگ سے رنگین ہے ؎

ہمیں عشرت سے کیا مطلب ہمیں راحت سے کیا مطلب
ہوا ہے حسرت و غم سے خمیر آب و گل اپنا

شعر (۷) ماشاء اللہ خوب شعر ہے۔ ایک معمولی خیال کو کیسا خوشنما رنگ دیا گیا ہے اور کیا دلکش پیرایہ میں معشوق کی پیماں شکنیوں اور وعدہ خلافیوں کا ملامت انگیز خاکہ اڑایا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ اے غالب تم کیوں فضول دیوانوں کی طرح بار بار ان کو وعدہ یاد دلاتے ہو بھلا یہ کیا انداز گفتگو اور طرز تقاضا ہے کہ تم تو یہ کہے جاؤ کہ تم نے فلاں وعدہ کیا تھا اور وہ کہیں کہ ہمیں تو یاد ہی نہیں کہ ہم نے کوئی وعدہ کیا تھا۔

(۱۰۵) تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں ۱ ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ۲ ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر ۳ برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
قید ہستی سے رہائی معلوم ۴ اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں
نشہ رنگ سے ہے واشد گل ۵ مست کب بند قبا باندھتے ہیں
غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ ۶ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں ے آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
سادہ پُرکار ہیں خوباں غالبؔ
ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں

شعر (۱) توسن۔ گھوڑا۔ صبا۔ مجازاً تیز رفتار۔ ہوا باندھنا۔ اپنا سکہ جمانا۔ رعب بٹھانا مطلب ہے کہ تیرے گھوڑے کو جو ہم بلحاظ تیز رفتار ہونے کے صبا یعنی ہوا سے تشبیہ دیتے ہیں تو گویا ہم اپنی خیال آفرینی کی ہوا باندھتے ہیں لفظ صبا اور ہوا میں رعایت معنوی پنہاں ہے۔

شعر (۲) مطلب ہے کہ یہ جو ہم شاعرانہ دعاوی سے کام لیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ ہماری آہ میں بجلی کا اثر ہے۔ ہماری آہ فلک کو جلا دیگی یہ سب کچھ معشوق پر رعب ڈالنے کیلئے کہا جاتا ہے ورنہ کسی کی آہ نے کب کوئی اثر پیدا کیا ہے۔ بقول شخصے ے

نالے غم وفا میں سب بے اثر گئے ہیں
گردوں کے پار ہم نے مانا گزر گئے ہیں

شعر (۳) سرعت۔ تیزی۔ جلدی۔ مطلب ہے کہ اے عمر تیری سرعت رفتار کے مقابلہ میں ہم بجلی جیسی تیز رفتار چیز کو بھی ایسا سمجھتے ہیں کہ جیسے اُس نے پاؤں کو مہندی لگائی ہوئی ہے یعنی بلحاظ رفتار فنا ہماری عمر بجلی سے بھی جلد گزر جانیوالی چیز ہے (چونکہ جو شخص پاؤں کو مہندی لگالے وہ آزادی سے چل پھر نہیں سکتا گویا بجلی کا پابہ حنا ہونا ہماری رفتار عمر کے مقابلہ میں کم رفتار و سست رفتار ہونا ہے۔

شعر (۴) مطلب ہے کہ قید ہستی سے کسی حالت میں بھی رہائی ناممکن ہے! انسان باوجودیکہ نیست نما اور نیست ہو جائیگا لیکن پھر بھی اس پر ہستی کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسکی مثال اشک کی ہے کہ اشک کو شعرا بے سرو پا کہتے ہیں مگر مضمون میں باندھتے ضرور ہیں۔

شعر (۵) وا شدن۔ کھلنا۔ شگفتہ ہونا۔ بند۔ پیوند۔ جوڑ۔ قبا۔ جامہ۔ لباس۔ مطلب ہے کہ جو

پھولوں کا شگفتہ ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ پھول نشۂ رنگ سے مست ہورہے ہیں اور مستوں کے بھی چونکہ بند قبا چاک ہوتے ہیں اسلئے پھول کا شگفتہ ہونا مستوں کے گریبان چاک ہونے کا ہمرنگ ہے۔

شعر (۶) رسا۔ اثر انداز۔ پہنچنے والا۔ مطلب یہ ہے کہ بندش مضامین میں حضرات شعرا جس طرح غلط بیانیوں سے کام لیتے ہیں بس کچھ نہ پوچھیئے ان کی کہاں تک شکایت کی جائے ایک صاف اور کھلی ہوئی بات یہی دیکھ لیجئے کہ نالہ جو کبھی رسا نہیں ہوتا اُسے رسا باندھتے ہیں۔

شعر (۷) واماندگی۔ پسماندگی۔ کوتاہ عقلی۔ آبلوں۔ چھالوں۔ مطلب یہ کہ میرے چارہ گر بھی عجیب کم عقلی کا ثبوت دیتے ہیں کہ ایک تو میرے پاؤں میں دشت پیمائی سے چھالے پڑے ہوئے ہیں اور میں چلنے پھرنے سے عاجز ہوں دوسرے یہ لوگ میرے چھالوں پر حنا باندھتے ہیں کہ میں قطعی طور پر چل پھر نہ سکوں اور تلاش یار نہ کرسکوں۔

شعر (۸) سادہ پرکار یعنی سیدھے سادے بھی اور پرفن بھی جسکے معنی اس شعر سے بخوبی واضح ہوسکتے ہیں

دیکھنا حسرتؔ دل ریجھ پڑے ہو جس پر
بھولا بھالا بھی ہے کمسن بھی ہے عیار بھی ہے

خوباں معشوق۔ پیمانِ وفا۔ عہد۔ مطلب یہ ہے کہ یہ معشوق جو بظاہر سادے سے نظر آتے ہیں اور بباطن بڑے پرفن اور عیار واقع ہوئے ہیں ہمیں دھوکا دینے کیلئے ہم سے پیمانِ وفا ڈھونڈتے ہیں اور پھر پیمانِ وفا بھی ہم سے (ذرا زور دیکر پڑھو) جو ان کی عیاریوں سے بخوبی واقف ہیں۔

(۱۰۶) زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ
وگرنہ ہم تو زیادہ توقع رکھتے ہیں

شعر (۱) سخت کم آزار۔ بہت کم دکھ پہنچانے والا۔ بجانِ اسدؔ۔ مرزا غالبؔ کی جان کی قسم! مطلب یہ ہے کہ زمانہ بہت ہی سخت کم آزار ہے اسدؔ (غالبؔ) کی جان کی قسم جس قدر مظالم توڑے جارہے ہیں وہ ہماری توقع سے بہت کم ہیں یعنی ہماری جان پر اس سے بڑھ کر ظلم و ستم ہونے چاہئیں

(۱۰۷) دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں ۱ خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل ۲ انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے؟ ۳ لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے ۴ آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے ۵ لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ ۶ رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منع قدمبوسی کس لئے ۷ کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں
غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں ۸

شعر (۱) دائم۔ ہمیشہ۔ مطلب یہ ہے کہ کاش میں پتھر ہی ہوتا کہ تیرا سنگِ در بنتا اور تیرے قدموں کا مجھے دوام نصیب ہوتا۔ ایسی زندگی پر خاک پڑے کہ میں پتھر سے بدتر ہوں۔ دوسرے معنی اسکے یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ اگر ایک شخص کسی معزز آدمی کا جا کر مہمان ہوا اور چند روز وہاں رہے تو وہ شخص یا اسکے متعلقین اس قسم کی کانا پھوسی از راہ طعن کریں کہ یہ شخص یہاں روٹیاں کھانے کیلئے پڑا ہے تو وہ شخص طیش میں آکر جواب دیتا ہے کہ میں ہمیشہ کہاں سے کھاتا رہا ہوں۔ جو اس چند روزہ روٹیوں پر تم مجھے ذلیل کر رہے ہو۔ میری ایسی زندگی پر لعنت ہے کہ میں یہاں آکر ذلیل ہوا اور بےفائدہ تم لوگوں سے تعلقات پیدا کئے۔ اس قسم کی مثالیں آجکل کے صوفیا اور مشائخ کے آستانوں پر بہت مل سکتی ہیں۔ پیر صاحب تو شاید ایسی بدظنی کریں یا نہ کریں لیکن ان کے بعض منہ چڑھے مرید اور اسکے رشتہ دار ضرور ایسی کم ظرفی اور تنگدلی کا ثبوت دیا کرتے ہیں۔

شعر (۲) مدام۔ ہمیشہ۔ مطلب یہ ہے کہ اس ہمیشہ کی گردشِ ایام سے میرا دل کیوں نہ اکتا جائے۔ آخر گردش کی کوئی حد ہوتی ہے میں کوئی شراب کا پیالہ تو نہیں ہوں کہ جسکی قسمت میں ہمیشہ کی گردش لکھی ہے میں تو انسان ہوں

شعر (۳) لوح تختی۔ حرف مکرر۔ وہ حرف جو ایک بار لکھنے کے بعد دوبارہ لکھا جائے چونکہ یہ حرف بیکار اور زائد ہوتا ہے اسلئے مٹا دیا جاتا ہے مرزا صاحب جناب باری میں فریاد کرتے ہیں کہ یا الٰہی میں کسی عبارت و تحریر کا حرف مکرر تو نہیں ہوں کہ زمانے کے لوگ میرے مٹانے اور فنا کرنے کے درپے ہیں یعنی میں دنیا میں ایک بار آنے کے بعد دوبارہ تو نہیں آ گیا کہ مجھے عدم آباد پہنچانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔

شعر (۴) عقوبت، تکلیف، دکھ، عذاب۔ مطلب یہ ہے کہ تم جو میرے کسی گناہ کی وجہ سے سزا دے رہے ہو اور تمہاری سزا ختم ہونے ہی میں نہیں آتی آخر اسکی کوئی حد ہونی چاہیئے۔ یہ مانا کہ میں گنہگار ہوں لیکن کافر تو نہیں ہوں کہ دائمی عذاب میں مبتلا رہوں۔

شعر (۵) طباطبائی صاحب۔ آسی صاحب اور قاضی صاحب نے اسے نعتیہ شعر تصور فرما کر یہ معنی کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو بیشک زر و گوہر اور لعل و زمرد سے نفرت ہے اور انہیں آپ حقیر اشیاء تصور فرماتے ہیں لیکن میں تو ان میں سے کوئی چیز نہیں ہوں میں تو آپ کا غلام یعنی امتی ہوں پھر مجھے عزیز نہ رکھنے کی کیا وجہ ہے؟ ہم نہیں سمجھتے کہ اس شعر میں نعت کا کون سا قرینہ موجود ہے البتہ آسی صاحب نے جو دوسرا پہلو ظاہر کیا ہے وہ قرین قیاس ہے یعنی محبوب سے کہا گیا ہے کہ یہ مانا کہ تم زر و گوہر سے مستغنی ہو لیکن میں تو تمہارا چاہنے والا تم سے محبت کرنے والا۔ تم پر جان دینے والا عاشق ہوں۔

شعر (۶ و ۷) ان دونوں شعروں کی نسبت بھی حضرات شارحین نے یہی فرمایا ہے کہ یہ اشعار بھی نعتیہ ہیں اور واقعہ معراج شریف کے متعلق ہیں پہلے شعر کے تو یہ معنی کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب ہے کہ جب آپ کو شب معراج دیدہ ہائے مہر و ماہ پر قدم رکھنے میں کچھ دریغ نہ ہوا تو پھر میری آنکھوں پر قدم رکھنے میں کیا اعتراض ہے رتبہ میں میں ان سے کچھ کم نہیں ہوں۔

دوسرے شعر کے یہ معنی کرتے ہیں کہ آپ نے شب معراج آسمان کو شرف قدمبوسی بخشا پھر میری قدمبوسی سے کیوں انکار ہے کیا میں آسمان کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا۔

ہماری رائے میں یہ دونوں شعر بھی نعتیہ نہیں ہو سکتے یہ شعر تو اس حالت میں نعتیہ ہو سکتے تھے اگر مرزا صاحب حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہدِ مبارک میں آپ کی حیاتِ ظاہری کے زمانے میں موجود ہوتے لیکن پھر بھی اس قسم کی تعلّی اور خود ستائی حضور کے سامنے زیبا نہ تھی۔

شعر (۸) وظیفہ خوار - وہ شخص کہ جس کا بطور انعام کچھ ماہانہ مقرر ہو۔ اس شعر میں ادائیگی شکریہ کا بھی ایک پہلو ہے اور اپنی مجبوری کا بھی۔ ایک پہلو تو یہ ہے کہ غالب ایک دن تو وہ تھے کہ تم مایوسی، ناداری اور بیزاری کے عالم میں کہتے تھے کہ میں نوکر نہیں ہوں لیکن اب بادشاہ سلامت کو دعائیں دو کہ اس نے تمہیں اس فکر سے رہائی بخشی اور تمہارا وظیفہ مقرر کر دیا مصرعہ اولیٰ میں لفظ وظیفہ اور لفظ دعا کی لفظی و معنوی رعایت بھی خوب ہے۔

دوسرا پہلو اس کا یہ بھی ہے کہ کبھی ہمیں فارغ البالی حاصل تھی اور ہم ازراہِ تکبر و غرور کہا کرتے تھے کہ ہم کسی کے نوکر نہیں ہیں لیکن اب وہ دن گئے کیونکہ مفلسی اور ناداری نے ہمیں نوکر ہونے پر مجبور کر دیا۔

(۱۰۸) سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں ۱ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں ۲ لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں ۳ شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں
قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر ۴ لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں
سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے ۵ ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق ۶ میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں
ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام ۷ قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں
نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں ۸ تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا ۹ بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار ۱۰ جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے ۱۱ میری آہیں بخیہ چاکِ گریباں ہو گئیں
واں گیا بھی میں تو انکی گالیوں کا کیا جواب ۱۲ یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں
جانفزا ہے بادہ جسکے ہاتھ میں جام آ گیا ۱۳ سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ۱۴ ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج ۱۵ مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یونہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں ۱۶-

شعر (۱) آہ کیا حسرت بھرا شعر ہے کہ جسے پڑھکر دل پر حسرت و غم کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں یعنی مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ یہ جو چمن میں بعض نہایت خوشنما پھول کھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں معلوم ہے انکی اصل کیا ہے؟ آہ یہ سب ظالم موت کی خونچکانیاں اور گلکاریاں ہیں کہ جسنے کتنے گلبدن، گل اندام، گلفام اور گلرو حسینوں کو خاک میں ملا دیا کہ جو لالہ و گل کی صورت میں کچھ کچھ نمایاں ہو رہے ہیں آہ وہ کتنی دلفریب، روح پرور اور کیسی پیاری پیاری صورتیں ہونگی کہ جو خاک میں مل گئیں۔ حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

اے گل چو آدمی ز زمیں گو چگونہ اند
آں روئہا کہ در تہ گرد فنا شدند

شعر (۲) مطلب ہے کہ اہل زمانہ یا اے مستِ شباب لوگو یا دولت و جاہ کے نشہ میں سرشار لوگو اور محفلِ عیش و طرب کی آرائشیں کرنے والو ہم بھی اپنے عالمِ شباب میں اس قسم کی رنگین محفل آرائیاں کرنا جانتے تھے اور اس قسم کی مجلسیں ہمیں بہت مرغوب تھیں لیکن اب تو وہ ہمارے طاقِ فراموشی میں ہی گم ہو گئیں سبحان اللہ کیا پیارا مصرعہ ہے "نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں" اس مصرعہ میں شاعری کی روح موجزن ہے یعنی ان باتوں کو اب ہمنے طاقِ نسیان کا نقش و نگار بنا دیا ہے کیا معنی کہ ہم سب کچھ بھول گئے کیونکہ گردشِ ایام اور عالمِ پیری نے

یہ سب نعمتیں چھین لی ہیں۔ عبرت! حسرت!

شعر (۳) بنات النعش۔ قطب شمالی کی طرف سات ستارے گردش کرتے ہیں چار کو نعش اور تین کو بنات کہتے ہیں اور ابن النعش سے یہ بنات النعش بنا ہے یعنی چار تو بصورت نعش ہیں اور تین نعش اٹھانے والے ہیں اور جنازہ اٹھانے والے کو عربی میں ابن النعش کہتے ہیں قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ مرزا صاحب نے ان ستاروں کو مونث باندھا ہے ہمارے خیال میں چونکہ بنات لفظ بنت کی جمع ہے اور بنت عربی زبان میں بیٹی کو کہتے ہیں اسلئے مرزا صاحب نے انہیں مونث باندھا ہے اور اصل میں یہ لفظ بنات و نعش معلوم ہوتے ہیں واؤ کو بدلکر الف لام سے ادغام کیا گیا ہے۔ عریاں۔ برہنہ۔ مطلب یہ ہے کہ اے پردہ نشین معشوق تیری طرح بنات النعش بھی بہت بڑی پردہ نشین ہیں کہ دنکو تو صورت نہیں دکھاتیں اور رات کو نقاب اٹھا کر دیدار عام دیتی ہیں آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ دراصل معشوق کو بے حجاب اور بے نقاب کرنے کی یہ ایک عاشقانہ چال ہے۔

شعر (۴) روزن۔ سوراخ۔ زندان۔ قید خانہ۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا مصر میں قید ہونا اور انکے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کا انکی جدائی میں رو رو کر اپنی آنکھیں سفید کر لینا ایک عام اور مشہور قصہ ہے مولانا حالی فرماتے ہیں کہ یعقوب کی آنکھوں کو روزن دیوار قرار دیا ہے کیونکہ جس طرح روزن زنداں ہر وقت یوسف پر کشادہ رہتا تھا اسی طرح یعقوب کی آنکھیں شب و روز یوسف کی نگراں رہتی ہیں۔

شعر (۵) ماہ کنعاں۔ کنعان حضرت یوسف علیہ السلام کا وطن تھا اور بغایت حسن و جمال کیوجہ سے آپکو ماہ کنعان کہا جاتا ہے حضرت یوسف اور زلیخا کے عشق و محبت کے افسانے بھی زبان زد عام ہیں یعنی یہ واقعہ بھی مشہور ہے کہ مصر کی عورتیں زلیخا کو طعن دیتی تھیں کہ وہ اپنے ایک غلام پر عاشق ہے چونکہ مصر کی عورتیں یوسف کے حسن و جمال سے ناواقف تھیں اسلئے زلیخا نے زنان مصر کی ایک دعوت کی اور یوسف کو اس محفل میں یکایک جلوہ افروز کر کے حسن کی ایسی شعاعیں چھوڑیں کہ زنان مصر نے بجائے سیب کاٹنے کے عالم محویت میں اپنی انگلیاں کاٹ لیں مطلب یہ ہے کہ تمام عاشق تو اپنے اپنے رقیبوں سے ناخوش ہوتے ہیں بلکہ اپنے معشوق کی صورت دکھانا انہیں گوارا نہیں

لیکن زلیخا برعکس اس کے اپنے انتقامی جذبے کی بنا پر خوش ہے کہ زنانِ مصر حسنِ یوسف سے ایسی متاثر ہوئیں کہ ان کی حالت دیوانوں کی سی ہو گئی اور یہ انتہائے عشق و محبت کی علامت ہے۔

شعر (۶) جوئے خوں۔ خون کی نہر لیکن اس جگہ خون کے آنسو رونا مراد ہے۔ فروزاں۔ روشن مطلب یہ ہے کہ شامِ فراق کی وجہ سے چونکہ میرے گھر میں ہر طرف تاریکی چھا گئی ہے پس حضرات ناصح مجھے خون کے آنسو بہانے سے کیوں منع فرماتے ہیں میں سمجھوں گا کہ اس تاریک شب میں دو چراغ روشن ہو گئے آنکھوں کی سرخی سے بھی مجازاً دو شمعیں مراد لی گئی ہیں

شعر (۷) خلد۔ بہشت۔ انتقام، بدلہ۔ پریزاد۔ مجازاً معشوق حسین مطلب یہ ہے کہ یہ معشوق اور حسین جو آج ہماری بات نہیں سنتے ہماری طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھتے اور ہمیں تڑپا تڑپا اور ترسا ترسا کر ہلکان کر رہے ہیں اگر خدا نے اپنی قدرت سے انہیں حسینوں کو بہشت میں حوریں بنا دیا تو ہم اپنے دل کی خوب حسرتیں نکالیں گے اور ان حسینوں سے کہیں گے کہ کہو اب کیا معاملہ ہے بقول امیر مینائی ؎

آجائیں بس میں وہ تو کہوں میں شبِ وصال
وہ شوخیاں کہاں گئیں جن پہ غرور تھا

شعر (۸) سبحان اللہ یہ بھی کیا پاکیزہ شعر ہے کہ جس کی تعریف و ستائش نہیں ہو سکتی اس شعر کو شاہ غزل یا بیت الغزل کہنا چاہیئے اس شعر کی حقیقت سے وہی حضرات لذت اندوز ہو سکتے ہیں جو اہلِ درد، اہلِ ذوق اور ہجران نصیب ہیں اور سچ پوچھیے تو الفاظ میں اس شعر کی حقیقت بیان نہیں ہو سکتی خیر سرسری مطلب اس کا یہ ہے کہ اے پریزاد محبوب بننا یا محو خواب ناز ہونا تو اس خوش قسمت کا ہے جو تیرے جیسے حسین کے ساتھ ہم بستر ہو دماغ اس کا ہے جو تیرے جیسے مہوش سے ہم آغوش ہو اور راتیں اسکی ہیں جو تیرے جیسے راحت جان کیساتھ رہ کر شبِ وصال کے مزے لوٹے رہا ہو اور اسکے گیسوئے مشکیں تیرے بازو پر بکھرے ہوئے ہیں یعنی جسکے بازو کو تو تکیہ سر بنائے محو خواب ناز ہوتا ہے

شعر (۹) دبستان۔ مدرسہ۔ مطلب یہ ہے کہ جب سے میں نے سیر چمن کو جانا شروع کیا ہے چمن بھی ایک طرح کا مدرسہ بن گیا ہے یعنی چمن میں میری غزل خوانی کرنے سے بلبلیں بھی غزل خوانی سیکھ گئی ہیں یعنی جس وقت میں چمن

جیب، گریبان، پیراہن۔ مطلب یہ ہے کہ جوشِ بُت پرستی میں میرے دیوانہ پن کی یہ حالت ہے کہ میں نے اپنے جیب و گریبان کی ایسی دھجیاں اُڑائی ہیں کہ پیراہن میں ایک تار تک نہیں چھوڑا تاکہ وہی زنار کا کام دیتا اور بتوں میں ہماری عزت رہ جاتی۔

شعر (۲) یعنی جب ہم حسرتِ دیدار کی خواہش میں عاجز آچکے تو اسکے بعد ہمیں یہ بھی محسوس ہوا کہ ہم میں تو طاقتِ دیدار بھی نہ تھی۔ فضول دل کو ضائع کیا۔

شعر (۳) ایک واقعہ کے بیان میں ایسے مناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا عجیب اتفاق ہے اس مضمون کو چاہو حقیقت کی طرف لے جاؤ یا مجاز پر محمول کرو دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا یعنی دشوار ہوتا تو کچھ دقت نہ تھی کیونکہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ رہتے اور شوق و آرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے اگر مشکل یہ ہے کہ جسطرح وہ آسان نہیں اسی طرح دشوار بھی نہیں اور اس طرح شوق و آرزو کی خلش سے کسی صورت نجات نہیں ہوتی (یادگار)

شعر (۴) مطلب یہ ہے کہ بغیر عشق بازی کے تو زندگی کا لطف ہی نہیں لیکن یہاں ضعف و ناتوانی نے وہ حالت بنا رکھی ہے کہ بقدرِ لذتِ آزار طاقت ہی نہیں رہی کہ عشق کا کوئی صدمہ برداشت کر سکیں۔

شعر (۵) شوریدگی۔ دیوانہ پن۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دیوانہ پن کی وجہ سے میرا سر بھی میرے کاندھے پر وبال و مصیبت ہے اور اس صحرا نوردی نے بھی مجھے کوئی فائدہ نہ دیا کیونکہ یہاں کوئی دیوار بھی نہیں کہ اسکے ساتھ سر کو ٹکرا کر سر پھوڑ لیتا اور اپنے کاندھے کا بوجھ ہلکا کر لیتا۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں ؎

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

شعر (۶) مطلب یہ ہے کہ میرے دل میں دشمنوں کی عداوت کی گنجائش اور سمائی کہاں؟ یہاں تو ضعف و ناتوانی سے دل اسقدر تنگ آگیا ہے کہ اب اس میں کسی دوست کی کشش اور خیال کی بھی گنجائش نہیں ہے۔

شعر (۷) مطلب یہ ہے کہ او ظالم میری آہ و زاری سے ڈر اور خوفِ خدا کر کیونکہ میرے نالے مرغ

اثر نہیں کے نالے میں کہ تو انکی تاثیر کا قائل نہو اگر لفظ مرغ کو بغیر اضافت پڑھا جائے تو یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ مرغ تو گرفتار ہے لیکن اسکی آواز تو گرفتار نہیں اسکی آواز کو کیسے گلوگیر کر سکتا ہے اور یہ نالہ و زاری ضرور رنگ لائیگی بقول شخصے ؎

آہِ مظلوم بُری ہوتی ہے اس سے ڈرنا!
دردمندوں کا کہیں دل نہ دکھائے کوئی

شعر (۸) روکشی، مقابلہ۔ خلش، چبھن۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دل میں تو مارے ضعف کے ایک کانٹے چبھنے کی بھی طاقت نہیں لیکن جذبۂ حسن وعشق کا یہ حال ہے کہ معشوق کے صفِ مژگاں سے مقابلہ کی ٹھان رکھی ہے یعنی پلکوں کے تیر و پیکان کے زخم کھا رہا ہے۔

شعر (۹) اس شعر میں لفظ سادگی خاص طور پر معنی خیز ہے ایک تو یہ کہ ہمارے معشوق کی سادہ دلی دیکھئے کہ ہمیں مارنے کیلئے آئے ہیں لیکن خالی ہاتھ آئے ہیں دوسرے یہ کہ انکی یہ سادگی ہی دراصل ہمیں قتل کر رہی ہے اور ہم اس سادگی پر جان دے رہے ہیں۔ ایک یہ شعر بھی اس کی تائید کر رہا ہے ؎

جنبش تیغ نظر پر کہا ہنس کر میں نے
کیسا قاتل ہے ترے ہاتھ میں تلوار نہیں

شعر (۱۰) خلوت، تنہائی۔ جلوت، مجلس میں ظاہر ہو کر بیٹھنا۔ مطلب یہ ہے کہ بعض لوگوں کا جو یہ خیال ہے کہ اسد کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ اور ہے یہ خیال غلط ہے اسد کا ظاہر و باطن یکساں ہے ایک یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ بعض لوگ اسد کو مجذوب و مست سمجھتے ہیں اور بعض سالک و ہوشیار یہ بھی غلط ہے دراصل وہ ان دونوں حالتوں کے بین بین ہے۔

ہوا ہے تار اشک یاس رشتہ چشم سوزن میں ۱ نہیں ہے زخم کوئی بخیہ کے در خور مرے تن میں (۱۰)
کف سیلاب باقی ہے برنگ پنبہ روزن میں ۲ ہوئی ہے مانع ذوق تماشا خانہ ویرانی
نگین نام شاہد ہے مرا ہر قطرۂ خوں تن میں ۳ ودیعت خانہ بیداد کاوشہائے مژگاں ہوں
شب مہ ہو جو رکھدیں پنبہ دیوار کے روزن میں ۴ بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی

نگوہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی ۵ ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں
ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے ۶ پُر افشاں جوہرِ آئینہ مثلِ ذرہ روزن میں
نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے ۷ جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں
ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو ۸ سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرۂ خوں تن میں

اسدؔ زندانیِ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

شعر (۱) بخیہ کے درخور۔ سلائی کے قابل۔ تارِ اشکِ یاس۔ بحالتِ ناامیدی اشکوں کے گرنیکے رشتہ یعنی تاگہ سے مراد لی ہے چشمِ سوزن، سوئی کا ناکہ! اشک کے لحاظ سے چشمِ سوزن کی رعایت خوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ میرے بدن میں کوئی ایسا زخم نہیں جو بخیہ کرنے کے قابل ہو اسلئے بخیہ گر کی سوئی میرے حال پر آنسو بہاتی ہے اور ناامیدی کے آنسوؤں کا تار سوئی کی آنکھ یعنی ناکے کا تاگہ بن گیا ہے۔ ایک نازک خیال نے اس طرح بھی لکھا ہے۔

مرے تارِ نظر کو سوزنِ مژگاں سے وحشت میں
جو سینے کو گریباں تھا رفو کرنے کو داماں تھا

شعر (۲) پنبہ۔ روئی۔ کفِ سیلاب۔ پانی کی جھاگ۔ مطلب یہ ہے کہ میں اس شدت کے ساتھ رویا کہ میرے آنسوؤں کے سیلاب نے میرے گھر کو تباہ کر دیا ہے کہ روزنوں میں کفِ سیلاب روئی کی طرح موجزن ہے جس سے لذتِ تماشا و سیر بھی باقی نہیں رہی۔ قاعدہ ہے کہ سیلاب کے بعد کچھ جھاگ در و دیوار یا زمین کے سوراخوں میں باقی رہ جاتے ہیں۔

شعر (۳) ودیعت، امانت۔ سونپنا۔ کاوش۔ کھودنا۔ تلاش کرنا۔ بیداد۔ ظلم۔ نگین۔ نگینہ۔ مطلب یہ ہے کہ میرے خونِ بدن کا ہر قطرہ ایک نگینہ بنا ہوا ہے جس پر مژگانِ یار نے کرید کرید کر اس کا نام لکھ دیا ہے اور میں مژگانِ یار کی کاوشوں کے ظلم کا امانت خانہ ہوں قریب قریب اسی مضمون کا ایک شعر پہلے بھی گزر چکا ہے۔

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا!

شعر (۴) گستری۔ وسعت۔ پھیلاؤ۔ شبستان۔ رات کی آرامگاہ۔ شب مہ۔ چاندنی رات۔ مطلب یہ ہے کہ میرے سیہ خانہ کی ظلمت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے یعنی اسکی یہ حالت ہے کہ اگر اسکی دیواروں کے روزن میں پنبہ رکھ دوں تو اس سے چاندنی رات کا دھوکا ہو جائے۔ یہی مضمون اس سے پہلے بھی بیان ہو چکا ہے۔

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے!
پنبہ نورِ صبح سے کم میرے روزن میں نہیں

شعر (۵) نکوہش۔ ملامت۔ خندہ۔ ہنسی۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دوستوں کی ملامت انگیز ہنسی میرے جوش جنون کیلئے رکاوٹ کا باعث ہوئی اور میں شرمندہ ہو کر اپنے جیب و دامن کو چاک چاک کر سکا اور دوستوں کی ہنسی نے ایک طرح سے بخیہ کا کام دیا۔ اس شعر کے لفظ خنداں میں بخیہ دنداں نما کی تشبیہ مضمر ہے۔

شعر (۶) تمثال۔ صورت۔ پرافشاں بمعنی اڑنا۔ جوہر۔ خلاصہ ہر چیز اور عرض کی ضد یعنی عرض وہ چیز ہے جو بذات خود قائم نہ ہو اور جوہر وہ چیز ہے جو بذاتِ خود قائم ہو بلکہ عرض کا وجود جوہر کے وسیلہ سے ہو مثلاً لوح جوہر اور نقش عرض ہے مطلب یہ ہے کہ جسطرح صبح کی شعاعوں سے ذرہ ہائے روزن پرافشاں معلوم ہوتے ہیں اسی طرح اس مہوش کی عکس رخ سے آئینہ میں جوہر کے ذرے پرافشاں ہیں۔

شعر (۷) مطلب یہ ہے کہ میں نہیں جانتا کہ میں نیک ہوں یا بد ہوں لیکن اتنا تو ضرور معلوم ہے کہ جیسا میں ہوں ویسی مجھے صحبت نصیب نہیں ہوئی یعنی اگر میں گل ہوں تو جو صحبت مجھے حاصل ہے میں اسے اپنے لئے گلخن (آتشگاہ) سمجھتا ہوں اور اگر خس ہوں تو یہ صحبت میرے لئے گلشن ہے اور خس کو گلشن میں نہیں رہنا چاہیئے الغرض صحبت ہر حال میں مخالف ہے۔

شعر (۸) سویدا۔ وہ سیاہ نقطہ جو دل میں ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ جنونِ عشق کے جوش سے میرے خون کا ہر قطرہ سیاہ ہو کر سویدا بن گیا اور مناسبت سویدائے دل گویا مجھے ہزاروں دل مل گئے یعنی میرا ہر قطرۂ خون میرے جسم میں بمنزلہ ایک دل کے ہے اور ہر دل میں سودائے عشق بھرا ہوا ہے۔

شعر (۹) زندانی۔ قیدی۔ نوازش۔ مہربانی۔ مطلب یہ ہے کہ اے اسد میں حسینوں کے جذبہ محبت کا قیدی ہوں یعنی ان کا ہاتھ جو از راہ مہربانی میری گردن میں پڑا ہے وہ بمنزلہ ایک طوق گردن کے ہے۔

(۱۸۱) مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں ۱ سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں
مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے ۲ وگرنہ تابِ تواں بال و پر میں خاک نہیں
یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے؟ ۳ کہ غیرِ جلوۂ گل رہگزر میں خاک نہیں
بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا ۴ اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں
خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں مے کش ۵ شرابخانہ کی دیوار و در میں خاک نہیں
ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ ۶ سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
۷- کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

شعر (۱) خاک نہیں یعنی کچھ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کے ہر قسم کے مزوں اور لذتوں میں اب ہمیں کوئی حظ حاصل نہیں ہوتا سوائے خونِ جگر پینے کے لیکن افسوس ہے کہ اب ہمارے جگر میں خون بھی نام کو نہیں رہا۔

شعر (۲) مگر یعنی شاید۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے بال و پر میں تو طاقتِ پرواز رہی نہیں شاید ہمارے غبار بننے یا خاک ہو جانے کے بعد ہوا ہماری خاک کو اڑا کر کوچۂ محبوب تک پہنچائے۔ بقول شخصے ؎

کبھی تو اڑ کے کسی در پہ جا ہی پہنچوں گا
پس فنا مری مٹی بھی تم اڑا دینا

نقاش مرحوم کا شعر ہے کہ ؎

تری نسیم محبت اڑا کے لائی ہے
تری گلی میں برنگِ غبار بیٹھے ہیں

شعر (۳) شمائل جمع شمیلہ یعنی خصلت و عادت۔ مطلب یہ کہ یہ کون سے فردوس منظر، سراپا جنت کا گزر ہو رہا ہے کہ رستہ میں سوائے پھولوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا ذرہ ہائے خاک بھی جلوۂ گل بنے ہوئے ہیں۔

شعر (۴) نفس۔ سانس۔ مجازاً آہ وزاری مطلب یہ ہے کہ میری آہ وزاری قطعی بے اثر ثابت ہوئی ہے اگر اس بیرحم کو مجھ پر رحم نہیں آتا تو مجھے خود اپنے حال پر رحم کرنا چاہیئے تھا یعنی اس نالۂ آہ اور جنونِ عشق سے باز آتا۔

شعر (۵) میکش مجازاً شراب فروش، مطلب یہ ہے کہ فصلِ گل آرہی ہے اور اس خیال سے کہ موسمِ بہار میں بغیر گل و مل کیونکر گزریگی بادہ نوش خراب ہو رہے ہیں ورنہ شراب خانہ کے در و دیوار میں گلکاریاں تو کجا وہاں خاک تک نہیں رہی اور میخانہ تباہ ہو رہا ہے اور اگر لفظ خراب کو ہم معنی مست سمجھا جائے تو یہ معنی ہونگے کہ صرف خیال جلوۂ گل سے میکش مست بنے بیٹھے ہیں ورنہ شراب خانہ میں تو خاک نہیں۔

شعر (۶) غارتگری۔ لوٹ مار۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ مرزا غالب دہلی میں پچاس سال تک رہے لیکن ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہے خود مکان بنانے کی دل میں حسرت ہی رہی چنانچہ اس شعر میں اسکا اظہار کیا ہے مطلب یہ ہے۔ کہ میں عشق کی غارتگری کی وجہ سے نہایت شرمندہ ہوں اس نے مجھ کو بالکل پامال محتاج کر دیا ہے میرے گھر میں یعنی میرے پاس اب کچھ باقی نہیں رہا صرف ایک حسرت تعمیر باقی رہ گئی ہے اسی خیال کو ایک اور جگہ اس طرح بیان کیا ہے۔

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

شعر (۷) کھلا یعنی یہ عقدہ کھلا۔ جناب قاضی صاحب خوب فرماتے ہیں کہ مرزا صاحب جس پایہ کے شاعر تھے اس کے شایان انکی قدر نہوئی۔ مہر نیمروز میں بہادر شاہ کو خطاب کرکے ظاہر کیا ہے کہ شاہجہان کے عہد میں کلیم شاعر سیم و زر میں تولا گیا تھا لیکن میں صرف اسقدر چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی کلیم کے کلام کیساتھ تول لیا جائے لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہوئی مرزا صاحب اس ناقدردانی کی شکایت جو بالکل مناسب اور بجا ہے اکثر کیا کرتے تھے چنانچہ منشی حبیب اللہ ذکا کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ایک کم ستر برس کی عمر ہوئی اسیطرح شہرت کے فن شعر کا کچھ پھل نہ پایا فرمانروایان عصر معتقد ہوئے مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ چنانچہ اس شعر میں اپنی اس ناقدردانی اور مضحکہ خیزی کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی لوگ کہتے جب کہ ہمارے اشعار کیا ہیں محض سادگی ہیں کیا خوب، بس معلوم ہوگیا کہ اظہار ہنر بالکل بیکار ہے۔

(۱۱۲) دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں ۱ روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں ۲ بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں
جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نیمروز ۳ آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں
دشنۂ غمزہ جانستاں، ناوک ناز بے پناہ ۴ تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں
قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں ۵ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم ۶ اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں
واں وہ غرور عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع ۷ راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں
ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا سہی ۸ جسکو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں
غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیوں کیجیے ہائے ہائے کیوں ۹۔

شعر (۱) سنگ و خشت، اینٹ پتھر۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے کوئی سنگدل معشوق عاشق ستم رسیدہ کے نالہ و فریاد سے تنگ آکر اسے بہ جبر روکنا چاہتا ہے اسپر عاشق جواباً کہتا ہے کہ واہ جناب اچھی کہی۔ ہم اپنے سینہ میں دل کی جگہ اینٹ پتھر تو نہیں رکھتے کہ جو درد سے بیتاب ہو کر مائل گریہ نہ ہو جائے اور اسپر کسی کا اجارہ ہی کیا ہے کہ ہم نہ روئیں اچھا یہ بھی سہی لیکن آپ یہ تو فرمائیں کہ آپ ہمیں ستاتے کیوں ہیں، بقول شخصے ؎

آہ شرر فشاں پہ تم کہتے ہو مجھ سے چپ رہو
دل میں لگی ہو آگ جب کیوں نہ دھواں اٹھا کرے

یا ؎

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

شعر (۲) دیر۔ بتخانہ۔ حرم۔ وہ احاطہ جو کعبۃ اللہ کے گرداگرد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس جگہ میں بیٹھا ہوں

کوئی بتخانہ تو ہے نہیں اور نہ ہی آپ بتخانہ کے پجاری ہیں جو آپ ہمیں ملیچھ سمجھ کر اٹھا رہے ہیں اور نہ ہی یہ کعبہ مسجد ہے کہ کوئی متولی مسجد ہمیں کافر سمجھ کر اٹھا رہا ہے اور نہ ہی کسی امیر رئیس کا دروازہ ہے کہ مجھے وہاں سے اسلئے اٹھایا جا رہا ہے کہ کسی کی آمد و رفت میں خلل اور رکاوٹ واقع ہوگی یا کسی ولی اللہ کی چوکھٹ نہیں کہ مجھے گدا و سائل سمجھ کر دوسرے گدا اٹھا رہے ہیں تو ایک گذرگاہ عام ہے جو کسی کی ملکیت نہیں بھلا وہ کون ہے جو ہمیں اٹھا سکے اس کا حق اور اسکی ہستی ہی کیا ہے ہم یہاں بیٹھے ہیں اور ضرور بیٹھے رہینگے ہمارا معشوق اس راہ سے گزریگا تو ہم ضرور اس کا دیدار کرینگے اگر غیر اس پر چین بجبیں ہوتا ہے تو ہوا کرے۔

شعر (۳) جمال دلفروز۔ دلکو روشن کرنیوالا حسن۔ مہر نیمروز۔ آفتاب نصف النہار۔ یہ شعر حقیقت اور مجاز کے معنی اپنے اندر رکھتا ہے مطلب ہے کہ جس طرح دوپہر کے وقت آفتاب کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتے اسی طرح جبکہ میرے محبوب کا حسن دل افروز اپنے آپ ہی نظارہ سوز ہے یعنی تاب نظارہ کی اجازت نہیں دیتا تو پھر اسکی پردہ میں چھپانے کی کیا ضرورت ہی منہ چھپانے کا فائدہ تو انہیں اب بھی حاصل ہے کہ ہمیں اس آفتاب حسن کے نظارہ کی تاب ہی نہیں اور انسے آنکھ بھر کر دیکھ ہی نہیں سکتے۔

شعر (۴) دشنہ۔ خنجر۔ ناوک۔ تیر۔ جانستان۔ جان لینیوالا مطلب ہے کہ تیرے غمزہ و ناز کے تیر و خنجر جانستان اور بے پناہ ہیں یعنی ان سے کوئی بچ سکتا ہی نہیں پس تیرے سامنے ہرگز ہرگز کسی کو نہیں آنا چاہیئے خواہ وہ تیرا ہی عکس رخ کیوں نہ ہو ممکن ہے وہ بھی زخمی و گھائل ہو جائے اس خیال میں کمال مبالغہ کا اظہار کیا گیا ہے اس میں ایک نکتہ بھی پنہاں ہے کہ تیرا حسن ایسی چیز نہیں ہے کہ جس سے صرف انسان ہی متاثر ہوتا ہے بلکہ ہر چیز وہ خواہ مادی ہو یا غیر مادی سب پر یکساں اثر انداز ہوتا ہے۔

شعر (۵) مطلب ہے کہ زندگی یا قید غم دراصل دونوں ایک ہی چیز ہیں یعنی جب تک انسان تعلقات دنیوی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اسے قید غم سے کیسے رہائی حاصل ہو سکتی ہے اس قید سے تو اسی وقت رہائی ہوگی۔ جب انسانی زندگی کا خاتمہ ہو جائیگا۔ نہ انسان زندہ ہوگا نہ اسے غم لاحق ہوگا اسکے یہ صوفیانہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ

بغیر فنا کے بقا حاصل نہیں ہو سکتی لیکن حکیم مومن خاں مومن کیا خوب فرماتے ہیں ؎

چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی
ناصح! یہ بند غم نہیں قید حیات ہے

شعر (۶) حسن ظن۔ نیک گماں، بوالہوس۔ مجاز جسے حد سے زیادہ ہوس ہو۔ اعتماد۔ بھروسہ۔ مرزا غالب نے ایک خط میں خود اس شعر کی شرح فرمائی ہے یعنی حسن عارض اور حسن ظن دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں یعنی صورت اچھی ہے اور گمان اس کا صحیح ہے کبھی خطا نہیں کرتا اور یہ گمان اسکو اپنی نسبت ہے کہ میرا مارا کبھی بچتا نہیں اور میرا تیر غمزہ خطا نہیں کرتا پس جب اسکو ایسا بھروسہ ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کرے اس حسن ظنی نے رقیب کی شرم رکھ لی ورنہ رقیب عاشق صادق نہ تھا اگر پائے امتحان درمیان نہ آتا تو حقیقت کھل جاتی۔

شعر (۷) اس شعر میں لف و نشر مرتب واقع ہوئی ہے مطلب یہ ہے کہ ہمارے معشوق کو اپنے حسن و عزت پر غرور و ناز ہے اور وہ اسے اپنی شان و وقار کے خلاف سمجھتا ہے کہ اپنی معزز محفل میں مجھ جیسے غریب عاشق کو باریابی کا موقع دے اور ہم باوجود غریب و نادار ہونیکے خوددار واقع ہوئے ہیں کہ خود بخود بغیر بلائے کسی کے یہاں جانا اپنی وضع کے خلاف سمجھتے ہیں اور ہمیں اپنی اس وضعداری کا پاس ہے گو طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہی کیوں نہ ہوں بقول شخصے ؎

وضعداری اور غیرت روکتی ہے صلح سے
پر طبیعت کہتی ہے ان کو مناتے کیوں نہیں

بلکہ اس حجاب پاس وضع کے خیال سے جب بازار بھی جاتے ہیں اور اتفاقاً راہ میں اس سے آمنا سامنا بھی ہو جائے تو اسے نہیں بلاتے بقول شخصے ؎ کوچۂ یار سے ہم روز گذر جاتے ہیں تاج
دل کی خواہش ہے ہمیں آپ بلائے کوئی

شعر (۸) اصل اس شعر میں اس گفتگو کا نقشہ اتارا گیا ہے کہ کوچۂ عشق و محبت سے ناواقف لوگ ایک عاشق باوفا کو سمجھا رہے ہیں کہ نادان تو ایک بیوفا اور بے رحم کافر کی محبت میں اپنے دین و ایمان اور دل و جان کو تباہ و

ہلاک کر رہا ہے بہتر یہی ہے کہ اس سے باز آجا پس اپنے محبوب کی نسبت ایسی بدگمانی اور بدگوئی سنکر عاشق صادق کو تاب شنیدن نہیں رہتی اور وہ جھنجلا کر جواب دیتا ہے کہ اچھا صاحب جانے معاف کیجئے وہ بیوفا ہی سہی مجھے اسکی بیوفائی ہی پسند ہے آپ اپنے دین ایمان اور دل و جان کی خیر منائیے۔ مجھے روکنے والے آپ کون ہوتے ہیں آپکا اس میں کیا نقصان ہوا اسکے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اگر مجھے اپنا دین و دل عزیز ہوتا تو میں اسکے کوچۂ عشق و محبت میں جاتا ہی کیوں؟

شعر (۹) دراصل اس شعر میں متعلقین اور دوست و احباب کی اس عارضی اور ہنگامی گریہ و زاری اور ماتم و فغاں پر طنز کی گئی ہے جو عام طور پر دنیا میں کسی شخص کے مرنے پر لوگ کیا کرتے ہیں مطلب یہ ہے کہ مرنے والے کی لاش پر سوائے بیفائدہ آہ و زاری کرتے ہو چند روز کے بعد ہی تم اسکو بھول جاؤگے اور اپنے کاروبار میں لگ جاؤگے اور یہی امر واقعہ ہے کہ کسی کے مرنے پر دنیا کے کاروبار بند نہیں ہو جاتے حتیٰ کہ ایک بادشاہ کی موت واقع ہوتی ہے تو اسی وقت دوسرے بادشاہ کا انتخاب ہو جاتا ہے اور جب تک دوسرے بادشاہ کا انتخاب ہو جائے مرنے والے بادشاہ کی لاش بے گور و کفن پڑی رہتی ہے۔

(۱۱۳) غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں ۱ بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے، بتا کہ یوں
پرسش طرز دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے ۲ اسکے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں
رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لیئے ۳ آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں
غیر سے رات کیا بنی، یہ جو کہا تو دیکھئے ۴ سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں
بزم میں اسکے رو برو کیوں نہ خموش بیٹھیے ۵ اسکی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں
میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی ۶ سنکے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح ۷ دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں
کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی ۸ آئینہ دار بن گئی حیرت نقش پا کہ یوں
گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال ۹ موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
۱۰- گفتۂ غالب ایکبار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

شعر (۱) مطلب ہے کہ شاعر پوچھتا ہے کہ بوسہ کس طریقہ سے لیا جاتا ہے مُنہ سے میرا بوسہ لیکر بتاؤ کہ یوں بوسہ لیا کرتے ہیں یہ ٹھیک نہیں ہے کہ اپنے منہ کو بند کرکے جو بصورت غنچۂ ناشگفتہ ہے بیٹھے رہو اس سے میرا مقصد حاصل نہیں ہوتا

شعر (۲) مجھے اپنے محبوب سے اس انداز دلبری کے دریافت کرنے کی ضرورت ہی کیا کہ تم عاشقوں کے دل کس طرح چھینا کرتے ہو کیونکہ جب انکے بیان کرنیکے بغیر ہی انکے ہر ایک اشارہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ اُس ادا سے دلربائی کیا کرتے ہیں؟

شعر (۳) مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ یہ تو میری عین تمنا ہے کہ خدا کرے میرا معشوق میرے گھر میں ضرور آئے لیکن خدا یہ نہ کرے کہ وہ شراب پیئے ہوئے اور رقیب کو ساتھ لئے ہوئے آئے۔ ایسے وصال سے ہم باز آئے۔

شعر (۴) یعنی میں نے جو اُن سے دریافت کیا کہ فرمائیے رات غیر سے کس طرح بسر کی تو وہ ظالم میرے بالمقابل بیٹھا اور اپنے اس انداز نشست سے یہ ظاہر کر دیا کہ اس طرح ہم اور وہ سامنے بیٹھے رہے اور لطف صحبت اُٹھاتے رہے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ میرے سوال پر غضبناک ہو کر سامنے آکر بیٹھ گیا اور بزبان حال کہا کہ اچھا اب تم بھی یوں گستاخی کرنے لگے

شعر (۵) شاعر کہتا ہے کہ بعض اہل محفل جو مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم خاموش کیوں بیٹھے ہو تو میری طرف سے یہ جواب ہے کہ میں اپنے محبوب کی محفل میں آداب محفل اور اسکی منشا کیخلاف کیسے کر سکتا ہوں کیونکہ میرا محبوب خود خاموش بیٹھا ہے اور اسکی خاموشی کا مطلب بھی یہی ہے کہ میں بھی خاموش بیٹھوں۔

شعر (۶) ستم ظریف۔ وہ ظریف جسکی ظرافت کیساتھ ظلم بھی ملا ہوا ہو مطلب شعر کا یہ ہے کہ میں نے رقیب کو غیر سمجھ کر کہا تھا کہ آپکی محفل غیر سے خالی ہونی چاہئے اس نے یہ سنکر مجھے بزم سے اُٹھوا دیا یعنی یہاں ایک تو ہی غیر نظر آتا ہے۔

شعر (۷) یعنی میرے یار نے جب مجھ سے دریافت کیا کہ یہ تو بتاؤ ہوش کس طرح اُڑتے ہیں؟ لیکن یہ دیکھ کر کہ میں اپنے آپ میں نہیں ہوں ہوا چلنے لگی کہ اس طرح ہوش اُڑتے ہیں۔

شعر (۸) مطلب یہ ہے کہ مجھے کوچۂ یار میں پڑا رہنے کا طریقہ معلوم نہ تھا لیکن نقش پا کے انداز نے آمنہ کہ طرح

مجھ پر واضح کردیا کہ کوچہ محبوب میں اس طرح اپنے آپ کو مٹا کر رہنا چاہیئے کہ جس طرح نقش پا حیرت زدہ اور خاک آلودہ ہوتا ہے۔

شعر (۹) مطلب کہ اگر تجھے یہ خیال ہو کہ اصل الاصول یعنی خدا تک پہنچکر کیونکر شوق و اشتیاق میں کمی واقع ہو جائیگی اور کس طرح اتحاد پیدا ہو جائے گا تو موج بحر کو دیکھو کہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں مارنے کی حرکت سے تبارہی ہے کہ اس حرکت کا آخری سکون بھی ہے جو مرتبہ اتحاد و اطمینان ہے۔

شعر (۱۰) کیونکہ یعنی کیونکر۔ ریختہ۔ اردو۔ گفتہ غالب۔ کلام غالب۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اردو شاعری فارسی شاعری سے کس طرح بہتر ہو سکتی ہے انکو مرزا غالب کا کلام سنا دو کہ دیکھو یوں ہوا کرتی ہے

ردیف "و"

(۱۴) حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو ۱ کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو
بقدر حسرت دل چاہیئے ذوق معاصی بھی ۲ بھروں یک گوشۂ دامن گر آب ہفت دریا ہو
اگر وہ سرو قد گرم خرام ناز آجائے ۳ کف ہر خاک گلشن شکل قمری نالہ فرسا ہو

شعر (۱) مولانا حالی فرماتے ہیں کہ یہ محض خیالی مضمون نہیں ہے بلکہ حقیقت واقعی کو ایک نہایت عمدہ پیرایہ میں بیان کیا ہے فی الواقع جب گھر کی چار دیواری میں محصور دنیا کے حالات سے اور لوگوں کی ترقی و تنزل کے اسباب سے ناواقف ہوتا ہے تو اپنی جماعت میں سے کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا لیکن جسقدر اس کا دائرہ وسیع اور تعارف زیادہ ہوتا جاتا ہے اسی قدر اسپر یہ بات کھلتی جاتی ہے کہ لوگوں کی خوشحالی محض اتفاقی نہیں ہے جسپر حسد و رشک کیا جائے بلکہ انکی محنت و تدبیر کا نتیجہ ہے اور اسلئے انصاف اور فیاضی اسکے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اور خود بھی کوشش و تدبیر کی طرف مائل ہوتا ہے اور بجائے حسد و رشک کے اوروں کی ریس اور پیروی کرنے میں متوجہ ہو جاتا ہے اس معقول بات کو ایک محسوس تمثیل میں بیان کرتا ہے کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو جس طرح شعراء نے بخیل کے دلکو تنگ باندھا ہے اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کیساتھ موصوف کیا ہے

شعر (۲) معاصی جمع معصیت بمعنی گناہ۔ بھروں۔ آلودہ کروں۔ گنہگار کو فارسی زبان میں تر دامن بھی کہتے ہیں بھروں پاک گو تشنہ دامن میں بھی رعایت اور مناسبت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دل میں لذت گناہ کی حسرت اس کثرت سے ہے کہ اگر گناہوں کے سات دریا بھی ہوں تو میرا ایک گوشۂ دامن بھی تر نہ ہو گا ایک اور شعر اسی مضمون کا پہلے بھی گزر چکا ہے

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

شعر (۳) کف ہر خاک۔ ہر کف خاک۔ قمری کا رنگ خاکستری ہوتا ہے اسلئے ہر کف خاک کو قمری تصور کیا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ اگر میرا سرو قد محبوب سرگرم خرام ناز ہو جائے تو قمری کی طرح ہر کف خاک گلشن نالہ کرنے لگے

(۱۱۵) کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں ۱ بھولا ہوں حق صحبت اہل کنشت کو
طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ ۲ دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسم ثواب سے ۳ ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سر نوشت کو
آئی اگر بلا تو جگہ سے نہیں ٹلے ۴ ایرا ہی دیکھے ہم نے بچایا ہے کشت کو

غالب کچھ اپنی سعی سے لینا نہیں مجھے
۵ خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

شعر (۱) کنشت۔ بتخانہ مطلب یہ ہے کہ میں نے جو اب کچھ دنوں سے کعبہ کو اپنا مسکن بنا لیا ہے تم مجھے طعن کیوں کرتے ہو؟ کیا میں نے یاران بتکدہ کی صحبتوں کو فراموش کر دیا ہے؟ نہیں بلکہ انکی یاد ویسی ہی تازہ ہے بقول شخصے

؎ کعبہ بھی گیا پر نہ گیا عشق بتوں کا
زمزم بھی پیا پر نہ بجھی پیاس جگر کی

شعر (۲) انگبیں۔ شہد۔ مولانا حالی فرماتے ہیں کہ جب تک بہشت قائم ہے لوگ عبادت اسی امید پر کرتے ہیں کہ شہد اور شراب طہور وغیرہ ملینگی پس بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہیئے تاکہ لالچ باقی نہ رہے اور لوگ خالصاً لوجہ اللہ عبادت کریں

شعر (۳) منحرف۔ ٹیڑھا۔ الگ تھلگ رہنا۔ منکر ہونا۔ سرنوشت۔ پیشانی کا لکھا۔ تقدیر۔ ثواب۔ نیکی جزائے خیر، جو آخرت میں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ میں رسم ثواب کا قائل نہیں ہوں کیونکہ یہ انحراف و سرکشی میری تقدیر میں لکھی ہوئی ہے کیونکہ میری سرنوشت جس قلم سے لکھی گئی تھی اس کا قط بھی ٹیڑھا ہی لگا تھا۔

شعر (۴) ایرا۔ ایراب۔ اردب۔ اردب ڈالنا ایک شطرنج کا محاورہ ہے۔ کشت سے بھی ایک اصطلاح شطرنج ہی اس جگہ مراد ہے یعنی جب شطرنج کی بازی میں بادشاہ کے مہرہ کو کشت آتی ہے تو اسکو بچانے کیلئے کبھی کبھی کوئی دوسرا مہرہ بیچ میں ڈالدیا کرتے ہیں اس کا نام اردب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم پر کوئی بلا نازل ہوتی ہے تو ہم خوفزدہ یا پریشان نہیں ہوتے بلکہ ہم نہایت استقلال و استقامت سے اس کا مقابلہ کرنے کیلئے ڈٹے رہتے ہیں اور ہماری اس ثابت قدمی نے ایک طرح سے ایراب کا کام دیا ہے۔

شعر (۵) سعی۔ کوشش۔ تدبیر۔ ملخ۔ ٹڈی۔ کشت۔ کھیتی۔ مطلب یہ ہے اے غالب مجھے اپنی کوششوں اور تدبیروں کا کبھی کوئی اچھا نتیجہ دیکھنا نصیب نہ ہوا اگر میری کھیتی کبھی ٹڈیوں کی تباہی سے بچ گئی اور میری محنت سے اس نے خرمن کی صورت بھی اختیار کر لی تو وہ خرمن ضرور جل کر رہا خواہ کسی دشمن نے آگ لگا دی یا بجلی گر پڑی یعنی ہمیشہ ناکامی و نامرادی ہی نصیبوں میں لکھی ہے مرزا صاحب نے دراصل تقدیر کے مقابلہ میں ناکامی تدبیر کا نقشہ کھینچا ہے بقول شخصے ؎

اپنی تدبیروں پہ گو ناداں بہت نازاں ہیں آج
درحقیقت جلوہ گر تقدیر ہے تدبیر میں!

یا ؎ کام بن بنکے بگڑ جاتا ہے اکثر اے تاج — کون کم بخت ہے جو قائل تقدیر نہیں
یا ؎ خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے — سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو
یا ؎ مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر — کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

(۱۱۶) وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہو ۱ — کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہو
چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا ۲ — ہے دل پہ بار نقش محبت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ ۳ ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو
پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا ۴ یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو
ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ ۵ اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو
ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال ۶ ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال ۷ حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو
وارستگی - بہانۂ بیگانگی نہیں ۸ اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو
مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی ۹ عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ
۱۰- اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

شعر (۱) وارستہ۔ بے پروا۔ آزاد مطلب یہ ہے کہ ہم اس خیال سے بے پروا ہیں کہ تم ہمارے ساتھ ضرور محبت ہی کرو۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ تعلق ضرور وابستہ رکھو خواہ عداوت ہی کیوں نہ کرو ایک اور شعر بھی آپ کا اسی مضمون کا ہے ؎

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

شعر (۲) اختلاط بمعنی ملاپ۔ رنگ، طاقت۔ مطلب یہ ہے کہ ضعف و ناتوانی نے اب مجھ میں اختلاط کی طاقت ہی نہیں رکھی، حتیٰ کہ دل پر اب نقشِ محبت بھی ایک قسم کا بوجھ معلوم ہوتا ہے۔

شعر (۳) شاعر کہتا ہے کہ مجھے ازراہِ غیرت یہ بھی گوارا نہیں کہ تو میرے سامنے غیر کی بھی شکایت کرے۔ کیونکہ اس طرح تذکرہ کرنے سے رقیب کی یاد تو تازہ رہتی ہے بقول مولانا آسی ؎

کرتے ہیں شبِ وصل وہ دشمن کی برائی
میں کہتا ہوں آخر وہ تمہیں آ ہی گیا یاد

شعر (۴) شاعر کہتا ہے کہ یہ جو دنیا میں مشہور ہے کہ خدا نے ہر درد کی دوا پیدا کی ہے لیکن میں پوچھتا ہوں

کہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو کیا وجہ ہے کہ درد دل یا غمِ الفت کا کوئی علاج نہ کر سکا۔

شعر (۵) خجالت۔ شرمندگی۔ مطلب یہ ہے کہ میری بیکسی نے مجھے کبھی کا ممنونِ احسان نہیں ہونے دیا یعنی جب میرا کوئی غمخوار دوست یار و مددگار اور پرسان حال ہی نہیں تو مجھے کسی کے سامنے شرمسار ہی کیوں ہونا پڑے گا۔ اگر نادم بھی ہوتا ہوں تو صرف اپنے دل ہی میں ہوتا ہوں۔

شعر (۶) انجمن کے لفظی معنی تو اجتماعِ ستارگان ہیں لیکن مجازاً مجلس و محفل مراد ہے۔ خلوت۔ تنہائی۔ مطلب یہ ہے کہ جب کسی محفل میں مختلف قسم کے لوگ جمع ہوتے ہیں تو مختلف قسم کی گفتگو کرتے ہیں لیکن حضرتِ انسان کا وجود بھی بجائے خود ایک محشرِ خیال ہے یعنی جب وہ تنہا خلوت نشین ہوتا ہے تو اسکے دل و دماغ پر قسم قسم کے تصورات و تخیلات کا ہجوم ہوتا ہے اسلئے اسکی خلوت بھی ایک قسم کی جلوت یا انجمن ہے۔ مرزا صاحب نے انجمن در خلوت کا مضمون لکھا ہے لیکن صوفیا خلوت در انجمن کے اصول پر کاربند ہیں یعنی بقول شخصے ؎

یہ دل کے تعلق پر موقوف سبھی کچھ ہے
کہتے ہیں جسے جلوت ہے اس میں بھی خلوت بھی

شعر (۷) ہنگامہ۔ وقت۔ مجمع۔ انفعال۔ منفعل ہونا۔ دوسروں کا اثر قبول کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ کسی غیر کا احسانمند ہونا ہمت کی برائی کا مظاہرہ ہے اسلئے دنیا سے کوئی چیز حتیٰ کہ عبرت بھی حاصل نہیں کرنی چاہیئے۔ کمالِ غیرت اور آزادگی کا مضمون ہے ذوق مرحوم فرماتے ہیں ؎

احسان ناخدا کے اُٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

یا ؎ میں مسیحا کا بھی منت کشِ احساں نہ رہا   درد کتنا ہے کہ شرمندۂ درماں نہ ہُوا

شعر (۸) مطلب یہ ہے کہ آزادگی یا تارک الدنیا ہونے کے یہ معنی نہیں کہ تم اہلِ دنیا سے قطع تعلقات کر لو ور اس بہانہ کی آڑ بنا کر وحشیانہ زندگی اختیار کرو۔ تمہارا یہ عذر و حیلہ صحیح نہیں ہے تو ایک قسم کی مجنونانہ حرکت ہے

ہماری رائے میں اگر قطع تعلق اور بیگانگی اختیار کرنا ہے تو اپنے نفس سے کرو۔ بقول شخصے ؎

یہ کہاں کا عشق ہے آزادیٔ صحرا نورد
کہدے مجنوں سے کہ چوٹے وہ مری زنجیر کو

شعر (۹) مطلب ہے کہ اگرچہ تمام زندگی عبادت الٰہی میں کیوں نہ ختم ہو جائے اور یہ مصرف زندگی ایک بہترین زندگی ہے لیکن زندگی کا ختم ہو جانا ایک ایسا غم ہے جو کبھی دل سے مٹ نہیں سکتا یعنی زندگی عبادت سے بھی زیادہ عزیز شے ہے

شعر (۱۰) مطلب ہے کہ اب تو ہم اس ظالم فتنہ گر کے در پر بیٹھ گئے ہیں نہ تو کسی کی نصیحت سے اٹھ سکتے ہیں اور نہ ہی کسی کے رعب سے اٹھ سکتے ہیں خواہ ہمیں کتنی ہی مصیبتیں برداشت کرنا اور کتنے ہی فتنوں سے سامنا کرنا پڑے۔
اس شعر میں لفظ فتنہ اور قیامت کی رعایت خوب لطف دے رہی ہے ایک اور شعر بھی اسی رنگ کا ہے ؎

تیرا دیوانہ اگر بر سر در بیٹھ گیا   یا تو در ہی نہ رہا یا نہ رہا سر اپنا

---

(۱۱۷) قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو ۱ ہرا ہونا برا کیا ہے نواسنجان گلشن کو
نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے ۲ نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو
نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر ۳ کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگان سوزن کو
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں ۴ کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو
ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں ۵ نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو
ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا ۶ کیا بیتاب کاں میں جنبش جوہر نے آہن کو
خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے ۷ سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو
وفاداری بشرط استواری عین ایماں ہے ۸ مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو
شہادت تھی مری قسمت میں دی تھی یہ خو مجھ کو ۹ جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا ہوں گردن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر ہوتا ۱۰ رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو
سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے ۱۱ جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

مرے شاہ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب
۱۲ فریدوں و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

شعر (۱) قفس۔ پنجرہ۔ شیون۔ نالہ و فریاد۔ نوا سنجان گلشن گلشن کے خوش الحان پرندے۔ مطلب یہ ہے کہ میں تو ایک طائر پابند قفس کی صورت میں ہوں۔ دیگر طائران چمن جو آزادی سے نغمہ سرائی کر رہے ہیں اور بہار گلشن کے مزے لوٹ رہے ہیں میری نالہ سرائی سے انہیں کیا نقصان پہنچ سکتا ہے میں تو اسیر قفس ہوں تاہم کہ میرا شیون انہیں پسند نہیں۔

شعر (۲) ہمدمی۔ دوستی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تو سچ ہے کہ میرے رقیب کو میرے محبوب کا ہمدم و ہم جلیس ہونا میسر نہیں آ سکتا لیکن میرے لئے یہ خیال بھی کیا کم باعث مصیبت ہے کہ میرے رقیب کو میرے محبوب کی دوستی کی آرزو ہے پس اے خدا تو نے میرے رقیب کو یہ آرزو ہی نہ دی ہوتی تو اچھا تھا۔

شعر (۳) جراحت۔ زخم۔ خونچکاں۔ خون ٹپکانے والا۔ مطلب یہ ہے کہ اے بیرحم تو کیسا سنگدل ہے کہ جس زخم کو سیتے ہوئے دیکھ کر سوئی کی پلک سے خون ٹپکنے لگا اس پر تیری آنکھ سے ایک آنسو تک نہ نکلا اس شعر میں سینے کا لفظ خاص طور پر معنی خیز ہے۔ سینے سے مراد سینا اور سینہ دونوں لئے جا سکتے ہیں۔

شعر (۴) مطلب یہ ہے کہ میرے ہاتھوں کو شرم آئے کہ ہر وقت کسی نہ کسی کھینچا تانی میں لگے رہتے ہیں بحالت فراق تو جذبۂ دیوانگی سے میرے گریبان کی دھجیاں اڑاتے ہیں اور اگر وصال کے بعد معشوق رخصت ہونا چاہتا ہے تو اس کا دامن کھینچ لیتے ہیں کہ ذرا اور ٹھہر جاؤ۔

شعر (۵) شناور۔ تیرنے والا۔ جوئے خوں، خون کی ندی۔ توسن۔ گھوڑا۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی تک تو ہم قتل گاہ کا نظارہ ہول انگیز اور خوفناک نہیں سمجھتے کیونکہ ابھی تک ہم نے قتل عشاق سے خون کی ندی بہتے ہوئے اور اس میں تیرے گھوڑے کو تیرتے نہیں دیکھا ہے۔

شعر (۶) کاں، کان - آہن، لوہا۔ مطلب کہ میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا جب شہرہ ہوا تو لوہے کے جوہر نے لوہے کو اپنی کان یعنی معدن میں بیقرار کر دیا کہ کیا اچھا ہو جو ایسے دیوانے کے پاؤں کی زنجیر بننے کا مجھے شرف حاصل ہو۔

شعر (۷) مطلب ہے کہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ابھی بارش ہو کر کھیتیوں کو سر سبز و شاداب کر دیگی۔ لوگ خوش ہو رہے ہیں لیکن مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے اس سے کوئی خوشی حاصل نہیں یعنی اگر اس قسم کا ابر سو دفعہ بھی میرے کھیت پر آئے تو مجھے یہ کھٹکا بھی تو لگا ہوا ہے کہ بجلی ابھی سے میرے خرمن کو تباہ کرنے کیلئے بیتاب ہو رہی ہے مجھے ایسے ابر کی کیا خوشی ہو سکتی ہے۔

شعر (۸) مولانا حالی فرماتے ہیں کہ اگر برہمن اپنی ساری عمر بتخانہ میں کاٹ دے اور وہیں مر رہے تو اس بات کا مستحق ہے کہ اسکو کعبہ میں دفن کیا جائے کیونکہ اسنے وفاداری کا حق پورا پورا ادا کر دیا اور یہی ایمان کی اصل ہے

شعر (۹) یعنی میری قسمت میں شہید محبت ہونا مقدر ہو چکا تھا کیونکہ فطرتاً میری عادت میں یہ داخل تھا کہ جہاں تلوار دیکھتا گردن ختم کر دیتا۔

شعر (۱۰) مطلب کہ جب دن کیوقت میرا سارا اثاثۃ البیت لوٹا گیا تو اب میں بیفکر ہو گیا کہ رات کو اب مجھے کون لوٹنے آیگا مزے سے اب تو آرام کی نیند سوؤنگا اسلئے رہزن کو دعا دیتا ہوں کہ اُسنے مجھے فکر و تشویش سے آزاد کر دیا

شعر (۱۱) مطلب ہے کہ ہم جو خونِ جگر پی کر اعلیٰ سے اعلیٰ اشعار لکھ سکتے ہیں جو بمنزلہ جواہر کے ہیں۔ تو پھر ہمیں کان جواہر جا کر کھودنے کی کیا ضرورت ہے؟

شعر (۱۲) فریدوں۔ وہ بادشاہ جو ضحاک کو قتل کر کے تخت نشین ہوا تھا۔ جم۔ بادشاہ جمشید۔ کیخسرو چار مشہور بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ۔ داراب، یہ بھی ایک بادشاہ ہے جو بہمن کا بیٹا تھا اور بہمن اسفندیار کا بیٹا تھا۔ مطلب کہ ہم نے یہ مانا کہ یہ تمام بادشاہ بہت بڑے جلیل القدر بادشاہ تھے لیکن میرے ممدوح بادشاہ سلیماں جاہ سے کیا نسبت کیونکہ سلیمان علیہ السلام تو جن و انس اور چرند و پرند کے بھی بادشاہ تھے۔ بلحاظ شان و شکوہ اور اختیار کے اپنے ممدوح کو سلیماں جاہ کہا ہے اور حضرت سلیمان سے تشبیہ دی ہے۔

(۱۱۸) دھوتا ہوں میں جو پینے کو اس سیمتن کے پانو ۱
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو
دی سادگی پہ جان پڑوں کوہکن کے پانو ۲
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو
بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ ۳
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو
مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور ۴
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو
اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ ۵
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو
ہے جوش گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف ۶
اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغ چمن کے پانو
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں ۷
دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پانو
غالب مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو ۸
پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پانو

شعر (۱) پاؤں دھو کر پینا ایک عام مشہور محاورہ ہے جو اظہار خلوص و عقیدت کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ مطلب ہے کہ میں تو اظہار خلوص محبت کیلئے اپنے محبوب کے پانو دھو کر بھی پینا چاہتا ہوں لیکن میرے ہر فعل محبت کے ساتھ ضد ہے کہ وہ پانو دھونے کے وقت اپنے پاؤں لگن سے باہر کھینچ لیتا ہے تاکہ مجھے اسکے پاؤں کا دھوون بھی نصیب نہ ہو۔

شعر (۲) کسی کے پاؤں پڑنا بھی ایک محاورہ ہے۔ سادگی، سادہ لوحی۔ کوہکن۔ فرہاد۔ عاشق شیریں۔ پیرزن وہ بوڑھی مکار عورت جس نے فرہاد کو آکر شیریں کے مرنے کی جھوٹی خبر سنائی تھی اور فرہاد نے اسے سچ سمجھ کر بغیر تحقیق اپنی جان دیدی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ فرہاد نے سادگی سے پیرزن کے دھوکے اور چال میں ناحق اپنی جان دیدی مجھے کوہکن کی اس کمال سادگی پر اسکے پاؤں پڑنا چاہیئے اور ہائے افسوس اس مکار عورت کے پاؤں کیوں نہ ٹوٹ گئے کہ وہ کوہکن تک پہنچ کر یہ جھوٹی خبر نہ سناتی اور کوہکن بیچارہ جان نہ دیتا۔

شعر (۳) رہزن جو راستہ میں مسافروں کو لوٹے مطلب یہ ہے کہ ہم نے تو شہری زندگی چھوڑ کر صحرا نوردی اختیار کی تھی لیکن راہزن نے نہ صرف ہمارا سامان لوٹا بلکہ ہمیں قید کر کے غلام بنالیا اور ہمارے ذمے یہ خدمت سپرد کی ہوئی ہے کہ اس

کے پاؤں دبایا کریں۔ پس یہ ہمیں بھاگنے کی سزا ملی ہے۔

شعر (۴) نگار۔ زخمی خستہ تن۔ زخمی بدن۔ مطلب ہے کہ میں تو اس لئے مارا مارا پھرا کہ کہیں سے جسم کے زخموں کیلئے مرہم مل جائے لیکن مرہم تو ملنے سے رہا اُلٹا پھر پھر کر پاؤں اسقدر زخمی ہو گئے کہ بدن کے زخموں کی اسکے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں۔

شعر (۵) یعنی میرے صحرا بصحرا پھرنے کی لذت نے میرے پاؤں کو ایسا خوگر رفتار کر دیا ہے۔ کہ مرنے کے بعد بھی میرے کفن کے اندر خود بخود پاؤں ہل رہے ہیں۔

شعر (۶) مطلب ہے کہ ایکے چمن میں اس شان سے بہار آئی ہے اور گلشن افراط نمو سے ایسا گنجان ہو گیا ہے کہ طائرانِ چمن کے پاؤں اڑتے ہوئے اس میں اُلجھ جاتے ہیں اور وہ اُڑ نہیں سکتے۔

شعر (۷) کمال مبالغہ ہے کہ آج اس نازک بدن کے جو پاؤں دکھ رہے ہیں شاید کسی کے خواب میں نہ گیا ہو کیونکہ وہ ایسا پردہ نشین ہے کہ کبھی گھر کے باہر قدم نہیں نکالتا۔

شعر (۸) گو اس شعر میں الفاظ شیریں خسرو میں رعایت لفظی مضمر ہے لیکن دراصل اس جگہ حضرت امیر خسرو شاعر شیریں سخن مراد ہیں البتہ یہ معنی بھی پیدا ہو سکتے ہیں کہ خسرو سے بادشاہ ظفر مراد لی جائے کیونکہ خسرو بادشاہ کے معنوں میں آتا ہے اور بہادر شاہ ظفر شاعر بھی تھے اب شعر کا مطلب صاف ہو گیا۔

(۱۹) واں اُنکو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار ۱ یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ ۲ آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

شعر (۱) ہول۔ خوف۔ مطلب ہے کہ اس نازنین کو جو ہولِ دل ہے تو میں اس سے خود ہی شرمندہ ہوں کہ شاید اس کا یہ خوف میری آہ کی تاثیر کے باعث سے نہ ہو۔

شعر (۲) نخچیر۔ شکار۔ تاکہ یعنی جب تک۔ مطلب ہے کہ اس بیرحم کا ذوقِ ستم دیکھنے کے قابل ہے کہ جب تک کسی شکار یعنی عاشق کی آنکھ کا آئینہ نہ ہو اپنی صورت ہی نہیں دیکھتا اور آرائش ہی نہیں کرتا اسکے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں

جبتک اسے یہ معلوم نہو جائے کہ میرا کوئی نیا طالب دیدار پیدا ہوا وہ اپنی صورت نہیں دیکھتا اور جب کوئی نیا عاشق پیدا
تا ہے تو پھر وہ آئینہ میں ضرور اپنی صورت دیکھتا ہے کہ شاید آج میرے حسن میں کوئی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔

(۱۲۰) واں پہنچکر جو غش آتا پیہم ہے ہم کو ۱ صدرہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو
دلکو میں اور مجھے دل محو وفا رکھتا ہے ۲ کس قدر ذوق گرفتاری ہم ہے ہم کو
ضعف سے نقش پے مور ہے طوق گردن ۳ تیرے کوچے سے کہاں طاقت رم ہے ہم کو
جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو ۴ یہ نگاہ غلط انداز تو سم ہے ہم کو
رشک ہم طرحی و درد اثر بانگ حزیں ۵ نالۂ مرغ سحر تیغ دو دم ہے ہم کو
سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا ۶ ہنسکے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو
دلکے خون کرنیکی کیا وجہ ولیکن ناچار ۷ پاس بے رونقیٔ دیدہ اہم ہے ہم کو
تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو ۸ ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو
لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی ۹ ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر ۱۰ عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو
لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
۱۱- جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

شعر (۱) پے ہم یعنی پیہم۔ لگاتار۔ متواتر۔ صدرہ۔ سو طرح سے مطلب یہ ہے کہ کوچۂ محبوب میں مجھے جو پے در پے غش آتا ہے اسکی غرض غایت یہ ہے کہ میں کس طرح سے اپنی قدمبوسی کروں کیونکہ انہیں قدموں کی بدولت مجھے کوچۂ محبوب نصیب ہوا۔ آسی صاحب۔ قاضی صاحب اور جناب نظم نے اس شعر سے قریب قریب یہی معنی کئے ہیں لیکن ہمیں ان معنوں اور شرح میں تامل ہے اگر اس اختلاف کو درج کیا جائے تو بحث بہت طویل ہو جائے گی۔

شعر (۲) ہم بمعنی غم۔ مطلب یہ ہے کہ میں دلکو اور دل مجھے راہ وفا میں ثابت قدم رکھنے کیلئے مست

خیال رکھنا ہے پس اسی سے اندازہ لگا لیجیے کہ ہمیں گرفتارِ غم رہنے میں کس قدر لذت حاصل ہوتی ہے۔

شعر (۳) نقش پے مور۔ چیونٹی کا نقشِ قدم۔ رم۔ بھاگنا۔ مطلب یہ ہے کہ جس ضعیف ناتوان کیلئے چیونٹی کے پاؤں کا نشان بھی طوقِ گردن بنجاتا ہے اس میں طاقت ہی کہاں ہے کہ وہ تیرے کوچہ سے بھاگ سکے

شعر (۴) تغافل۔ انجان ہونا۔ نگاہِ غلط انداز۔ غلطی سے یا بھول کر کسی چیز کی طرف دیکھنا۔ سم۔ زہر مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے انجان ہی بننا ہے تو جان بوجھکر انجان بنو کیونکہ اس انداز میں ایک قسم کی لگاوٹ تو پنہاں ہے
بقول شخصے ؎ دل چُرا کر مرا نادان بنے بیٹھے ہیں   جان لیکر مری انجان بنے بیٹھے ہیں

یعنی عمداً تغافل سے کام لو گے تو کبھی نہ کبھی محبت کی امید ہو سکتی ہے ورنہ یہ نگاہ نادانستہ تو ہمارے لئے زہر قاتل ہے۔ بقول شخصے ؎ ہے ہے وہ نگاہ غلط انداز کسی کی
"قاتل نے دیا چپکے سے چرکا مرے دل میں

شعر (۵) تیغ دودم۔ وہ تلوار جسکے دونوں طرف دھار ہو۔ ہم طرحی۔ ایک جیسا ہونا۔ بانگ۔ آواز حزیں غمناک۔ مطلب یہ ہے کہ نالۂ مرغِ سحر میرے لئے تیغ دودم کا کام دیتا ہے کیونکہ جس طرح میں نالہ کرتا ہوں اسی طرح وہ نالہ کرتا ہے اور مجھے رشک پیدا ہوتا ہے کہ شاید یہ بھی میرے معشوق کا عاشق ہے اور دوسرے اسکی آواز ایسی دردناک اور غمگین ہے کہ میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شعر (۶) اس شعر میں "ترے سر کی قسم ہے ہم کو" اس جملہ کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہم ضرور اڑا دینگے اور دوسرے یہ کہ ہم کو تیرے سر کی قسم ہے یعنی کبھی ہم تیرا سر نہ اڑائینگے جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے یہاں کھانے کی قسم ہے یعنی کبھی ہمارے یہاں کھانا نہیں کھاتے (یادگار غالب)

شعر (۷) اہم۔ نہایت ضروری۔ مطلب یہ ہے کہ دل کے خون کرنے کی اور تو کوئی وجہ نہیں لیکن اس بات سے مجبور ہیں کہ ہم کو اپنی آنکھوں کا بے رونق رکھنا منظور نہیں یعنی آنکھوں کا خون آلود ہونا اور اسکا خوں بہانا ہم رونقِ چشم سمجھتے ہیں۔

شعر (۸) مطلب یہ ہے کہ تم ایسے نازک خیال ہو کہ ہماری خاموشی کو بھی فغاں سے تعبیر کرتے ہو اور ہم ایسے عاجز و ناتواں ہیں کہ تمہارے ترک ستم اور تغافل کو بھی ایک قسم کا ستم سمجھتے ہیں۔

شعر (۹) جب مرزا غالب کی عمر کچھ کم چالیس برس کی تھی تو کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ میں بھی ٹھہرے تھے اور غالباً یہ غزل وہیں لکھی ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم پر لکھنؤ آنے کا کچھ سبب ظاہر نہیں ہوتا اگر لوگوں کا یہ خیال ہو کہ ہم محض سیر و تماشا کیلئے آئے ہیں تو یہ غلط بات ہے کیونکہ ہمیں اس قسم کی حسرت ہی نہیں۔

شعر (۱۰) یہ شعر بھی شعر بالا کی ایک کڑی ہے مطلب یہ ہے کہ صرف اس شعر میں ہمارے ارادۂ سفر کے سلسلہ کا انقطاع نہیں ہو سکتا بلکہ ہمارا ارادہ تو سیر نجف اور طوف حرم کرنے کا ہے۔

شعر (۱۱) یہ شعر بھی شعر بالا کی تیسری کڑی ہے مطلب یہ ہے کہ ہم کو ایک خاص توقع اور تمنا کہیں لیے جاتی ہے اور کسی کے کاف کرم کی کشش راہ راست کا پتہ دے رہی ہے۔ لفظ کشش اس جگہ ذو معنی واقع ہوا ہے۔

(۱۲) تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو ۱ مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
بچتے نہیں مواخذۂ روز حشر سے ۲ قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو
کیا وہ بھی بیگنہ کش و حق ناشناس ہیں ۳ مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو
ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار ۴ مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید ۵ مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست ۶ لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو
غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
۷
دنیا ہو یارب اور مرا بادشاہ ہو

شعر (۱) یعنی غیر سے تمہارے جو تعلقات ہیں ہمیں اسپر کوئی اعتراض نہیں، تم جانو اور تمہارا کام، لیکن اسکے ساتھ ہی اگر کبھی کبھی میرا بھی حال پوچھتے رہو تو کیا برائی ہے۔

شعر (۲) مواخذہ۔ گرفت، پرسش۔ مطلب ہے کہ قیامت کے دن تم میرے قتل و سازش کے الزام سے بری نہیں ہو سکتے یہ مانا کہ تم نے اپنے ہاتھوں سے مجھے قتل نہیں کیا ہے لیکن اگر رقیب نے بھی قتل کیا ہے تو تمہارے ایما و سازش سے کیا ہے اور تمہارے سامنے کیا ہے اور تم قتل کے گواہ ہو۔

شعر (۳) مطلب ہے کہ معشوق کہتا ہے کہ ہمیں بشر خیال کرنا صحیح نہیں بلکہ ہم تو آفتاب و ماہتاب ہیں اور سراپا نور ہیں لیکن مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اگر تمہارا یہ دعویٰ صحیح ہے تو یہ تو فرمائیے کہ آفتاب و ماہتاب بھی تمہاری طرح بے گناہوں کو قتل کیا کرتے ہیں اور حق بات کو پسند نہیں کیا کرتے؟

شعر (۴) مرزا صاحب انتہائے بدگمانی سے فرماتے ہیں کہ معشوق کے نقاب میں جو ایک تار ابھرا ہوا ہے مجھے شک ہے کہ وہ کسی کا تار نگاہ نہ ہو۔

شعر (۵) مولانا حالی فرماتے ہیں کہ اس شعر میں ازراہ تہذیب اس کام کا ذکر نہیں کیا جس کے کرنے کیلئے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار دیا ہے۔ مطلب ہے کہ میکدہ جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا جب وہی چھوٹ گیا تو اب مسجد میں مل جائے تو اور مدرسہ و خانقاہ میں ہاتھ آ جائے تو سب جگہ پی لینا برابر ہے۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص ازراہ شوخی کی گئی ہے یعنی یہ مقامات جو اس شغل کے بالکل لائق نہیں وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے۔

شعر (۶) مطلب ہے کہ حضرت واعظ جو بہشت کی تعریفیں فرما رہے ہیں کہ وہاں پھل پھول سے لدے ہوئے باغات ہونگے۔ نہریں جاری ہونگی۔ حوریں ہونگی وغیرہ وغیرہ لیکن مرزا صاحب کہتے ہیں کہ خدا کرے تو اس میں جلوہ افروز ہو اور اگر وہ بہشت تیری جلوہ گاہ نہیں تو ہمارے کس کام کی۔ بقول شخصے ؎

ہم جاکے کیا کرینگے گر واں صنم نہ ہوگا　　اپنے لئے ارم بھی دوزخ سے کم نہ ہوگا

شعر (۷) مطلب ہے کہ غالب اپنے بادشاہ پر جان تک قربان کرنے کیلئے تیار ہے۔ یعنی غالب کی عمر بھی بادشاہ کی عمر میں شمار کی جائے۔

(۱۲۲) کبھی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو ۱ کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو
ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال ۲ کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو
ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے ۳ حیا ہے اور یہی گو مگو تو کیونکر ہو
تمہیں کہو کہ گزارہ صنم پرستوں کا ۴ بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو
الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ ۵ جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا ۶ وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو
ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قدر ۷ ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو
غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا ۸ نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو
بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار ۹ یہ نیش ہو رگ جاں میں فرو تو کیونکر ہو
مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقول حضور
۱۰
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

شعر (۱) پہلے تو یہ فکر تھی کہ کسی طرح اس سے ہمکلام ہونے ہی کا موقع مل جائے یعنی یہ خیال تھا بقول شخصے

یقین ہے سن کے انہیں رحم آہی جائیگا عیاں جو آپ پہ سب حال زار کر دینگے

لیکن افسوس کہ ہمارا یہ حملہ بھی بیکار گیا اس نے ہمارا تمام ماجرائے درد محبت سن بھی لیا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے لہذا اب بتاؤ کہ کیا تدبیر کی جائے؟

شعر (۲) مطلب یہ کہ ہمیں وصال کا تو موقع ہی نہیں ملتا لیکن ہمارا یہ خیالی پلاؤ پکانا کہ اگر ہمیں وصال نصیب نہ ہوگا تو ہماری کیونکر بسر ہوگی اور وصال میسر آگیا تو پھر کیسے مزے سے گزریگی۔ ہمارا اسی ادھیڑ بن اور ہر وقت محو تخیلات وصال رہنا ہی ہمارے لئے بمنزلہ وصال کے ہے۔ بقول شخصے

شب وعدہ نہیں معلوم کیا کیا لطف حاصل ہوں تصور ہی میں لیتی ہے مزے میری زبان کیا کیا

شعر (۳) مطلب یہ ہے کہ اگر ہم اظہارِ تمنّا کرنا بھی چاہیں تو ادب مانع ہوتا ہے اور ہم گومگو میں رہ جاتے ہیں اور اُدھر وہ ہم سے کھُل کر ملنا چاہیں تو حیا ستّرِ راہ ہوتی ہے الغرض ہم عجیب کشمکش میں مبتلا ہیں۔

شعر (۴) مطلب یہ ہے کہ تم ہی انصاف سے کہو کہ اگر دوسرے حسینوں اور معشوقوں کی بھی ایسی ہی خصلتیں اور عادتیں ہوں کہ جیسی تمہاری ہیں تو پھر عاشق مزاجوں اور حسن پرستوں کی کس طرح گذر ہو اور کیوں کوئی کسی کا عاشق اور کوئی کسی کا معشوق بنے گا۔

شعر (۵) اس کا مطلب ایک تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تم اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر فی الواقع ایک دو تم جیسے حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو (یادگار غالب)

شعر (۶) اس شعر کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ میرا بخت سیاہ شبِ تاریک سے بھی زیادہ سیاہ ہے یعنی اس روزِ سیاہ کے مقابلہ میں ہم اپنی شبِ تاریک کو دن تصوّر کرتے ہیں۔

شعر (۷) مطلب یہ ہے کہ جب وہ ہماری بات ہی نہ پوچھیں تو ہمیں ان سے کس قسم کی امید ہو سکتی ہے اور انہیں ہماری کیا قدر ہو سکتی ہے؟

شعر (۸) مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہ خیال غلط نہ تھا کہ اگر ہمارا محبوب ہمیں کوئی مکتوبِ محبت بھیجے اور آنے کا وعدہ کریگا تو ہمارے دلکو ضرور تسکین و اطمینان حاصل ہوگا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہماری طالبِ دیدار آنکھیں نہیں مانتیں اور وہ کہتی ہیں کہ ہمارا شوقِ دیدار اور بڑھ گیا ہے۔

شعر (۹) مطلب یہ ہے کہ کوئی مجھے یہ تو بتلائے کہ اسکی پلکوں کو دیکھ کر مجھے کیونکر قرار آسکتا ہے گویا یہ ایک نشتر یا تیر ہے جو رگِ جان میں اترا ہوا ہے جس سے قرار آنا غیر ممکن ہے۔

شعر (۱۰) مصرعہ ثانی بادشاہ ظفر کا دیا ہوا مصرعہ طرح ہے جس پر مرزا غالب نے یہ غزل لکھی ہے۔

(۱۲۳) کسیکو دیکے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو ۱ نہ جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
وہ اپنی خو نہ چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں ۲ سبک سر ہوکے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو ۳ نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو
وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا ۴ تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم ۵ گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ ۶ کہ جب دل میں تمہی تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے ۷ نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ۸ ہوئے تم دوست جسکے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو
یہی ہے آزمانا تو ستانا کسکو کہتے ہیں ۹ عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو
کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی ۱۰ بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
۱۱۔ ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

شعر (۱) مطلب یہ ہے کہ کسی پر عاشق ہو کر یعنی کسی کو دل دیکر کوئی نالہ سرائی کیوں کرے اور جب پہلو میں دل نہیں رہا تو منہ میں زبان بھی نہیں رہنی چاہیئے۔ یعنی شکایت بھی نہیں کرنی چاہیئے۔

شعر (۲) سبک سر۔ ہلکا ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ انکی عادت میں تو یہ داخل ہے کہ وہ اینٹھے رہیں بگڑے رہیں اور ہماری وضعداری یہ ہے کہ ہم ضبط و تحمل سے کام لیتے رہیں پس جب نہ وہ اپنی عادت کا ترک کر سکتے ہیں اور نہ ہم تو پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم ان سے جاکر یہ دریافت کریں کہ آپ ہم سے کیوں ہمیشہ خفا رہتے ہیں ہمارا ایسا فعل سراسر سبکی اور خفت میں داخل ہے بقول شخصے ؎

وہ کب ٹلیگا جس کا روٹھنا فطرت میں داخل ہو کوئی کہدے کہ چوبِ خشک کا بھی خم نکلتا ہے؟

شعر (۳) مطلب یہ ہے کہ میرے ہمدرد و غمخوار نے تو الٹا مجھے بدنام کر دیا یعنی جس شخص کو ہم نے اپنا راز داں بنا کر اپنے عشق و محبت کا ماجرا یعنی درد و غم سنایا تو وہ بیچارہ ایسا بےچین و بےقرار ہو گیا کہ ہر کس و ناکس سے ہمارا قصۂ عشق و محبت بیان کرنے لگا۔ پس ایسی محبت چولہے میں جائے اور میں ایسے راز داں سے باز آیا۔

شعر (۴) یعنی جب ہمارے جنونِ عشق کا یہی علاج ہے کہ ہم سر پھوڑ لیں تو چین آئے تو پھر وفا کیسی اور کہاں کا عشق؟ جہاں دل چاہے گا اپنا سر پھوڑ لینگے اس میں صرف تیرے سنگِ آستان کی اے ظالم سنگدل کیا تخصیص ہے لیکن "دیوانہ بکار خود ہشیار" والے مقولہ پر عمل کرنیوالے عاشق تو اس طرح کہتے ہیں ؎

جو سودائے الفت کا چارہ یہی ہے
تو سر تیرے زانو پہ ٹپکا کریں گے

شعر (۵) روداد۔ ماجرا۔ کیفیت۔ حالات۔ مطلب اس شعر کا مختصراً یہ ہے کہ ایک پرندہ عرصہ سے ایک قفس میں بند ہے اور اسے چمن اور اپنے آشیانہ کی کچھ خبر نہیں ایک آزاد پرندہ چمن سے اڑتا ہوا آ کر اسکے سامنے بیٹھ جاتا ہے اور اسیرِ قفس طائر سے روداد چمن سناتے ہوئے کچھ جھجکتا اور دل میں خوف کھاتا ہے کہ کہیں سنکر ہلاک نہ ہو جائے حالانکہ طائرِ مقید نے کل بجلی گرتے ہوئے ضرور دیکھی ہے پھر بھی یہ کمال ضبط سے کام لیتے ہوئے کہتا ہے کہ مجھ سے چمن کی حالت بیان کرتے ہوئے کیوں ڈرتے ہو۔ وہ بجلی جو کل گری ہے کیا یہ ضروری ہے کہ وہ میرے ہی آشیانے پر گری ہو۔

شعر (۶) مصرعہ اولیٰ میں استفہام انکاری ہے یعنی تم یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ ہم تیرے دل میں نہیں ہیں جب یہ مسلمہ امر ہے کہ آپ ضرور ہمارے دل میں ہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تم ہی تم دل میں ہو تو پھر آنکھوں سے کیوں نہاں ہو؟ ایک صاحب اس طرح بھی کہتے ہیں ؎

یوں تو کہتے ہو کہ شہ رگ سے بھی نزدیک ہیں ہم
جائے حیرت ہے کہ پھر آنکھ سے کیوں دور ہوئے

شعر (۷) جذب۔ کشش۔ مطلب یہ ہے کہ ہم سے جو تم ہمارے جذبِ دل کا شکوہ کر رہے ہو کہ تمہاری کشش محبت سے ہم تکلیف میں ہیں یہ سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر تم ہی ہم سے کشیدہ خاطر نہ ہو اور ہم سے کھنچے کھنچے نہ رہو تو پھر یہ کشاکش کیوں ہو یعنی ادھر ہمارا جذبِ دل تمہیں کھینچتا ہے اور ادھر تم آپ کھینچتے ہو یہی تکلیف ہے

شعر (۸) مطلب یہ ہے کہ جب کے تم دوست یعنی معشوق بنجاؤ۔ پھر اس کا آسماں کیوں دشمن ہو آپ کی دوستی اور آپ کا عشق کیا کسی کی خانہ ویرانی اور تباہی کے لئے کچھ کم ہے۔ یہ بھی تو ایک فتنہ ہے۔

شعر (۹) مطلب یہ ہے کہ جب تمہارا ہمارا قطع تعلق ہو چکا ہے اور بجائے ہمارے تم ہمارے دشمن کے دوست بن گئے تو پھر ہمیں آپ کیوں ستاتے ہیں اور پھر اس پر یہ کہنا کہ ہم تو اس کا امتحان لے رہے ہیں لیکن ہمارے خیال میں یہ امتحان نہیں تو محض ستانا ہے اور پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم سے کوئی تعلق و واسطہ ہی نہیں تو پھر ہمارا امتحان کیا۔ مرزا داغ بھی اس مضمون کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

ہو چکا قطع تعلق تو جفائیں کیوں ہوں   جنکو مطلب نہیں رہتا وہ ستاتے بھی نہیں

شعر (۱۰) مطلب یہ ہے کہ عاشق اپنے معشوق سے کہتا ہے کہ تم نے یہ جو کہا ہے کہ غیر کیساتھ تعلقات قائم رکھنے میں میری کیا رسوائی ہو گی۔ ہاں صاحب آپ صحیح فرماتے ہیں، بجا فرماتے ہیں لیکن ذرا پھر تو کہو کہ ہاں کیوں رسوائی ہو گویا اس طرح معشوق اپنے عاشق کو گذشتہ واقعات یاد دلانا چاہتا ہے۔

شعر (۱۱) شعر صاف ہے مطلب صرف اتنا ہے کہ تیرے ان طعنوں سے کام نہیں چلنے کا تم لاکھ دفعہ اسے بے مہر کہو وہ ان باتوں سے متاثر ہو کر کیوں مہربان ہونے لگا کیونکہ مہربان ہونا اسکی فطرت ہی میں نہیں ہے۔

(۱۲، ۱۳، ۱۴) رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو   ۱   ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیئے   ۲   کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار   ۳   اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

شعر (۱) دراصل مرزا صاحب نے اپنے اس قطعہ میں اپنی اس بیزاری کا اظہار کیا ہے جو انکے دوست و احباب کے منافقانہ رویّہ اور جھوٹی ہمدردی سے پیدا ہوئی تھی مطلب صاف ہے کہ اب ہم دنیا والوں سے تنگ آ گئے ہیں اس لئے اب ایسی جگہ چل کر رہنا چاہتے ہیں جہاں کوئی انسانی ذات نہو اور نہ ہماری بولی سمجھنے والا ہو اور نہ ہی کوئی بات چیت کرنے والا تاکہ کوئی رنج نہ پہنچ سکے انسانی تعلقات سے انتہائی نفرت کا اظہار ہے۔ مرزا صاحب یہ اپنے زمانہ کی بات

کہتے ہیں حالانکہ ان کا زمانہ ہمارے زمانہ سے پھر بھی بہتر تھا۔

شعر (۲) یہ شعر بھی شعر اول ہی کی دوسری کڑی ہے یعنی مرزا صاحب پڑوسیوں کی شرارتوں اور دل آزاریوں سے تنگ آکر کہتے ہیں کہ مکان ایسا بنانا چاہیئے کہ جس کا نہ دروازہ ہو اور نہ دیوار ہو نہ کوئی ہمسایہ ہو گا نہ پاسبان۔ مطلب ہے کہ صحرا نشین ہو جاؤ۔

شعر (۳) یہ شعر بھی شعر بالا کی تیسری کڑی ہے یعنی جنکے ہاتھوں رنج پہنچ چکا ہے اپنی بیماری میں انکی تیمارداری اور مرجانے پر انکی نوحہ خوانی بھی پسند نہیں۔ کیونکہ یہ سب منافق ہیں اصل بات یہ ہے کہ ہم مرتے دم بھی ان کی صورت دیکھنا نہیں چاہتے۔

ردیف "ہ"

(۱۲۵) از مہر تا بہ ذرّہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

شعر (۱) جناب طباطبائی صاحب فرماتے ہیں کہ عالم میں رخ و رخ اور دل و دل باہمدگر آئینہ ہیں یعنی اس کو اس میں اپنی صورت دکھلائی دیتی ہے اور اسکو اس میں غرض یہ ہے کہ سارا عالم متحد بوجود واحد ہے اور ایک کو دوسرے سے غیریت نہیں تو اس میں اپنے تئیں اس طرح دیکھتا ہے جیسے آئینہ میں کوئی دیکھے جب یہ حالت ہے تو طوطی جس طرف رخ کرے آئینہ سامنے موجود ہے اور طوطی محض استعارہ ہے مراد اس سے وہ شخص ہے جسے یہ اتحاد دکھائی دے اور وجد حال میں نعرہ انا الحق بلند کرے

بقول شخصے ؎ شوق سے آئینہ دل کا جو مجلّی کرے
اپنی صورت پہ فدا آپ ہی انسان ہو گا

(۱۲۶) ہے سبزہ زار ہر در و دیوار غمکدہ ا جس کی بہار یہ ہو پھر اسکی خزاں نہ پوچھ
ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے دشواری رہ و ستم ہمرہاں نہ پوچھ

شعر (۱) مطلب ہے کہ میں نے اس کثرت سے غم کے ہاتھوں گریہ زاری کی ہے جس نے برسات کو مات

کر دیا ہے اور تمام گھر نمناک ہو کر اس میں سبزہ اُگ آیا ہے ورنہ کچھ یا میرے گھر کی بہار ہے پس اندازہ لگا لیجئے کہ جس کی بہار ایسی ہے اسکی خزاں کیسی ہو گی یعنی میرے گھر کی ویرانی کا کیا حال ہو گا مرزا صاحب نے اس قسم کے سبزہ کا کئی جگہ ذکر فرمایا ہے مثلاً

ع اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ ویرانی تماشا کر   مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
یا ع اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ   ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

شعر (۲) قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ کسی مقام کے سفر میں مرزا صاحب کو راستہ کی تکلیف اور ہمراہیوں کی بدسلوکی سے سابقہ پڑا تھا اسی پر یہ شعر کہا ہے مطلب ہے کہ ایک تو راستہ ہی دشوار تھا اور اس پر طرّہ یہ کہ ہم کو جو ساتھی ملے وہ بھی ظالم نکلے، قطع نظر اسکے کہ ہم اپنے آپ بیکس بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ گو وہ ظالم تھے لیکن ہمارے ساتھ تو موجود تھے پس مجبوراً بیکسی کی حسرت بھی دل ہی میں رہی بعض نسخوں میں مصرعہ ثانی اس طرح واقع ہوا ہے یعنی:

"دشواری رہِ ستم ہمرہاں نہ پوچھ" یہ مصرعہ زیادہ صاف ہے۔

ردیف "ی"

(۱۲۷) صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھائیے   ۱   طاقت کہاں کہ دید کا ساماں اُٹھائیے
ہے سنگ پر برات معاشِ جنونِ عشق   ۲   یعنی ہنوز منتِ طفلاں اُٹھائیے
دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم   ۳   اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیے
یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجئے   ۴   یا پردۂ تبسّمِ پنہاں اُٹھائیے

شعر (۱) مژگاں اُٹھائیے سے مراد اس جگہ آنکھ اُٹھا کر دیکھنا ہے یعنی جب پلکیں اوپر کو اُٹھیں گی تو ضرور نظر کسی چیز پر پڑیگی مطلب ہے کہ اگر ہم آنکھ اُٹھا کر دیکھیں تو سینکڑوں جلوہائے قدرت نظر آئینگے لیکن اب ہم میں وہ طاقت ہی نہیں رہی کہ دید کا بار ساماں اُٹھا سکیں اہلِ تصوّف تو اس نازک خیالی سے بھی کام لیتے ہیں یعنی ع

نہ دیدار کا اب تقاضا کریں گے   تصوّر میں ہم ان کو دیکھا کرینگے

شعر (۲) برات، فرمان جسکے بموجب خزانہ سے روپیہ ملے منت۔ احسان مطلب یہ ہے کہ جنون کا فرمان معاش سنگ پر ہے یعنی مجنوں کی معاش سنگِ طفلاں مقرر ہوئی ہے تو گویا جنوں میں بھی لڑکوں کا احسان اُٹھانا پڑے گا کہ وہ پتھر ماریں۔

شعر (۳) مطلب یہ ہے کہ رو دیوار مزدور کے احسان کے بوجھ سے خم ہے لہذا کسی شخص کا بھی احسان نہیں اُٹھانا چاہیئے

شعر (۴) یا تو میرے خلشِ رقابت کے زخم کی تشہیر نہ کیجئے یعنی لوگوں سے شکایتاً نہ کہتے پھریئے کہ یہ بلا وجہ خار کھاتا ہے رشک کرتا ہے یا جو درپردہ میرے دشمنوں سے ملکر میرا تمسخر اور میری ہنسی اُڑاتے ہیں اس پردہ کو اُٹھائیے اور ہنسنا چھوڑ دیجئے کیونکہ یہی تو باعث رشک ہے۔

(۱۲۸) مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے ۱ بھوَں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی ایک اور شخص پر ۲ آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیئے
دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی ۳ ہاں کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات چاہیئے
سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوّری ۴ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو ۵ اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے
ہے رنگ لالہ و گل و نسرین جدا جدا ۶ ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے
سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگامِ بے خودی ۷ ق رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے
یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات ۸ عارف ہمیشہ مستِ مے ذات چاہیئے
نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو
۹- خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیئے

شعر (۱) خرابات میخانہ۔ بھوَیں۔ ابرو۔ چونکہ ابرو کو محراب مسجد سے اور آنکھ کو بوجہ مستی میخانہ سے تشبیہ دیتے ہیں لفظ قبلہ بھی اس شعر میں خاص رعایت و مناسبت رکھتا ہے پس مطلب شعر کا صاف ہے۔

شعر (۲) مکافات، بدلہ۔ سزا، خمیازہ۔ مطلب یہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتا تھا تو تم نے میری محبت کی کوئی داد نہ دی بلکہ بیداد کرتے رہے اچھا ہوا کہ اب آپ بھی میری طرح کسی شخص پر عاشق ہوئے ہیں اب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کسی پر ستم کرنے کی یہ سزا اور بدلہ ہوا کرتا ہے یعنی تمہارا معشوق بھی تم پر ستم کیا کرے گا۔

شعر (۳) تلافی مافات، جو چیز جاتی رہی ہو اس کا بدلہ۔ مطلب یہ ہے کہ اے فلک میری جن بیشمار حسرتوں کا خون ہو چکا ہے اس کا کچھ تو معاوضہ دے یا میرے دل حسرت پرست کی داد ہی دے۔

شعر (۴) معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے معشوق کو تصویروں کا بہت شوق ہے یا وہ اپنی تصویریں آئے دن کھنچواتا رہتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ حسین چونکہ اپنی تصویریں عموماً کھنچوایا کرتے ہیں اس لئے شاعر کہتا ہے کہ ان حسینوں کیلئے ہم نے مصوری بھی سیکھ لی ہے کیونکہ ملاقات کا یہ بھی ایک ذریعہ ہے۔

شعر (۵) مطلب یہ ہے کہ شراب نوشی سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ اس سے مجھے کسی قسم کا سرور حاصل ہو بلکہ اس سے غرض یہ ہے کہ مجھ پر دن رات ایک قسم کی بیخودی اور بیہوشی طاری رہے تاکہ کسی قسم کا غم و اندوہ محسوس نہ ہو۔

شعر (۶) مطلب یہ ہے کہ چمن میں مختلف رنگوں کے پھول کھلے ہوئے ہیں کوئی سرخ ہے، کوئی گلابی ہے۔ کوئی زرد ہے، کوئی سفید، کسی کا نام لالہ ہے کسی کا نام چنبیلی، کسی کا نام گلاب ہے اور ہر ایک کی خوشبو بھی الگ الگ ہے لیکن دراصل ہر رنگ و کیفیت میں بہار ہی جلوہ گر ہے اور یہ اسی کا ثبوت ہے۔ دراصل یہ شعر بھی رنگ تصوف سے رنگین ہے۔

شعر (۷ و ۸) یہ دونوں شعر قطعہ بند ہیں، قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ صوفیا کے نزدیک کفر بھی مظہر ذات ہے کیونکہ کفر دین کی ضد ہے اور اضداد کا مخرج بھی وہی واجب الوجود ہے پس اگر بیخودی اور استغراق کے وقت سر پائے خم پر رکھا ہو اور دعا کے وقت منہ قبلہ کی طرف کر لیا جائے تو کوئی حرج نہیں لہذا بلا پس و پیش پیمانہ صفات الٰہی کی گردش کے مطابق عارف کو ہمیشہ اسکی ذات کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے ایک اور شاعر نے ان خیالات کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

دل جو ظلمت کدۂ گیسوئے جاناں ہوگا — پرتو رخ سے تجلی گہہ ایماں ہوگا
کر چکی ہو جسے رنگین محبت کی شراب — حق تو یہ ہے نہ وہ کافر نہ مسلماں ہوگا

شعر (۹) فروع جمع فرع، شاخیں، خاموشی کو اصل یعنی جڑ اور تمام باتوں کو فرع یعنی شاخیں قرار دیا ہے مطلب یہ ہے کہ جس طرح تمام شاخیں جڑ ہی سے پیدا ہوتی ہیں اسی طرح جو بات نکلتی ہے وہ خاموشی ہی سے نکلتی ہے کیونکہ بات کرنے سے پہلے انسان خاموش ہوتا ہے۔

(۱۲۹) بساط عجز میں تھا ایک دل یک قطرۂ خوں وہ بھی ۱ سو رہتا ہے بانداز چکیدن سرنگوں وہ بھی
رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے ۲ تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی
خیال مرگ کب تسکیں دل آزردہ کو بخشے ۳ مرے دام تمنا میں ہے اک صید زبوں وہ بھی
نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم ۴ کہ ہوگا باعث افزائش درد دروں وہ بھی
نہ اتنا برّشِ تیغ جفا پر ناز فرماؤ ۵ مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موج خوں وہ بھی
مئے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجے ۶ لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی
مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوۂ ہجراں
۷- خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

شعر (۱) بساط۔ سرمایہ۔ چکیدن، ٹپکنا۔ مطلب یہ ہے کہ میرے سرمایۂ عجز میں صرف ایک دل تھا اور وہ بھی فقط ایک قطرۂ خون۔ پھر اسکی حالت و کیفیت یہ ہے کہ ٹپکنے اور گرنے کیلئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اور وہ بھی سرنگوں اسی مضمون کا ایک شعر علامہ فیضی کا بھی ہے ؎

دریاب کہ ماندست ز دل قطرۂ خونے آں قطرہ ہم از دست تو لبریز چکیدن

شعر (۲) مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے معشوق سے ازراہ تکلف کچھ دنوں روٹھے رہے یعنی عمداً بناوٹ سے خفا رہے کہ شاید وہ ہمیں آزردہ دیکھ کر محبت کرنے لگ جائے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ ہمارا یہ تکلف اور تصنع بھی ایک انداز جنوں تھا بھلا ایسی مصنوعی آزردگیوں کو وہ کب خاطر میں لاتے ہیں۔

شعر (۳) صید زبوں۔ نخچیر لاغر۔ مریل شکار۔ تمنا کو دام سے اور صید زبوں کو خیال مرگ سے تشبیہ دی ہے

مطلب ہے کہ مجھے آرزوئے موت سے کیا تسکین ہو سکتی ہے کیونکہ میری تمنا کے دام میں ایسے سینکڑوں شکار آیا کرتے ہیں ان میں سے ایک ذلیل و حقیر سا شکار یہ بھی ہے۔

شعر (۴) مطلب ہے کہ اے دوست اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ آہ و زاری اور نالہ و فریاد کرنے سے درد دل میں کمی واقع ہونے کے بجائے الٹا اس درد نہاں میں اور اضافہ ہوگا تو میں ہرگز نالہ نہ کرتا۔ افسوس!

شعر (۵) بُرِش، کاٹ، تیزی۔ مطلب ہے کہ معشوق کو جو اپنی تیغِ جفا کی تیزی پر ناز ہے تو عاشق اس سے کہتا ہے کہ اے قاتل تجھے اس پر اتنا ناز کیوں ہے ہیں تو اسے بھی اپنے دریائے بیتابی کی ایک موجِ خونیں سمجھتا ہوں جہاں اور خونیں موجیں تلوار کا کام کرتی ہیں وہاں ایک یہ بھی سہی۔

شعر (۶) واژگوں۔ الٹے۔ مطلب ہے کہ ساقی گردوں سے شرابِ عشرت کی ہم کیا خواہش کریں۔ کیونکہ وہ بھی تو اپنے ساغروں کو الٹا کئے بیٹھا ہے یعنی وہ شرابِ عیش سے خالی ہو چکے ہیں جبھی تو الٹے ہیں۔ ایک، دو چار کو جمع کریں تو سات بنتے ہیں جن سے ساتوں آسمان مراد ہیں۔ مولانا جامی بھی اس مضمون کو لکھ گئے ہیں ؎

آسماں جام نگوں ساں کز مئے عشرت تہی ست   جستن مے از تہی ساغر نشان ابلہی ست

شعر (۷) اے غالب میرے دل میں وصل کا شوق اور شکوہ ہجر بھرا ہوا ہے خدا وہ دن جلد لائے کہ میں شکوے بھی کروں اور وصل کے مزے بھی لوٹوں۔

(۱۳۰) ہے بزم بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے ۱ تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے
ہے دورِ قدح وجہ پریشانیٔ صہبا ۲ اک بار لگا دو خمِ مے میرے لبوں سے
رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد ۳ زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے
بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر ۴ ہر چند مری جان کو ربط لبوں سے

شعر (۱) اس شعر میں گفتگو۔ بات چیت کو یا سخن آرائی کو خوشامد طلب کہا گیا ہے یعنی سخن آرائی ہمار

لبوں سے اس لئے ناراض ہوگئی کہ اب ہم محفلِ معشوق میں خوشامدانہ سخن آرائی سے کام نہیں لیتے۔ سچ پوچھیے تو اب خوشامد کرتے کرتے ہمارے ہونٹ بھی تھک گئے ہیں۔

شعر (۲) صہبا۔ شراب انگوری۔ خم۔ مٹکا۔ قدح۔ پیالہ۔ پریشانی صہبا سے مراد تقسیم شراب ہے۔ مطلب ہے کہ جب محفل میں دورِ شراب چلیگا تو سب لوگ پئینگے اور شراب تقسیم ہوجائیگی۔ کیا اچھا ہے کہ خم سے لا کر میرے منہ سے لگا دو میں غٹاغٹ پی جاؤں اس صورت میں شراب غیروں میں تقسیم یعنی پریشان نہ ہوگی۔

شعر (۳) طرف۔ مقابل۔ زاہد۔ پرہیزگار۔ مطلب ہے کہ جن کی عمر ہی درِ میکدہ پر جبہ سائی کرتے گزر گئی ہے یہ بہت بڑے منہ پھٹ، گستاخ اور بے ادب واقع ہوئے ہیں دیکھئے حضرت زاہد ان کے مقابلہ میں نہ آئیں یہ تمہارے پند و نصائح اور وعظ و نصیحت کو ہرگز ماننے والے نہیں کہیں آپکی پگڑی ہی نہ اچھال دیں۔

شعر (۴) بیداد۔ ظلم۔ ربط۔ تعلق۔ مطلب ہے کہ ذرا بیداد وفا تو دیکھئے کہ اسی وفا نے جو تیرے عشق میں مجھے کرنی پڑتی تھی یہ ستم ڈھایا ہے کہ اگرچہ میری جان کو لبوں سے بیحد گہرا تعلق تھا یعنی وہ ہمیشہ لبوں پر ہی رہتی تھی مگر اس بیداد وفا نے اسے لبوں سے جدا کر دیا یعنی جان جاتی رہی۔

(۱۳۱) تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا ۱ سن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالب ترا احوال سنا دینگے ہم ان کو ۲ وہ سن کے بلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے

شعر (۱) "باقی نہ رہے جا" یعنی شکایت کا موقع باقی نہ رہے اس شعر میں معشوق کی انتہائی عیاری، کمال سفاکی اور نفرت و ناراضگی کی اندرونی تصویر کھینچکر رکھ دی گئی ہے مطلب ہے کہ اگر انکے سامنے کوئی شخص ہمارے عشق و محبت کا تذکرہ کرتا بھی ہے تو وہ نہایت متانت و خاموشی سے سن بھی لیتے ہیں تاکہ ہمیں شکایت کا موقع نہ رہے یا ہم انکی دلی ناراضگی معلوم کرکے معافی مانگ لیں یا یہ شکایت کریں کہ آپ کو ہمارے نام سے بھی نفرت ہے۔

اور اس کا یہ انداز بھی کمالِ ستم میں داخل ہے کہ وہ خود کبھی ہمارا ذکر ہی نہیں کرتا کہ شاید عاشق کو یہ معلوم نہ ہوجائے کہ ہمیں بھی اس کا کچھ خیال ہے

شعر (۲) اجارہ، ٹھیکہ، مجازاً ذمہ، خوب شعر کہا ہے مطلب یہ ہے کہ اے غالب تیرے دردِ محبت، تیری گریہ و زاری تیرے نالہ و فریاد، تیری بیتابیاں، تیری بیقراریاں اور تیری نازک حالت کا تذکرہ تو تیرے معشوق کے سامنے کبھی نہ کبھی کسی طرح ہم ضرور کردینگے لیکن اس بات کا ذمہ نہیں لیتے کہ وہ یہ تمام حالات سُنکر اور اُن سے متاثر ہوکر تمہیں ضرور بلا بھی لے۔

(۱۳۲) گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

شعر (۱) غارت کرنا یعنی لوٹنا، مرزا صاحب نے اپنی انتہائی مفلسی و بربادی اور عشق کی غارتگری کا اس شعر میں نقشہ کھینچ دیا ہے، مطلب یہ ہے کہ میرے گھر میں (اب وہ کونسا مال و اسباب ہے کہ غم کا لٹیرا اسے لوٹتا صرف ایک حسرتِ تعمیر مکان دل میں تھی سو وہ اب بھی) موجود ہے لیکن اس حسرت کو وہ غارتگر کیوں لوٹنے لگا تھا کیا وہ بھی حسرت نصیب اور خانماں برباد ہو جاتا ایک اور جگہ بھی مرزا صاحب یہی مضمون ادا کر چکے ہیں ؎

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ — سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

(۱۳۳) غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی ۱ فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی
کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب ۲ قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے ۳ ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی
انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا ۴ اٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھئے شوخی بہانے کی
ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا ۵ ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی
لگدکوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی ۶ مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالب
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی ۷

شعر (۱) مولانا حالی فرماتے ہیں یعنی جب غم دنیا اٹھانے کی فرصت ملتی ہے تو سر اٹھاتے ہی آسمان پر نظر جاتی ہے

اور چونکہ وہ بھی تیری طرح جفا پیشہ ہے اسلئے اس کو دیکھتے ہی تو یاد آجاتا ہے (اور تیرے یاد آنے سے) اب دوسرا غم شروع ہو جاتا ہے غرضیکہ کسی حالت میں غم سے نجات نہیں۔

شعر (۲) مطلب ہے کہ یا الٰہی میرے مکتوب محبت کا مضمون وہ ظالم کس طرح پڑھے گا کیونکہ اس کافر نے تو ہر اس کاغذ کو جو بصورت خط ہو جلا ڈالنے کا عہد کر لیا ہے۔

شعر (۳) پرنیاں، ایک باریک ریشمی کپڑا ہوتا ہے جسے فوراً آگ لگ جاتی ہے مطلب ہے کہ گو پرنیاں میں شعلۂ آتش چھپ نہیں سکتا بلکہ شعلہ کے چھوتے ہی وہ فوراً بھڑک اٹھتا ہے لیکن جو سوزِ غم ہم اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہیں وہ شعلہ در حریر ہونے سے زیادہ مشکل ہے اور شعلۂ آتش کا پرنیاں میں چھپ جانا آسان ہے۔

شعر (۴) ذرا اس ستم ظریف کی شوخی تو ملاحظہ ہو کہ دل میں شوق تو یہ تھا کہ ذرا اپنے زخمیوں کو دیکھ آئیں مگر بظاہر یہ بہانہ کیا ہے کہ ہم سیر گلشن کو جاتے ہیں یعنی انکے نزدیک عاشقوں کے زخم سیر گل اور بہار گلشن کا مزہ دیتے ہیں۔ یہی مضمون ایک اور جگہ بھی مرزا صاحب لکھ چکے ہیں ؎

ہوائے سیر گل آئینہ بے مہری قاتل   کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

شعر (۵) ہم اپنی سادہ لوحی سے اس فریب تلطفات پر جان دینے لگ گئے یعنی تیری تشریف آوری کو تیری مہربانی پر محمول کیا حالانکہ یہ ایک دھوکا تھا اور فریب ناز تھا یعنی ادھر آیا اور ادھر جانے کا ارادہ کر لیا اور عاشق کے لئے اس سے بڑھ کر باعث سوہان روح کوئی حرکت ہی نہیں ہو سکتی۔

شعر (۶) لگد کوب۔ لات مارنا۔ لتاڑنا۔ حوادث، حادثات مطلب ہے کہ کبھی تو ہم اتنی طاقت اور برداشت رکھتے تھے کہ بتوں کی ناز برداری کیا کرتے تھے لیکن اب ضعف و ناتوانی کی یہ حالت ہے کہ حوادث زمانہ کی لتاڑ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ شاعر کے خیال میں ناز بتاں کا بوجھ بار حوادث سے بھی زیادہ ہے۔

شعر (۷) اوضاع جمع وضع، ابناد، ابن کی جگہ یعنی بیٹے مجازاً اہل زمانہ۔ مطلب ہے کہ ہم اہل زمانہ کے اس غیر شریفانہ سلوک کی کیا تعریف کریں کہ جن بھلے مانسوں سے ہم نے ہر دفعہ نیکی کا برتاؤ کیا انہیں نے ہمارے ساتھ

برائی کی۔ دراصل مرزا صاحب نے اہلِ زمانہ کی بدسلوکیوں کی شکایت کی ہے۔ بقول شخصے ؎

اک زمانے کے ستم وقفِ دلِ اندوہگیں   اک زمانے کے مصائب آفت پئے جانِ حزیں
جس سے تو نے کی وفا اس نے ہی کی تجھ سے دغا   وائے ناکامی تری اے قلبِ حسرت آفریں

(۱۳۴) حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی   دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
اس شمع کی طرح سے جسکو کوئی بجھائے   میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

شعر (۱) حاصل، ثمرہ۔ ہاتھ دھو بیٹھنا۔ ناامید ہو جانا۔ آرزو خرامی، چکر لگانے والی آرزو۔ ڈوبی ہوئی ی یعنی وہ شخص کہ جس سے قرضہ وغیرہ وصول ہونے کی امید نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اے آرزو جو دل میں چکر لگاتی رہتی ہے اور امید رکھتی ہے کہ کثرتِ گریہ سے کوئی ثمرہ حاصل ہوگا یہ تیری خام خیالی ہے اس سے ہاتھ دھو بیٹھ یعنی ناامید ہو جا۔ کیونکہ دل جوشِ گریہ میں ایک ڈوبی ہوئی اسامی ہے۔

شعر (۲) یعنی وہ شمع کہ جو ابھی پوری طرح جلنے نہ پائی ہو کہ اسے بجھا دیا جائے میں بھی ایسا ہی بدنصیب دل جلا ہوں کہ جو پورے طور پر ابھی جلنے نہ پایا تھا کہ مجھے بجھا دیا گیا داغِ ناتمامی یعنی مجھے اپنے ناتمام رہنے کا داغ ہے۔

اس مضمون کو مرزا صاحب ایک اور جگہ بھی لکھ چکے ہیں ؎

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے   اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

(۱۴۲) کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے   ۱   جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے   ۲   پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے
حالانکہ ہے یہ سیلیٔ خارا سے لالہ رنگ   ۳   غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے
کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا   ۴   آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا   ۵   بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں   ۶   فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا ، کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

ہے بارے اعتماد وفاداری اس قدر
۸- غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

شعر (۱) بیضۂ مور۔ چیونٹی کا انڈا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم مصیبت زدوں کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہا اور ہمارا جہان ایسا تنگ ہے کہ آسمان بھی اس میں بیضۂ مور نظر آتا ہے یا بیضۂ مور آسمان کے برابر ہے۔

شعر (۲) مطلب یہ ہے کہ جس طرح ذرّے کی حرکت یعنی زندگی آفتاب کی روشنی پر منحصر ہے اسی طرح تمام کائنات تیرے ہی ذوق سے حرکت پذیر یعنی زندہ ہے اس مضمون کو مرزا صاحب ایک اور جگہ بیان فرماتے ہیں ؎

ہے تجلی تری سامانِ وجود ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں

شعر (۳) سیلی۔ طمانچہ۔ تھپیڑا۔ خارا۔ اس جگہ سیلی خارا سے مجازاً حوادث زمانہ کے تھپیڑے مراد ہیں اور شیشہ سے شیشۂ دل۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ میرا دل حادثات اور مصیبتوں کی وجہ سے خون ہو رہا ہے لیکن نادان یہ سمجھ رہا ہے کہ اس شیشۂ (دل) میں شراب بھری ہے لالہ رنگ سے دل کا خون ہونا مراد ہے اور شراب اور خون کی سُرخی میں رعایت رکھی گئی ہے۔

شعر (۴) اہل ہوس۔ رقیب، نفس پرست۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ رقیب کے سینے میں سوزِ محبت اور حرارت عشق نہیں بلکہ وہ بندۂ نفس ہے اور ہر وقت اسکی خواہش وصال پوری ہوتی رہتی ہے اور سوزِ حسرت بھی ہیں کے سینہ میں نہیں اسلئے اس کا سینہ ایک ٹھنڈا مکان ہے اسلئے معشوق کو ٹھنڈی جگہ پسند آئی ہے یا بہت ٹھنڈی جگہ ہے تو اسکو گرم کر رہا ہے یعنی رقیب کا دل اپنی صحبت سے گرما رہا ہے۔

شعر (۵) مولانا حالی فرماتے ہیں کہ "ہمارے بھی مُنہ میں زبان ہے" اسکے دو معنی ہیں ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت موجود ہیں کہ اگر بولنے پر آئے تو قائل کر دینگے اور دوسرے شوخ معنی یہ ہیں کہ ہم زبان سے چکھ کر بتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا یا نہیں؟

شعر (۶) یعنی جو سایۂ دیوارِ یار میں بیٹھا ہے وہ گویا ہندوستان کا بادشاہ ہے۔

شعر (۷) یعنی میرے سوزِ غم نے میرے جگر کو جلا کر راکھ کر دیا اور اس کا نشان محض ایک داغ سا رہ گیا ہے اب اگر کسی سے میں یہ کہوں کہ میرا داغِ غم جگر کا نشان ہے تو کوئی اس بات کو صحیح نہیں مان سکتا اور کوئی یقین ہی نہ کریگا کہ اسکے سینے میں پہلے جگر بھی تھا۔ جگر سے مراد اس جگہ دل ہے مولانا آسی فرماتے ہیں ؎

ہوتا جو دل تو تم کو دکھاتا میں داغِ دل
اب کیا دکھاؤں اب تو نہ دل ہے نہ داغ ہے

شعر (۸) اعتماد۔ بھروسہ۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اس بات سے خوش ہیں کہ ہمارا معشوق ہم پر مہربان نہیں کیونکہ ہمارے خیال میں اسکو ہماری وفاداری پر خوب اعتماد ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ خواہ ہم کتنی ہی بے رخی کریں ظلم و ستم کریں لیکن وہ وفا کو ترک نہیں کریگا یعنی ہم اسلئے خوش ہیں کہ انہیں ہماری وفاداری پر بھروسہ ہے اور یہ ہماری بڑی خوش نصیبی ہے۔ بقول شخصے ع میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں۔

(۱۲۶) درد سے میرے ہے تجھکو بیقراری ہائے ہائے ۱ کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ ۲ تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے
کیوں مری غمخوارگی کا تجھکو آیا تھا خیال ۳ دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا ۴ عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی ۵ یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے
گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا ۶ خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں ۷ ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی ۸ اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا ۹ دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے
کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تارِ برشگال ۱۰ ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

گوش مہجور پیام و چشم محروم جمال ۔ ۱۱ ۔ ایک دل تس پہ یہ ناامیدواری ہائے ہائے
عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی لغت کا رنگ
۱۲۔ رہ گیا تھا دل مین جو کچھ ذوق خواری ہائے ہائے

شعر (۱) شارحین فرماتے ہیں کہ یہ غزل مرزا غالبؔ نے اپنے معشوق کے مرثیہ کے طور پر لکھی ہے لیکن اس پہلے شعر میں معشوق کی طرف سے خطاب کیا جائے تو شاید صحیح ہو سکے اور خود مرزا صاحب حالت نزع میں ہوں یا معشوق کی خبر مرگ سنکر مرزا صاحب پر حالت نزع طاری ہو گئی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تو میرے درد کی وجہ سے اسقدر بےچین و بیقرار کیوں ہے ہائے اسوقت وہ تیری غفلت شعاری کیا ہوئی کہ ہم تم پر مرتے تھے جان دیتے تھے اور تم پرواہ تک نہیں کرتے تھے چونکہ اپنے معشوق کو مرزا صاحب عالم ارواح میں بھی بےچین دیکھنا نہیں چاہتے اسلئے ایسا فرما رہے ہیں۔

شعر (۲) آشوب۔ فتنہ۔ فساد۔ جھگڑا۔ یعنی جب تجھ میں آشوب غم کے برداشت کی طاقت ہی نہیں تھی تو مجھے افسوس ہے کہ تو نے میری غمگساری ہی کیوں کی؟

شعر (۳) ہائے تجھے میری غمخواری کا خیال ہی کیوں آیا تھا کہ تو میری محبت کی تاب نہ لا سکا اور اپنی جان ہی دیدی۔ میرے ساتھ تو نے دوستی کیا کی گویا اپنے ساتھ دشمنی کی۔

شعر (۴) پیمان۔ عہد۔ یعنی اگرچہ تجھ نے میرے ساتھ زندگی بھر کیلئے وفا کرنے کا اقرار کیا تھا مگر افسوس کہ ظالم عمر بھی تو ناپائدار ہے اس نے بھی دغا دی۔ اور تو خود تو مجھ سے جدا نہ ہوا لیکن اس نے جدا کر دیا۔

شعر (۵) مجھے اپنی زندگی کی آب و ہوا زہر معلوم ہوتی ہے یعنی جب تیری زندگی نے تجھ سے وفا نہ کی تو میں بھی اپنی زندگی سے بیزار ہوں۔

شعر (۶) یعنی کبھی تو جلوہ فروزی کے وقت ناز و انداز کے پھول جھڑتے تھے اور آج یہ حالت ہے کہ تیری قبر پر قلم سے گل بوٹے بنائے جا رہے ہیں۔

شعر (۷) تجھے عشق میں رسوائی کے خیال سے ایسی شرم آئی کہ نقاب خاک میں منہ چھپا لیا۔ یعنی قبر میں جا

کہ چھپ گیا گویا عشق و محبت کی پردہ داری کی تو نے حد کر دی بھلا اس سے زیادہ رسوائی محبت کو کوئی کیا چھپائیگا۔

حکیم مومن خاں مرحوم بھی اپنے معشوق کے مرثیہ میں پردہ کے متعلق ایک شعر کہتے ہیں جو بیحد جگر پاش ہے ؎

بے پردہ جسکو صحن میں دیکھا نہ تھا کبھی
لاش اس کی جائے ہے سر بازار ہائے ہائے

شعر (۸) آہ، عہد محبت کی عزت خاک میں مل گئی اور دنیا سے اب رسم محبت ہی اٹھ گئی یعنی تو نے مجھ سے بیوفائی کی۔ گو بظاہر یہ شکایت ہے لیکن در پردہ درد و غم کا مظاہرہ ہے۔

شعر (۹) تیغ آزما۔ قاتل۔ ہائے افسوس کہ ابھی میرے دل پر تیغ محبت کا کوئی گہرا زخم بھی نہ آنے پایا تھا کہ میرے قاتل کا ہاتھ ہی بے کار ہو گیا۔

شعر (۱۰) برشگال، برسات، اس جگہ برشگال سے گریہ زاری اور شبہائے تار سے شبہائے غم مراد ہے اور اختر شماری سے تمنائیں اور آرزوئیں مراد ہیں۔ مطلب ہے کہ تیری زندگی میں جب شب فراق ہوتی تھی تو ہم تارے گن گن کر رات کاٹتے یا آرزوئیں باندھتے تھے کہ کسی نہ کسی دن ہمیں ضرور وصل محبوب نصیب ہوگا لیکن اب تو برسات ہے یا گریہ زاری کی برسات اور گھنگھور گھٹائیں ہیں یا شب ہائے غم ہیں اور وہ آرزوئے وصال کے تارے کبھی جلوہ گر نہیں۔ آخر یہ راتیں ہم کس طرح کاٹیں؟

شعر (۱۱) مہجور، ہجراں نصیب۔ مطلب ہے کہ اب کوئی معشوق کا پیام لا سکتا ہے کہ کان اسے سنیں اور نہ ہی یہ امید ہے کہ اپنے محبوب کا پیارا اور حسین چہرہ کبھی دیکھنے میں آئیگا یعنی کان مہجور و آنکھ محروم اور ایک دل اس پر بھی اس قدر ہجوم ناامیدی۔ افسوس!

شعر (۱۲) یعنی میرے عشق نے ابھی جنون و وحشت کا رنگ اختیار نہیں کیا تھا کہ میرا معشوق ہمیشہ کیلئے جدا ہو گیا اور میرے دل میں ذلت و خواری اور رسوائی کی حسرت رہ گئی۔ بقول شخصے ؎

وہ محبت ہی نہیں ہے جس میں رسوائی نہ ہو
کیا تڑپنے کا مزہ گر تو تماشائی نہ ہو

(۱۳۷) سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے ۱ تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے
لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر ۲ ابتک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
کیجے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک ۳ ہر مُو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے
ہے وہ غرورِ حُسن سے بیگانۂ وفا ۴ ہرچند اسکے پاس دلِ حق شناس ہے
پی جسقدر ملے شبِ مہتاب میں شراب ۵ اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
۶- مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

شعر (۱) سرگشتگی - پریشانی - زبوں حالی، یاس - ناامیدی - نوید - خوشخبری - آس - امید مطلب ہے کہ میں اپنی پریشانی اور زبوں حالی سے تنگ اور زندگی سے مایوس ہو چکا ہوں لہٰذا میرے دل کو سکون کی خوشخبری دینی چاہیئے کہ اب سرگشتگی کا زمانہ ختم ہونے کو ہے یعنی مجھے مر جانے کی قطعی امید ہو گئی ہے۔

شعر (۲) میرا دل باوجودیکہ تباہ و برباد ہو چکا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میں مطمئن ہوں اور دل میرے پاس ہے اسلئے اس کی خبر نہیں لیتا۔

شعر (۳) سرور - نشہ، خوشی، مو - بال - سپاس، شکر - تعریف مطلب ہے کہ مجھ کو غم کے بخار میں جو نشہ اور خوشی حاصل ہوتی ہے اُسے کماحقہٗ بیان کر ہی نہیں سکتا گویا میرا ہر موئے تن زبان سپاس بنا ہوا ہے قاعدہ ہے کہ بحالت تپ لرزہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اسی کو زبان سپاس کہا ہے۔

شعر (۴) مطلب ہے کہ باوجودیکہ میرا وفادار اور حق شناس دل اسکے پاس ہے اور وہ اُسے حق شناسی سے آگاہ بھی کرتا رہتا ہے لیکن وہ ظالم اپنے غرور حسن کی وجہ سے حق ادا نہیں کرتا۔

شعر (۵) بلغمی مزاج - مرطوب مزاج، شب مہتاب کو بھی بلحاظ برودت بلغمی کہتے ہیں اگر بلغم حار بھی ہوتا ہے اسلئے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ چاندنی رات میں خوب دل کھول کر شراب پیو کیونکہ اس کا مزاج بلغمی ہے اور شراب مصلح یا قاطع بلغم ہے

شعر (۶) مکین۔ مکان میں رہنے والا۔ مطلب یہ ہے کہ ہر ایک مکان کی رونق و عزت مکین کے وجود و شخصیت سے ہوتی ہے چونکہ مجنوں مر گیا ہے اس لئے صحرائے نجد ویران ہے۔

(۱۴۶) اگر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے ۱ خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ ۲ دل فردِ جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے
کس پردے میں ہے آئینہ پرداز اے خدا ۳ رحمت کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے
ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی ۴ اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے
مشکیں لباس کعبہ علیؑ کے قدم سے جان ۵ نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے
وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا ۶ دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
۷ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

شعر (۱) خامشی، خاموشی۔ حال۔ واردات قلبیہ۔ اخفا، چھپانا۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ جو خاموش رہا اسی نے نجات پائی اور سلامت رہا یا خاموش رہنے سے دل کا بھید ظاہر نہیں ہوتا اگر اس سے یہی فائدہ حاصل ہوتا ہے تو میں خوش ہوں کہ بغیر خاموشی کے مجھے یہ بات حاصل ہے یعنی اگر میں کوئی رموز و اسرار کی بات کہتا ہوں تو لوگ اسے سمجھ نہیں سکتے۔

شعر (۲) فرد۔ وہ کاغذ جس پر کچھ حساب وغیرہ لکھا جائے۔ لال۔ گنگ۔ مطلب یہ ہے کہ میں اپنی حسرتوں کے اظہار کا گلہ کس سے کروں یعنی میرا دل جمع و خرچ کی ایک فرد ہے اسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر حسرت اظہار کی جمع اس میں درج ہے وہ زبان کے ذریعہ کچھ بھی خرچ نہیں ہو سکی۔ گویا دل گونگی زبانوں کی شکایات کا دفتر ہے ایک اور جگہ بھی مرزا صاحب یہی مضمون لکھتے ہیں ؎

نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے   مری نظر میں ہے سب جمع و خرچ دریا کا

شعر (۳) آئینہ پرداز۔ مصرف آرائش۔ مطلب یہ ہے کہ اے خدا رحمت (جو کہ، عذر خواہ لب بے سوال ہے کس پردے میں آئینہ پرداز ہے یعنی جو لوگ خاموش اور راضی برضائے الٰہی ہیں اے خدا ان پر رحمت نازل ہونے میں کیا دیر ہے (قاضی صاحب)

شعر (۴) منفعل، شرمسار ہونا۔ شوق، رغبت، دل کا لگاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ اے شوق دل تجھے کیا بدگمانی ہو گئی ہے کہ وہ میرے اظہار محبت سے دشمن ہو جائیگا۔ اور تو اس خیال سے نادم ہے کہ ہمنے انتخاب دوست میں غلطی کی نہیں تیرا یہ خیال ہی سراسر غلط ہے بھلا ایسا محبوب اور حسین کبھی دشمنی پر آمادہ ہو سکتا ہے یہ مضمون مرزا صاحب ایک اور جگہ بھی لکھ چکے ہیں ؎ ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ • میں اور خدا نہ کردہ تجھے بیوفا کہوں؟

شعر (۵) مشکیں، مشک یعنی کستوری کی طرح خوشبودار اور سیاہ۔ جناب آسی صاحب اسکی شرح میں فرماتے ہیں کہ چونکہ حضرت علیؑ وہاں پیدا ہوئے محض اسکی وجہ سے لباس کعبہ مشکیں ہے یعنی لباس کعبہ خوشبودار ہے حالانکہ لباس سیاہ ہے لہذا آسی سیاہ کو مشکیں کہکر خوشبودار کے معنی نکالے اور پھر نتیجہ مرتب کیا کہ اس کا مشکیں ہونا کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس کو ناف زمین کہا گیا ہے۔ ناف غزال خوشبودار ہوتی ہے اور مشک وہاں سے نکلتا ہے نہ کہ ناف زمین سے یا مشکیں سے مراد دونوں جگہ سیاہ لیجئے مگر محض سیاہی میں کچھ حضرت علیؑ کے قدم کی تعریف نہیں نکلتی۔ یہ مضمون غالباً مصنف ہی کا ہے ایک جگہ فارسی میں بھی فرماتے ہیں ؎

ز مکرمتش ناف زمیں ناف غزال است مشکیں ز چہ شد ورنہ لباس حرم آیا

شعر (۶) عرصہ۔ میدان فراخ۔ آفاق۔ جمع افق۔ کنایۂ مجازاً زمانہ۔ انفعال، ندامت۔ مطلب یہ ہے کہ میرے جنون و وحشت اور دشت نوردی کے مقابلہ میں زمین کے بڑے بڑے وسیع اور فراخ میداں بھی تنگ ثابت ہوئے تو زمیں شرمندہ ہوئی اور اسے مارے شرم و ندامت کے پسینہ آگیا۔ پس آپ جو دریاؤں میں پانی دیکھ رہے ہیں یہ زمین کا پسینہ ندامت یا عرق انفعال ہے۔

شعر (۷) ہستی۔ وجود۔ زندگی۔ مطلب یہ ہے کہ ہستی وستی کوئی چیز نہیں ہے یہ سب فریب اور دھوکا ہے اور تمام عالم حلقۂ دام خیال یعنی عدم محض ہے یہ سب وہمی، خیالی اور اعتباری تعینات ہیں کئی ایک اور مقامات پر بھی

مرزا صاحب نے بھی یہی مضمون لکھا ہے ؎

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی   ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور   جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

(۱۳۹) تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو ۱ حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے
دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر ۲ نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

شعر (۱) کھود کھود کر پوچھنا۔ بار بار تجسّس کرنا۔ دریافت کرنا۔ حذر۔ پرہیز کرنا۔ بچنا۔ مطلب ہے کہ مرزا صا اپنے معشوق سے کہتے ہیں کہ تم مجھے ضبط و تحمل ہی میں رہنے دو بار بار کرید کر میری شکایتوں کا پتہ نہ لگاؤ۔ بس چپکے ہی رہو اور مجھے بھی خاموش ہی رہنے دو ورنہ جنہیں تم معمولی شکایتیں سمجھتے ہو وہ تو ایک دبی ہوئی آگ کی طرح ہیں ممکن ہے تمہاری کرید سے وہ بھڑک اٹھیں اور ہم دونوں اسکے اشتعال انگیز اثر سے متاثر ہو جائیں۔

شعر (۲) دلا۔ اے دل۔ مغتنم۔ غنیمت۔ گریۂ سحری۔ رات کے پچھلے حصہ میں رونا۔ آہِ نیم شبی۔ آدھی رات کی آہیں مطلب ہے کہ اے دل تو اس چند روزہ درد و الم کو بھی غنیمت سمجھ کیونکہ اسی کے باعث آہِ نیم شبی ہے اور اسی کی وجہ سے گریۂ سحری، آخر ایکدن یہ کچھ بھی نہ ہوگا۔ یہی مضمون مرزا صاحب ایک اور جگہ بھی لکھ چکے ہیں ؎

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے   بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

(۱۴۰) ایکجا حرفِ وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا ۱ ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے
جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں ۲ ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتشبار ہے
آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا ۳ ہر کوئی واماندگی میں نالے سے ناچار ہے
ہے وہی بدمستیِ ہر ذرہ کا خود عذرخواہ ۴ جسکے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے
مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی ۵ زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے
آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا ۶ تجھ پہ کھل جائے کہ اسکو حسرتِ دیدار ہے

شعر (۱) مولانا حالی فرماتے ہیں کہ غلط بردار اس کاغذ کو کہتے ہیں جس پر سے حرف بآسانی کزلک وغیرہ سے اُڑ سکے اور کاغذ پر اس کا نشان باقی نہ رہے مگر یہاں ازراہ ظرافت غلط بردار کے یہ معنی لئے ہیں جس پر سے حرف غلط خود بخود اُڑ جائے۔ کہتا ہے کہ تو نے اپنے خط میں صرف ایک جگہ حرف وفا لکھا تھا سو وہ بھی مٹ گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خط کا کاغذ غلط بردار ہے کہ جو بات سچے دل سے نہیں لکھی جاتی وہ خود بخود مٹ جاتی ہے۔

شعر (۲) اس شعر کی شرح میں جناب قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ آدمی کے سینے میں جو شعلۂ روح روشن ہے اسکی ہر سانس جو اندر جاتا ہے مشتعل کرتا ہے اور اسی اشتعال کی بنا پر انسان زندہ ہے علاوہ ازیں اس سانس کے کچھ نہ کچھ بدن کا حصہ فنا ہو جاتا ہے لہذا جو چیز کہ باعث حیات ہے وہی ساتھ کیساتھ کچھ نہ کچھ جز فنا بھی کرتی جاتی ہے اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ انسان (بلکہ ہر ذی روح) طبعاً و فطرتاً ذوق فنا رکھتا ہے پس شاعر کہتا ہے کہ مجھ کو اپنے ذوق فنا کی ناتمامی پر افسوس ہوتا ہے کہ باوجودیکہ نفس آتش بار ہے لیکن پھر بھی ہم جل کر فنا نہیں ہو جاتے لیکن کہنے والے اس طرح بھی کہتے ہیں کہ ؎

گرمیِ عشق سے قائم ہے حیاتِ انسان   زندگی کیا ہے جو سوزِ غم پنہاں نہ رہا

لیکن مرزا صاحب ایک اور جگہ بھی یہی مضمون لکھ چکے ہیں ؎

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے   اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف

شعر (۳) آگ کے بجھنے سے مراد مرزا صاحب نے اس جگہ مصیبت و افتاد یا فنا لی ہے اور درماندگی کا لفظ بھی قریب قریب انہیں معنوں میں استعمال کیا ہے مطلب یہ ہے کہ آگ جیسی خاموش یا ظالم و غضبناک چیز بھی جب اُسے پانی کے ذریعہ فنا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ اپنی اس مصیبت کی حالت میں فریاد کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے آگ کو جب پانی سے بجھایا جائے تو اس وقت ایک آواز نکلتی ہے جسے نالہ سے تعبیر کیا ہے۔

شعر (۴) مولانا حالی فرماتے ہیں ہر ذرہ یعنی ہر مخلوق، عذرخواہ یعنی معافی چاہنے والا یا عذر رکھنے والا۔ اس شعر میں دعوی ایسے طریقے سے کیا گیا ہے کہ خود دعوی متضمن بہ دلیل واقع ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ ذرات عالم

یعنی ممکنات جو فی الحقیقت معدوم محض ہیں انکی بدمستی اور غفلت کا عذر خواہ وہی ہے جسکے پرتو وجود سے یہ تمام معدومات وجود کا دم بھرتے ہیں۔

شعر (۵) مرزا صاحب اپنے معشوق کو یہ بات یاد دلا کر منانا چاہتے ہیں کہ ایک وقت تھا کہ تو ہمیں اپنی جان یعنی زندگی سمجھا کرتا تھا لیکن مرزا صاحب ازراہِ شوخی و ظرافت فرماتے ہیں کہ میں یہ بات ہی سُننا نہیں چاہتا کیونکہ میں زندگی ہی سے بیزار ہوں۔

شعر (۶) مطلب ہے کہ لفافہ یا عنوان نامہ پر میں نے اپنی آنکھ کی تصویر اسلئے بنا دی ہے تاکہ تجھ پر پہلے ہی ظاہر ہو جائے کہ اس خط میں حسرت دیدار یا تقاضائے دیدار کا مضمون درج ہے۔

(۱۴۱) پینس میں گذرتے ہیں جو کوچے سے میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

بظاہر تو اس شعر کے یہ معنی ہیں کہ مرزا صاحب کا معشوق اگر ان کے کوچے سے گزرتا ہے تو ازراہ نفرت و ستم اتنی عجلت سے گزر جاتا ہے کہ کہاروں کو کندھا بدلنے کا بھی موقع نہیں دیتا کہ شاید مرزا صاحب دیکھنے نہ پائیں لیکن یہ شعر ایک خاص واقعہ کے متعلق ہے یعنی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حکیم مومن خاں مرحوم مرزا صاحب کے مکان کے سامنے سے گزرے مرزا صاحب نے دیکھ لیا کہ پینس میں کون ہے مگر وہ کچھ بولے نہیں لیکن حکیم صاحب کو کہاروں سے یہ کہتے سنا کہ جلدی چلے چلو شاید حضرت مومن کو کوئی اشد ضروری کام ہو مگر جب وہ چلے گئے تو مرزا غالب نے یہ شعر کہا اور حکیم مومن خاں کو بھیج دیا اسکے بعد حکیم مومن خاں مرحوم نے بہت عذر خواہی کی دراصل مرزا صاحب کو حکیم مومن خاں سے بیحد محبت تھی اور بتقاضائے محبت حکیم مومن خاں کو معشوق و محبوب تصور فرمایا۔

(۲۴۱) مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے ۱ جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے
خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں جسکو کوئی موسم ہے ۲ وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے
وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم ۳ اثر فریاد دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

نہ لائے شوخیٔ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی ۴ کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنّا ہے

شعر (۱) فضا صحن خانہ، میدان، عنقا۔ ایک مشہور جانور کا صرف نام ہی نام ہے کسی نے آج تک اسے دیکھا نہیں اپنی ہستی کو حیرت آباد تمنا سے تشبیہ دی ہے مطلب یہ ہے کہ میں اپنی کثرت تمنا کے باعث حیرت زدہ ہو گیا ہوں اور دور حیرت سے میرے منہ سے آواز تو نکل نہیں سکتی پھر تمنا پوری نہ ہونے کا نالہ کیسے کروں نالہ ہے تو سہی لیکن نام کا نالہ ہے جیسے نالہ خاموش بھی کہہ سکتے ہیں یعنی جس طرح عنقا کو کسی نے نہیں دیکھا اسی طرح میرے نالہ کو بھی کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔

شعر (۲) یعنی ہمیں بہار و خزاں سے کیا واسطہ، نہ خزاں کا رنج ہے نہ بہار کی خوشی۔ یا ہمیں معلوم ہی نہیں ہوا کہ خزاں کب گئی اور بہار کب آئی۔ کیونکہ ہمیں تو ہر موسم میں بال و پر کے نوچے جانے کا ماتم رہتا ہے۔

شعر (۳) مطلب یہ ہے کہ اگر حسین کبھی مائل بہ وفا ہوں یا مہربانی سے پیش بھی آئیں تو اسے ایک حسن اتفاق سمجھنا چاہیئے ورنہ غمگیں دلوں کی فریاد سے متاثر ہو کر یہ سنگدل کہیں آمادۂ کرم نہیں ہوتے ؎

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

شعر (۴) تجدید۔ کوئی کام ازسر نو شروع کرنا۔ کفِ افسوس ملنا سے اس جگہ مرزا صاحب نے وہ مفہوم لیا ہے، کہ جیسے کوئی عہد و پیمان کرنے کے وقت ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہے یا مرید اپنے پیر کے ہاتھ میں بیعت کے وقت اپنا ہاتھ دیتا ہے مطلب یہ ہے کہ میری شوخی، اندیشہ نا امیدی کے رنج کی تاب نہیں لا سکی اس لئے کہ مایوسی کی وجہ سے کفِ افسوس، ملا تھا وہ تجدید تمنّا کا عہد ہو گیا یعنی جس کا افسوس کیا تھا پھر اسی کی تمنا کی۔

(۳۴) رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے ۱ نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے
دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں ۲ ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ کشتہ ہے

شعر (۱) بود ہستی۔ چراغ کشتہ۔ بجھا ہوا چراغ۔ دود۔ دھواں۔ جناب ناطقی فرماتے ہیں کہ پہلے مصرعہ میں چراغ کشتہ استعارہ ہے بیمار وفا سے اور دوسرے مصرعہ میں معنی حقیقی میں مستعمل ہے اصطلاح طب میں مرتے وقت کی نبض کو "دودی" کہتے ہیں شاعر معشوق سے خطاب کرتا ہے کہ اے ظالم اب تو تو اپنے بیماروں پر رحم کر کیونکہ وہ قریب المرگ ہیں"

اور اس کی نبض بجھتے ہوئے چراغ کے دھوئیں کی طرح ہے یعنی ذرا سی دیر میں ختم ہو جانے والی ہے۔

ہمارے خیال میں جناب قاضی صاحب نے نبض دودی کی تعریف صحیح نہیں فرمائی حالانکہ نبض دودی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ دود اس کیڑے کو کہتے ہیں جو نجاستوں میں ہوتا ہے ضعف سے جس طرح آہستہ آہستہ رینگتا ہے ویسے ہی اس نبض کی چال ہوتی ہے اور یہ نبض موجی اور نملی سے مشابہ ہے اور موجی کی نسبت یہ زیادہ ضعیف ہوتی ہے موجی۔ سریع اور متواتر اور نرم اور نملی نہایت ضعیف، صغیر متواتر کے ساتھ پس مرتے وقت کی نبض اگر ہو سکتی تو نملی ہوتی نہ کہ دودی۔ لیکن مرزا صاحب نے تو اس جگہ دود چراغ سے دھواں مراد لی ہے حالانکہ دھوئیں کے مشابہ کوئی نبض نہیں ہوتی۔

شعر (۲) سود۔ نفع۔ فائدہ۔ جب تک چراغ نہیں جلتا اس وقت تک تیل خرچ نہیں ہوتا اسلئے بے رونقی یعنی چراغ کے نہ جلنے میں فائدہ ہے مطلب یہ ہے کہ میرا چراغِ دل جو نہ جلنے کی وجہ سے بے رونق ہو رہا ہے دراصل فائدہ میں ہے لیکن باوجود اس فائدہ کے وہ بخیال دل لگی بے چین ہے کہ شاید اس شعلۂ عشق و محبت کی وجہ سے ہی دل لگی کا کوئی سامان پیدا ہو جائے

(۱۴۴) چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے ۱ سُرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے
پیکرِ عشاق سوز طالع ناساز ہے ۲ نالہ گویا گردش سیّارہ کی آواز ہے
دست گاہِ دیدہ خونبار مجنوں دیکھنا ۳ یک بیاباں جلوۂ گل فرش پا انداز ہے

شعر (۱) تو کہوے۔ تو گوئی کا ترجمہ ہے۔ نوا پرداز۔ سخن گو۔ مجازاً عشوہ و غمزہ۔ اشارہ۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کی سرمگیں آنکھ باوجود خاموش ہونے کے سخن گوئی کر رہی ہے اور اس شمع رو کی آواز جو مثل شعلہ کے ہے اس کے دھوئیں نے سرمہ کا کام دیا۔

شعر (۲) پیکر۔ شکل۔ صورت ہر چیز کی۔ ساز۔ باجہ۔ گردش سیارہ بمعنی بدقسمتی۔ جناب آسی اس شعر کی شرح یوں فرماتے ہیں کہ عشاق کے جسم گویا طالع ناساز کیلئے ساز ہیں اور نالہ اسی گردش سیارہ کی آواز ہے حاصل یہ ہے کہ عشاق طالع ناساز کے باجے ہیں گویا ایک باجہ ہیں جس سے نالہ و فریاد کی آواز نکلتی ہے عشاق بھی فارسی میں ایک باجہ کا نام ہے جیسے سعدی فرماتے ہیں۔ ع درنالۂ عشاق نہاوند حجازات۔

لیکن ہم عرض کرتے ہیں کہ جناب آسی کو اس میں غلطی ہوئی ہے دراصل عشاق ایک باجہ کا نام نہیں بلکہ ایک راگ کا نام ہے بلکہ نہاوند و حجاز بھی راگوں ہی کے نام ہیں اور مرزا غالب کا یہ شعر تو لفظ ساز کا بھرپور ضلع ہے یعنی عشاق۔ ساز۔ ناساز۔ نالہ۔ گویا۔ آواز۔

شعر (۴) دستگاہ۔ سرمایہ۔ سامان۔ مال و دولت، کارخانہ اہلِ پیشہ کا۔ فرشِ پا انداز وہ بچھونا جو آمد و رفت کی جگہ یعنی دروازے پر بچھا دیتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ذرا مجنوں کی چشمِ خونچکاں کی کارستانی ملاحظہ ہو کہ اُس نے اشکِ خونیں کی گُلکاریوں سے صحرائے نجد کو گلزار بنا دیا ہے الفاظ دستگاہ اور پا انداز اور دیدہ اور دیکھنا اور مجنوں۔ بیاباں۔ گل۔ پورا ضلع ہیں۔

(۱۴۵) عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی ۱ میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے ۲ کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی ۳ اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے ۴ غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو ۵ آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام ۶ دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں ۷ نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف ۸ آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالینگے ۹ بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

شعر (۱) تو جو میرے عشق پر نام دھرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یہ عشق کیا ہے ایک جنون و وحشت ہے اچھا

منا ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ یہ وحشت ہی سہی لیکن یہ کیا تھوڑی بات ہے کہ میری وحشت کی وجہ سے لوگ مجھے تیرا دیوانہ و مجنوں کہتے ہیں اور یہ بھی بڑی بات ہے کہ میری وجہ سے تیری شہرت بھی ہو گئی۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ تلمیذ حضرت مومن مرحوم اس مضمون کو اس طرح ادا فرماتے ہیں ؎

عشق ذلت ہے تو ذلت ہی سہی　　میری ذلت تری عزت ہی سہی

شعر (۲) شعر صاف ہے یعنی ہم سے قطع تعلق نہ کیجئے اگر صلح رکھنی نہیں چاہتے تو دشمنی ہی کیا کرو۔ مرزا صاحب نے اس مضمون کو متعدد جگہ لکھا ہے ؎

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہو　　کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہو
یات اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ　　اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

شعر (۳) مطلب ہے کہ تیری مجلس میں صرف میرے ہی ہونے سے تیری کیا بدنامی ہوگی اور اگر تمہیں اس طرح ملنے سے خوف رسوائی ہے تو تخلیہ میں ملا کرو۔

شعر (۴) مطلب ہے کہ ہم نے مانا کہ تم غیر سے محبت کرتے ہو اور غیر تم سے محبت کرتا ہے۔ لیکن ہم بھی آپ کے دشمن نہیں ہیں ہم بھی تو آپ سے محبت ہی کرتے ہیں ؎

محبت تم سے کرتا ہوں عداوت تو نہیں کرتا　　کرے جو عاجزی اس کو ستانا کس سے سیکھا ہے

شعر (۵) آگہی، واقفیت۔ مولانا نظم اس کی شرح اس طرح فرماتے ہیں یعنی اپنی ہستی سے آگاہی عین عرفان ہے اور یہ مضمون حدیث مشہور مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ سے استنباط کیا ہے پھر کہتے ہیں کہ اگر آگہی نہیں حاصل تو اپنی ہستی سے غفلت کرلیں جب اپنے تئیں نیست سمجھے گا تو موجود حق کا جلوہ تجھے دکھائی دے گا اس شعر کی تعریف کیلئے الفاظ نہیں ملتے۔ حق یہ ہے کہ مشائخ طریقت جن کا کلام ترجمان حقیقت ہوا کرتا ہے ل سکے دیوان بھی آج اس کی نظیر سے خالی ہیں۔

شعر (۶) برق خرام بجلی کی رفتار والی۔ مطلب ہے کہ اگرچہ عمر بہت جلد گزر جانیوالی چیز ہے

لیکن اتنی فرصت تو ہے کہ اپنے دل کو خون کر ڈالیں جناب شیفتہ نے بھی اس مضمون کو خوب لکھا ہے ؎

از دحام غم و اشک ہمہ داں
پھر بھی فرصت ہے تو فرصت ہی سہی

شعر (۷) یعنی اس خیال سے کہ عشق تو صرف مصیبت ہی مصیبت ہے یا عشق میں مصیبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں ہم ہمت ہار کر ترک وفا کریں گے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ؎

یہ تاج کا ہی دل ہے جس نے نباہی اُلفت
یہ بھی کوئی عدو ہے وقت ستم نہ ہوگا

شعر (۸) رخصت۔ اجازت یعنی اے ظالم اور بے مہر آسمان اگر ہماری کوئی مراد پوری نہیں کرنی اور ہمیں عیش و عشرت میں سے کوئی حصہ نہیں دینا چاہتا تو کم از کم اتنا تو کر کہ ہمیں فریاد کرنے کی اجازت دے اس مضمون کو مرزا صاحب ایک اور جگہ بھی لکھ چکے ہیں ؎

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات چاہیئے

شعر (۹) خو۔ عادت۔ بے نیازی۔ بے پروائی۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ بے پروائی تیری عادت میں داخل ہے تو ہم نے بھی مجبوراً عہد کر لیا ہے کہ ہم تسلیم کی عادت کر لیں گے ع "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے" یعنی تیری بے نیازی کو خوشدلی سے برداشت کیا کرینگے ؎

گر میرے ستانے پر ہوتی ہے خوشی تجھ کو
تسلیم کیا دل نے اب تیری رضا کرنا

شعر (۱۰) حسرت سے مراد اظہار حسرت وصل ہے مطلب یہ ہے کہ یار سے کچھ نہ کچھ چھیڑ ضرور رہنی چاہیئے اگر اس کا وصال نصیب نہیں تو اظہار حسرت وصال تو کرتے ہیں۔ حکیم مومن خاں فرماتے ہیں ؎

ہاں جوشِ تپش چھیڑ چلی جائے کہ پر تو
چھٹ جائینگے فرسودہ اگر دام نہ ہوگا!

جناب شیفتہ تلمیذ حضرت مومن نے اس زمین میں خوب شعر کہے دو ایک ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

نہ لکھو نامہ نہ بھیجو پیغام ٭ عشق کی آپ سے نسبت ہی سہی
ہجر ہو جائے جو ہو جائے وصال ٭ وصل ممکن نہیں فرقت ہی سہی
سمجھے اغیار سے ملنا موقوف ٭ مجھ کو الفت نہیں عیبت ہی سہی

(۱۴۶ ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے ۱ صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے
ڈھونڈے ہے اس مغنّیِ آتش نفس کو جی ۲ جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے
مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال ۳ تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے
کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں ۴ آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے
کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ ۵ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

شعر (۱) آرمیدگی۔ آرام طلب ہونا۔ نکوہش۔ سرزنش۔ ملامت۔ خندۂ صبح ایک مشہور استعارہ ہے لیکن دنداں نما کہہ کر واضح طور پر ہنسی مراد لی گئی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میرے جیسے دیوانہ کو تو صحرانوردی اختیار کرنا چاہئے تھی اور میں جو کاہلی اور آرام طلبی اختیار کئے بیٹھا ہوں اس پر اگر صبحِ وطن میری ہنسی اڑائے تو بجا ہے واقعی میں اس سرزنش اور تضحیک کے قابل ہوں۔ مرزا صاحب نے اسی مضمون کو ایک اور جگہ بھی لکھا ہے ؎

نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی   مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

شعر (۲) مغنّی۔ گویّا۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے ایک ایسے آتش نفس راگ گانے والے کی ضرورت ہے جس کی آواز میرے ہوش و حواس کے ساتھ برقِ فنا کا کام کرے یعنی شعلہ آواز مجھے پھونک ڈالے یعنی جس کے سننے سے وہ روحانی و وجدانی کیفیت طاری ہو کہ میری ہستی کا نام و نشان نہ رہے۔

شعر (۳) جناب قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص بےخبری اور استغراق کی حالت میں کسی راستے کو طے کرتا ہے تو چونکہ اسکو بےخبری کے عالم میں راستے کے موڑ وغیرہ کا کچھ پتہ نہیں ہوتا اسلئے اس کا راستے سے واپس آنا بہت مشکل ہوتا ہے پس شاعر کہتا ہے کہ میں وادیِ خیال محبوب کا راستہ مستانہ وار طے کرتا ہوں تا کہ پھر واپس نہ آ سکوں یعنی ہمیشہ خیال معشوق ہی میں مستغرق رہتا ہوں۔

شعر (۴) نکہت۔ خوشبو۔ جناب نظم اس کی شرح اس طرح فرماتے ہیں کہ میں نکہتِ گل کو بےحجاب سمجھتا

تھا کہ جو اُن کے در جامہ سے باہر ہو گئی تو تو اس سے بھی زیادہ بے حجاب نکلا معشوق کا بے حجاب، بیباک اور شوخ ہونا بھی ایک انداز ہے جس طرح شرمگیں و پردہ نشین ہونا بھی ایک ادا ہے۔

شعر ۵، مطلب ہے کہ میں نے اپنے لئے شاعری کو انتخاب کیا اور لوگ سمجھے کہ یہ عاشق مزاج ہے۔ جس سے میں رسوا ہو گیا۔

۱۱۴۷: زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

یعنی جب اس طرح کے حالات اور فاقہ مستی میں ہماری زندگی گزری اور نہ کوئی ہمارے دل کی آرزو پوری اور کبھی کوئی خوشی نصیب ہوئی تو ہم بھی کیا کہیں گے کہ ہمارا بھی کوئی خدا تھا یہی مضمون فارسی میں بھی لکھا ہے۔

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت
میتواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

(۱۱۴۷۸) اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے ۱ بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے
دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا ۲ میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے ۳ مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے
بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر ۴ حضرت بھی کل کہینگے کہ ہم کیا کیا کیے
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم ۵ تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو ۶ کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو ۷ دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں ۸ بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے
غالبؔ تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا ۹ مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

شعر ۱، مطلب ہے کہ اس بزم یار معشوق کی صحبت میں بے غیرت اور بے حیا بننے کے بجز صبر و ضبط سے کام

لیکر بیٹھنا مشکل ہے کیونکہ رقیبوں کے اور ان کے آپس میں نہیں معلوم کیا کیا اشارے ہوتے رہے ادھر اپنی آنکھوں سے دیکھا رہا یا میری نسبت تحقیر آمیز اشارے ہوتے رہے کہ اس کمبخت کو یہاں سے اٹھ جانا چاہیئے لیکن کیا کریں انکی صحبت چھوڑنے کو بھی دل نہیں چاہتا آخر صبر کے یا زہر کے گھونٹ پی کر بیٹھنا پڑتا ہے ؎

عدو سے آنکھ ملا کر وہ مجھ پہ ہنستے ہیں　　دل غریب پہ بجلی گرائی جاتی ہے

شعر (۲) سیاست، خوف۔ دبدبہ۔ مطلب یہ ہے کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں تمہارے در بغیر آواز دیئے چلا جاتا لیکن اس خیال سے کہ کہیں کمبخت دربان فتنہ و فساد برپا نہ کرے اور مار نوبت پہنچے یا چور چور کہہ کر پکڑوا دے میرا دل ڈر گیا اور میں خاموش تیری گلی سے گزر گیا۔

شعر (۳) خرقہ۔ لباس فقراء۔ سجّادہ۔ مصلّی۔ رہن۔ گرو کرنا کسی چیز کا بعوض دوسری چیز کے حضرات شارحین نے دعوت آب ہوا سے مراد دعوت بہار لی ہے ہمارے خیال میں اگر ہوا سے خواہش و آرزو اور آب سے شراب مراد لی جائے تو کیا بُرا ہے۔ مطلب صاف ہے۔

شعر (۴) بے صرفہ۔ بے فائدہ۔ کل یعنی قیامت۔ کیا کیا کئے یعنی ہم نے کیا کیا۔ مطلب یہ ہے کہ انسان خواہ کتنی ہی لمبی عمر کیوں نہ پائے لیکن وہ بیکار ہی جاتی ہے حضرت خضر علیہ السّلام نے کیا تھوڑی عمر پائی ہے لیکن کل قیامت کے دن حضرت خضر علیہ السّلام بھی حسرت کے ساتھ یہی کہیں گے کہ ہمیں اس طویل العمری سے کیا حاصل ہوا اور ہم نے اس طویل العمری اور دائمی زندگی کی خواہش کیوں کی؟

شعر (۵) لئیم۔ بخیل و کنجوس۔ گنجہائے گراں مایہ۔ بیش قیمت خزانے مولانا آسی نے اس شعر کی اچھی شرح کی ہے، کہ اگر مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم اتنے خزانے تجھ میں دفن تھے تو نے ان سے کیا کام لیا۔ مقدور کا لفظ پتہ دیتا ہے کہ مصنّف یہ کہنا چاہتا ہے کہ اگر دولت میرے پاس جمع ہو جائے تو میں لوگوں کو فائدے پہنچاؤں اور زمین کو طعنے دوں کہ آخر تو نے اسقدر خزانوں سے کیا کام لیا یا کسی کو کیا فائدہ پہنچایا؟ ہماری رائے میں اگر خاک سے وہ انسان مراد لئے جائیں جو بہت بڑے امیر کبیر اور متمول آدمی ہیں لیکن بیحد بخیل و کنجوس ہیں تو پھر بھی صحیح ہے کیونکہ یہ بخیل و کنجوس

مالدار کسی انسان کو فائدہ نہیں پہنچاتے۔

شعر (۶) تہمت تراشنا۔ تہمت لگانا۔ یعنی وہ کونسا دن ہے جس دن دشمنوں نے ہم پر جھوٹی تہمتیں نہ لگائیں افترا نہ باندھے اور ہم پر طرح طرح کے ظلم و ستم نہ کئے اور ہمارے سر پر مصیبتیں اور بلائیں نہ لائے بقول شخصے ؎

کون سی رات مرے قتل کا ساماں نہ ہوا   کون سا دن ہے کہ صدمے نہ اٹھائے میں نے

شعر (۷) مطلب یہ ہے کہ میری خواہش اور طلب کے بغیر معشوق خود بخود بوسہ دینے لگا ہے معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ اکثر غیروں کی صحبت میں رہا ہے اور وہاں اسے بوسہ دینے کی عادت ہو گئی ہے اور سمجھتا ہے کہ اس عاشق کی صحبت میں بھی سوائے بوس و کنار ہونے کے اور کیا مطلب ہے۔

شعر (۸) مطلب یہ ہے کہ ضد ہو جائے اور کسی بات پر اڑ جائیں تو یہ دوسری بات ہے ورنہ ہم کچھ کہہ نہیں سکتے لیکن وہ فطرتاً وفادار اور خوش اخلاق معشوق ہے کیونکہ بے خبری میں اس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے۔

شعر (۹) مرزا صاحب کا خیال تھا کہ اپنے معشوق کو جا کر داستانِ محبت سنائیں لیکن حضرت ناصح فرماتے ہیں کہ یہ تو ہم نے مان لیا کہ آپ نے وہاں جا کر داستانِ عشق سنا دی اور انہوں نے سن بھی لی، لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلے گا، کیا وہ اسے صحیح سمجھ کر تم پر مہربان ہو جائے گا؟ وہ سنکر تو یہی جواب دینگے یا وہ کوئی جواب ہی نہ دینگے ؎

یہ مذاقِ عشق اور تم؟ کرو تو یہ حضرتِ دل   ابھی پوچھیئے سلیقہ ابھی سیکھئے قرینہ

(۱۴۹) رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے ۱ اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے
مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے ۲ بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے
زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا ۳ نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے
جاداد بادہ نوشیٔ رنداں ہے شش جہت ۴ غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے
نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا ۵ جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے
میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں ۶ مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

گزرا اسدؔ مسرّت پیغام یار سے!
"قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

شعر (۱) قطع۔ طے کرنا۔ رہِ اضطراب، وہ راستہ جو حالتِ اضطراب میں طے ہو۔ سال سے عمر مراد ہے مطلب یہ کہ جس طرح گردشِ آفتاب سے رات دن، ہفتہ و ماہ و سال کا حساب کیا جاتا ہے اسی طرح گزرنیوالی عمر یعنی سن و سال کا حساب بجلی کی چال سے کرنا چاہیئے یعنی یہ کہ انسان کی عمر کا انداز بجلی کی ایک ہی چمک کے برابر ہے

شعر (۲) مینا۔ شراب کا شیشہ۔ نشاط۔ خوشی۔ تدرو۔ کبک، مشہور پرندہ، بال تدرو کے معنی قاضی صاحب نے نگہ ابرو کئے ہیں۔ نہیں معلوم یہ نگہ ابرو کیا بلا ہوتی ہے اور جناب نظم صاحب نے نگہ ابر معنی لکھے ہیں اب ہم پہلے لفظ بال کے معنی لکھتے ہیں یعنی انسان کے کاندھے سے سر ناخن تک اور بعض کہتے ہیں کہ شانہ سے کہنی تک پرندوں کے بازو کو بھی کہتے ہیں اور مرغوں کے پر بھی اور ایک قسم کی بڑی مچھلی کو بھی کہتے ہیں اور بال صیغہ امر مصدر بالیدن کا بھی ہے یہ معنی تو فارسی زبان کے ہیں، عربی میں معنی دل و جان و حال و کشادگی عیش کی اور نشان بزرگی اور ترکی میں شہد کو کہتے ہیں اور فارسی میں بال تدرو بادل کے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ اب اسکے جو معنی چاہو کرلو۔ بظاہر معنی ادا کے یہی معلوم ہوتے ہیں جو قاضی صاحب نے فرمائے ہیں کہ نشاط بہار شراب میں مینائے مے سرد کا لطف دے رہی ہے اور جلوۂ موج شراب بال تدرو کا۔

شعر (۳) پاشنہ، پاؤں کی ایڑی، ثبات، پائداری۔ نظم صاحب اسکی شرح فرماتے ہیں کہ یہ نوبت پہنچی ہے کہ اثنائے راہ میں گر کر ایڑیاں رگڑ دیئے۔ ایک دوسری جگہ بھی مرزا صاحب نے اس مضمون کو لکھا ہے ؎

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

شعر (۴) جاداد۔ جائداد۔ شش جہت، تمام عالم گیتی۔ دنیا۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا شراب نوش ندماں کی جائداد ہے اور غافل یہ خیال وہم رکھتا ہے کہ ہم شراب پینے والے بادہ نوشی کی وجہ سے رسوائے عالم ہیں اور یہ ایک

حقیقت ہے کہ نشہ کی ترنگ میں اگر دونوں عالم کو اپنی جائداد سمجھ لیا جائے تو کون اعتراض کر سکتا ہے۔

شعر (۵) مسئلہ رویت باری تعالےٰ مختلف فیہ ہے کہ ذات واجب الوجود کا مشاہدہ آنکھوں سے ہو سکتا ہے یا نہیں؟ علمائے ظاہری کا عقیدہ ہے کہ اس ذات واجب تعالیٰ کو اسی طرح دیکھینگے جس طرح آفتاب و ماہتاب کو دیکھتے ہیں لیکن علمائے باطن اور محققین کا مذہب لاتدرکہ الابصار ہی رہا ہے مرزا صاحب نے اس آخری خیال کو اس شعر میں نہایت دلکش طریقہ سے نظم کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قوت باصرہ اس برق حسن کا مقابلہ نہیں کر سکتی یعنی آنکھ اس شاہد حقیقی کو نہیں دیکھ سکتی دلیل اس کی دوسرے مصرعہ میں ہے کہ جوش بہار نقاب بن گئی یعنی زنگارنگی نے آڑ کر لی۔

شعر (۶) یعنی یہ تو میں نے مان لیا کہ تجھے آنکھیں دیکھ رہی ہیں اور ایک دیدار کی صورت ہے لیکن بیتابی دل کو کیا کروں کہ اس کی تسلی نہیں ہوتی کسی نے اس خیال کو دوسرے لفظوں میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

فقط فریب تکلم سے کیسے چین آئے
لگا کے سینے سے حسرت مٹائی جاتی ہے

شعر (۷) گزرا یعنی باز آیا۔ مطلب یہ ہے کہ میں اس خوشی سے باز آیا کہ میرے محبوب کا کوئی پیغام لیکر مجھ تک پہنچے گا۔ بلکہ مجھے تو اُلٹا اسبات کا رشک پیدا ہو رہا ہے کہ قاصد میرے معشوق سے ہمکلام ہوتا ہوگا۔

(۱۵۰) دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے ۱ میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے ۲ آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے
غیر کو یارب وہ کیونکر منع گستاخی کرے ۳ گر حیا بھی اسکو آتی ہے تو شرما جائے ہے
شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے ۴ دل کی وہ حالت کہ دم سینے میں گھبرا جائے ہے
دور چشم بد۔ تری بزم طرب سے واہ وا ۵ نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے
گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دار راز عشق ۶ پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے
اسکی بزم آرائیاں سنکر دل رنجور یاں ۷ مثل نقش مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

ہوکے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا ۸ رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے
نقش کو اُسکے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں ۹ کھینچتا ہے جسقدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے
سایہ میرا مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے اسدؔ
۱۰۔ پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

شعر (۱۱) مرزا صاحب نے اپنے کمال رشکِ غیرت کا ثبوت دیا ہے اور یہ مبالغہ بھی انتہا ہے لیکن حضرت بو علی قلندر رحمتہ اللہ علیہ اس سے پہلے اس رشکِ غیرت کا ثبوت دے چکے ہیں یعنی ؎

غیرت ایں چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم   گوش را نیز حدیثِ تو شنیدن نہ دہم

حضرت خواجہ حافظ رح نے اس مضمون کو لکھا ہے ؎

بخدا کہ رشکم آید کہ نظر کنم کہ رویش   کہ نظر دریغ باشد بہ چنیں لطیفہ روئے

مرزا غالب متعدد جگہ اس مضمون کو لکھ چکے ہیں یعنی ؎

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن   وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

شعر (۱۲) آبگینہ۔ کانچ۔ شیشہ گلابی شراب مطلب یہ ہے کہ اگر اندیشہ کی یہی صورت ہے اور ایسی ہی اس میں گرمی ہے تو دل سے ہاتھ دھو لینا چاہیئے کیونکہ دل ان گرم خیالات کی تاب نہیں لاسکتا یہ ایک ایسی تند و تیز شراب ہے کہ جو شیشہ مے کو بھی گداز کر دیگی۔ مرزا صاحب نے فارسی میں بھی اس مضمون کو لکھا ہے ؎

مینائے مے ز تندی ایں مے بہ گداز د   پیغام غمت درخور تحویل صبا نیست

شعر (۱۳) مولانا حالی فرماتے ہیں کہ یہ شعر معاملہ کا ہے جو طالب و مطلوب کے درمیان اکثر گزرتا ہے اور نہایت نزاکت دونو مصرعہ میں پائی جاتی ہے ظاہر ہے کہ حیا آنی اور شرما جانا درحقیقت ایک ہی چیز ہے پھر اسکے کیا معنی کہ حیا بھی آتی ہے تو شرما جاتا ہے بات یہ ہے کہ اس مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے اور شرما جانے کا متعلق اور اگر حیا بھی آتی ہے یعنی غیر کی گستاخی اور خواہش بیجا سے اور شرما جاتا ہے یعنی غیر سے یا اسکے سامنے تکرار کرنے سے

حیا و شرم کے مضمون کو ایک اور شاعر نے ان دلکش الفاظ میں ادا کیا ہے ؎

مجھے تو توبہ بھی کرتے ہوئے حیا آئی   مرے گناہوں نے اس درجہ شرمسار کیا

شعر (۴) لت۔ بری عادت، نالہ کھینچے جائیے۔ نالہ کشی۔ مطلب ہے کہ میرا شوق تو اس بری عادت میں مبتلا ہے کہ دن رات نالہ کشی کرتے چلے جاؤ لیکن دل ناتواں کی یہ حالت ہے کہ لینے سے بھی عاجز ہے اب نالہ کشی ہو تو کیسے ہو۔ یہاں تو دم کشی سے ہی ناک میں دم ہے۔

شعر (۵) یعنی تیری محفل عیش و نشاط کو خدا نظر بد سے بچائے کہ اس میں مسرت و خوشی کا یہ عالم ہے کہ اگر میں نالہ کرتا ہوں تو وہاں پہنچکر وہ نغمہ بن جاتا ہے یعنی چاہئیے تو یہ تھا کہ اسے سنکر متاثر بہ اندوہ ہوتا بلکہ تو تو الٹا مسرور و محظوظ ہوتا ہے اس مضمون کو مرزا صاحب نے ایک اور جگہ بھی لکھا ہے ؎

ہمنشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزم عیش دوست   واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبار نغمہ ہے

شعر (۶) مطلب ہے کہ اگرچہ میرے محبوب کا انداز تغافل ہمارے راز محبت کی پردہ داری کرتا ہے لیکن ہماری شامت اعمال ملاحظہ ہو کہ اسکے اس انداز بے نیازی کو دیکھ کر ہم کچھ ایسے مبہوت، سراسیمہ اور مضطرب الحال ہو جاتے ہیں کہ اہل محفل کو شک ہو جاتا ہے کہ ضرور اس شخص کا اسکے ساتھ کچھ نہ کچھ تعلق اور لگاؤ ہے حکیم مومن خاں نے بھی یہی مضمون لکھا ہے ؎

کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے   کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

شعر (۷) یعنی جب میں سنتا ہوں کہ غیر نے اسکی محفل میں رنگ جمایا ہوا یا سکہ بٹھایا ہوا ہے تو میرا دل بھی یہاں اسی طرح بیٹھ جاتا ہے۔

شعر (۸) عشق میں رنگ کے اڑنے یعنی ہلکے ہونے کو رنگ کا کھلنا کہا ہے مطلب ہے کہ جب سے میرا پری چہرہ محبوب کسی پر عاشق ہوا تو اثر عشق کی وجہ سے اس کا رنگ اڑ گیا ہے تو وہ اور بھی پیارا معلوم ہوتا ہے۔

شعر (۹) نقش سے مراد اس جگہ تصویر محبوب ہے مطلب ہے کہ اسکی تصویر بھی اپنے مصور سے کس ناز و انداز

کا برتاؤ کر رہی ہے یعنی مصور تصویر کھینچتا ہے تو تصویر مصور کو اپنا عاشق سمجھ کر اس سے کھنچتی ہے۔

شعر (۱۰) آگ سے دھواں اٹھنے کو اس کا بھاگنا مراد لیا ہے اور اپنی ذات کو آتش بجاں کہہ کر اپنے سایہ کو اس دھوئیں سے تشبیہ دی ہے مطلب یہ ہے کہ میں ایسا آتش بجاں یا مصیبتوں کی آگ میں گھر کر ایسا سراپا سوز ہوا ہوں کہ دھوئیں کی طرح میرا سایہ بھی مجھ سے دور بھاگ رہا ہے۔

(۱۵) گرم فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے ۱ تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے
نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم ۲ لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے
کثرت آرائی وحدت ہے پرستاریِ وہم ۳ کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے
ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا ۴ عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

شعر (۱) شکل نہالی سے مراد وہ تصویر ہے جو بستر پر بنی ہوتی ہے اور برد لیالی سے مراد ٹھنڈی راتیں ہیں برد۔ برودت سے مشتق اور لیالی لیل کی جمع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شکل نہالی دیکھ کر مجھے صورت محبوب یاد آگئی اور اس یاد نے میرے دل میں بیحد گرمی عشق پیدا کی اور میں سرگرم آہ و فریاد ہوا پس اس طرح سے یہ بلا کی ٹھنڈی راتیں میں نے کاٹیں اور اس سردی سے میں امان میں رہا۔

شعر (۲) نسیہ۔ ادھار۔ قرض۔ مجازاً عقبیٰ۔ مطلب یہ ہے کہ میری عالی ہمتی کی وجہ سے میرا مرتبہ دونوں جہان کی برتری سے بھی بلند ہے اور میری نگاہ میں ان دونوں کی کوئی حقیقت نہیں۔

شعر (۳) اصنام جمع صنم بمعنی بت مجازاً معشوق۔ مطلب یہ ہے کہ وحدت کو کثرت میں جلوہ گر سمجھنا یعنی یہ خیال کرنا کہ خداوند تعالیٰ ہر چیز میں موجود ہے وہم پرستی ہے اور ان خیالی بتوں نے یعنی وحدت کو کثرت میں جلوہ آرا سمجھنے نے مجھے کافر بنا دیا ہے۔

شعر (۴) جناب مہدی صاحب فرماتے ہیں کہ اس شعر میں نفس کا یہ خاصہ بتایا ہے کہ انسان کسی مقصد کے حاصل کرنے میں اس وقت کوشش کرتا ہے اور اس کو توقع ہوتی ہے جبتک اسباب حصول بھی مہیا ہوتے ہیں جب تمام

اسباب و ذرائع مفقود ہو جاتے ہیں تو مقصود کا خیال بھی دل سے نکل جاتا ہے بقول شخصے ؎

دل کو آباد کیا عشق میں ویراں ہوکر گھر کی آرائشیں کیں بے سر و ساماں ہوکر

(۱۵۲) کارگاہ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے ۱ برق خرمن راحت خون گرم دہقاں ہے
غنچہ ناشگفتن ہا برگ عافیت معلوم ۲ باوجود دلجمعی خواب گل پریشاں ہے
ہم سے رنج بیتابی کس طرح اٹھایا جائے ۳ داغ پشت دست عجز شعلہ خس بدنداں ہے

شعر (۱) اس شعر کے اور آئندہ دونوں شعروں کے معنی مرزا صاحب نے مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہوئے خود بیان فرمائے ہیں لکھتے ہیں۔ "داغ ساماں" مثل انجمن وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ و ساماں ہو۔ موجودات لالہ کی منحصر نمائش داغ پر ہے ورنہ رنگ اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے بعد اسکے یہ سمجھ لیجئے کہ پھول کے درخت یا غلہ جو کچھ بویا جاتا ہے دہقان کے جوتنے بونے، پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہوتا ہے مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجود محض رنج والم ہے اور مزارع کا وہ لہو جو کشت و کار میں گرم ہوا ہے وہی لالہ کی راحت کے خرمن کا برق ہے۔ حاصل موجودیت داغ اور داغ مخالف راحت اور صورت رنج (عود ہندی)

شعر (۲) یعنی جب نیا غنچہ شگفتہ ہو اور بصورت قلب صنوبری نظر آئے اور جب تک پھول بنے برگ عافیت معلوم یہاں معلوم بمعنی معدوم ہے اور برگ عافیت بمعنی مایۂ آرام۔ برگ اور سر و برگ بمعنی ساز و ساماں ہے خواب گل و شخصیت گل باعتبار خاموشی و برجاماندگی، پریشانی ظاہر ہے یعنی شگفتگی وہی پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا۔ غنچہ بصورت دل جمع ہے، باوصف جمعیت دل گل کو خواب پریشان نصیب ہے۔

شعر (۳) پشت دست صورت عجز۔ اور خس بدنداں کاہ بدنداں گرفتن بھی اظہار عجز ہے پس جس عالم میں کہ داغ نے پشت دست زمین پر رکھ دی ہو اور شعلہ نے تنکا دانتوں میں لیا ہو ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کس طرح ہو؟

(۱۵۳) اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

مطلب یہ ہے کہ وحشت وجنوں ویرانہ پسند ہوتے ہیں پس گھر میں در و دیوار پر سبزہ اگنے کو جو ویرانی کی علامت ہے بہار سے تشبیہ دی ہے۔

(۱۵۴) سادگی پر اُسکی مر جانے کی حسرت دل میں ہے ۱ بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا ۲ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے باایں ہمہ ۳ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے
بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائیگی ۴ یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے
رنج رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے ۵ اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے
جلوہ زار آتش دوزخ ہمارا دل سہی ۶ فتنۂ شور قیامت کس کی آب و گل میں ہے

ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسم پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے ۷

شعر (۱) مولانا حسرت اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ ہمارے دل میں اسکی سادگی پر مر جانے کی حسرت ہے لیکن پھر بھی بس نہیں چلتا کیونکہ اسکے ہاتھ میں خنجر ہے یا یہ کہ اسکی سادہ لوحی پر مرجانے کی حسرت ہے جو ہم کو خنجر سے مارنا چاہتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ ہمیں بے خنجر ہی شہید کر سکتا ہے۔

شعر (۲) مولانا حالی فرماتے ہیں کہ کسی کے حسن بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ جو بات قائل کے منہ سے نکلے وہ سامع کے دل میں اس طرح اُتر جائے کہ اس کو یہ شبہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی ایک اور شاعر اسی مضمون کو اس انداز سے بیان کرتا ہے۔

یہ تمہارے منہ کی باتیں ہیں فریب آرزو مجھ کو سب معلوم ہے جو کچھ تمہارے دل میں ہے

شعر (۳) مطلب صاف ہے۔

شعر (۴) بس یعنی بس کر مطلب ہے کہ اے کثرت یاس تو اب مہربانی کر اور بس کر اور ہمارے

دل میں اتنا ہجوم نہ کر یہ تو ہم جانتے ہیں کہ ہماری کوششیں بے سود ہیں مگر ہم کو اس میں ایک لذت حاصل ہے کہیں ایسا نہ کر کہ تیری وجہ سے ہم اس لذت سے بھی محروم رہ جائیں۔

شعر (۵) واماندگی۔ پیچھے رہ جانا۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ واماندگی کو ہم سے عشق ہے اس لئے میں صعوبت منزل کیوں اٹھاؤں اور میں جہاں تھک کر بیٹھ جاتا ہوں وہی اپنی منزل خیال کرتا ہوں ایک اور شاعر منزل کا قافیہ اس طرح لکھتا ہے

؎ رہروِ عشق و محبت کی نہ ٹوٹے کیوں کمر   میرے دل کا قافلہ اجڑی ہوئی منزل میں ہے

شعر (۶) بطور طنز مرزا صاحب اپنے معشوق سے کہہ رہے ہیں کہ اچھا صاحب ہمارا دل آتش محبت کی وجہ سے نمونۂ دوزخ ہی سہی لیکن یہ تو فرمائیے کہ فتنۂ شور قیامت کس کے خمیر طینت میں ہے؟ آب و گل کا قافیہ ایک شاعر اس طرح لکھتا ہے،

؎ سوزِ غم، شوقِ محبت اور وفا و انکسار   میرے جذبِ باد و آتش اور آب و گل میں ہے

شعر (۷) یعنی غالب کا دل شوریدہ دل نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک طلسم پیچ و تاب ہے اے رحمن اگر تو غالب پر رحم نہیں کرتا تو نہ سہی لیکن اس دل میں جو تیری تمنا چھپی ہوئی ہے اس پر تو رحم کر یعنی میری تمنا پوری کر بقول شخصے ؎

اس میں تری محبت اس میں تری تمنا   میرے دلِ حزیں پر کچھ سوچ کر جفا کر

(۱۵۵) دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی ۱ دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراق ۲ تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں ۳ اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں ۴ بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی
دیکھو تو دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا ۵ موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی ۶ اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا ۷ مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
فردا و دی کا تفرقہ اک بار مٹ گیا ۸ کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
۹- وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

شعر (۱) یعنی تیرا تیر نظر دل و جگر میں پیوست ہوگیا یا دل زخمی ہوا تو اس کی مشارکت سے جگر بھی اثر پذیر ہوا ورنہ اصل میں محل عشق و محبت دل ہے نہ کہ جگر۔

شعر (۲) یعنی لذت فراق ایسی اچھی چیز ہے کہ جس سے ہمارا سینہ پھٹ گیا اور ہم زخم جگر کے چھپانے کی تکلیف سے بے نیاز ہوگئے۔

شعر (۳) یعنی جب رات کی بادہ نوشیوں کی مستیاں ہی نہیں ہیں تو پھر اے نفس بیدار ہوجا کہ اب صبح کی نیند کی لذت کیسی؟

شعر (۴) یعنی جب میری مٹی ہوا کے ذریعہ محبوب تک پہنچ گئی تو اب مجھے بال و پر ہونے کی حسرت نہیں رہی

شعر (۵) گل کترنا، کوئی تعجب کا کام کرنا یا ایسا کام کرنا جس میں فتنہ و فساد پیدا ہو مطلب یہ ہے کہ اسکے نقش قدم کے انداز کی دلفریبی تو ملاحظہ ہو کہ اسکی موج خرام نے کیسے کیسے گل کھلائے ہیں یعنی تمام راستہ گلزار بنا دیا ہے

شعر (۶) مطلب صاف ہے یعنی اہل ہوس کا عشق جھوٹا ہوتا ہے اسلئے انکو دیکھتے ہوئے عاشقان صادق کے عشق و محبت کا اعتبار بھی اُٹھ گیا۔

شعر (۷) یعنی تجھے دیکھ کر ایسی خود رفتگی ہوئی کہ اُسکے باعث تیرا جلوہ نہ دیکھ سکے جو نگاہ تیرے رُخ تک پہنچی وہ مست ہوکر بکھر گئی اس طرح نظارہ نے بھی نقاب کا کام کیا (مہدی) اس خیال کو مرزا نے ایک اور جگہ بھی ادا کیا ہے

ع نظارہ کیا حریف ہو اس برق حُسن کا   جوش بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

شعر (۸) فردا- آئندہ کا دن۔ دی- دیروز یعنی روز گزشتہ۔ مطلب یہ ہے کہ کل جب تم گئے تو ہمارے نظر سے فردا و دی کا تفرقہ مٹ گیا اور گذشتہ کل ہی فردائے قیامت ہوگئی۔

مولانا حالی فرماتے ہیں تمہارے جاتے ہی بہ سبب از خود رفتگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہوگئی کہ آج کل کی مطلق

تمیز نہ رہی اور ایسا ہی قیامت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونوں مبدل بہ زمانہ حال ہو جائینگے پس تم کیا گئے کہ گویا ہم پر قیامت گزر گئی۔ قیامت گزر جانے کے دونوں معنی ہیں نہایت سختی کا زمانہ گزرنا اور خود قیامت کا آجانا۔

شعر (۹) شعر صاف ہے۔

(۵۶) ا تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے ۱ حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے
اپنی گلی میں تجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل ۲ میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم ۳ ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم ۴ میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے
تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا ۵ فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں ۶ مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا
۷ تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

شعر (۱) یعنی ہم کو دل کی تسلی کی ضرورت نہیں، تسکین ہو یا نہ ہو لیکن یہ چاہتے ہیں کہ بہشت کی حوروں میں کوئی تیری جیسی ہم صورت مل جائے گو اس میں بھی تسکینِ خاطر تو نہ ہوگی لیکن ذوقِ نظر تو ہوگا۔

شعر (۲) کمالِ رشک و غیرت کا مضمون ہے کہ عاشق کو یہ بھی گوارا نہیں کہ میرے پتہ سے غیر لوگ میرے معشوق کا گھر دریافت کریں۔

شعر (۳) ساقی گری کی شرم یعنی اپنی شان اور حیثیت کے مطابق مجھے پلاؤ ورنہ یوں پینے کو تو ہم روز پیتے ہیں۔

شعر (۴) کچھ کلام نہیں یعنی کچھ شکایت نہیں مرزا صاحب نے خود ایک خط میں اس شعر کی شرح فرمائی ہے۔

یعنی لکھتے ہیں کہ عاشق کو ایک قاصد کی ضرورت ہوئی مگر کھٹکا یہ کہ کہیں قاصد معشوق پر عاشق نہ ہو جائے ایک دوست اس عاشق کا ایک شخص کو لایا اور اُس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی وضعدار اور معتمد الیہ ہے میں ضامن ہوں کہ ایسی حرکت نہ کریگا خیر اسکے ہاتھ خط بھیجا گیا قضارا لعاشق کا گمان سچ ہوا قاصد مکتوب الیہ کو دیکھکر والہ و شیدا ہو گیا۔ کیسا خط کا جواب دیوانہ بن کپڑے پھاڑ جنگل کو چل دیا اب عاشق اس واقعہ کے وقوع کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ غیب داں تو خدا ہے کسی کے باطن کی کسی کو کیا خبر ہے اے ندیم تجھ سے کچھ کلام نہیں لیکن اگر نامہ بر کہیں ملجائے تو اسکو میرا سلام کہنا کہ کیوں صاحب تم کیا کیا دعوے عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا؟ ندیم یعنی دوست و ہمنشین۔

شعر (۵) جناب آسی صاحب اس شعر کی شرح میں فرماتے ہیں کہ مجنوں کی تعریفیں ہمارے سامنے کیا بیان کرتے مجنوں تو آزاد تھا کہ جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہا مگر ہم کو تو غم پنہاں روک روک کر رکھتا ہے اگر اس سے ذرا ہمیں فرصت ملے تو ہم بھی تم کو بتائیں کہ مجنوں نے کیا کیا تھا یعنی مجنوں نے ہمارے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں کیا بقول شخصے

یہ کہاں کا عشق ہے آزادئ صحرا نورد کہدے مجنوں سے کہ کھینچے وہ مری زنجیر کو

شعر (۶) یعنی یہ ضروری نہیں کہ ہم خضر کی پیروی کریں وہ رہنما ہیں تو ہوا کریں ہم تو ان کا ساتھی ہونا اسلیئے پسند کرتے ہیں کہ ایک شریک سفر مل گیا ورنہ جیسے وہ ویسے ہم۔

شعر (۷) شعر صاف ہے

(۷۵) کوئی دن گر زندگانی اور ہے ۱ اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں ۲ سوز غمہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں ۳ پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
دیکے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر ۴ کچھ تو پیغام زبانی اور ہے
قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم ۵ وہ بلائے آسمانی اور ہے
ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ۶ ایک مرگ ناگہانی اور ہے

شعر (۱) مرزا صاحب اپنے ایک خط میں اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں کہ "اس میں کوئی اشکال نہیں ہے لفظ ہیں وہی معنی ہیں شاعر اپنا مقصود کیوں بتائے کہ میں کیا کرونگا۔ مبہم کہتا ہے کہ میں کچھ کرونگا۔ خدا جانے شہر میں یا نکاح شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ گئے یا دیس چھوڑ پردیس چلا جائے۔

شعر (۲) یعنی میرے سوزِ غمہائے پنہاں میں جو گرمی و حرارت ہے وہ آتشِ دوزخ میں کہاں ہے بقول شخصے ؎

اس قدر ہے تپش سوزِ دروں فرقت میں　　دیکھ کر ٹھنڈی جسے نارِ سقر ہو جائے

شعر (۳) سرگرانی یعنی خفگی۔ مطلب یہ ہے کہ یوں تو وہ ہمیشہ ہی ہم پر ناراض اور ہم سے رنجیدہ رہتے رہتے ہیں لیکن اس مرتبہ وہ حد سے بڑھ کر غضبناک اور خفا ہوئے ہیں بقول شخصے ؎

خبر نہیں کہ ہوئی کیا خطا غریبوں سے　　غضب کی چتونیں ہیں منہ بنائے بیٹھے ہیں

شعر (۴) یعنی معشوق کا خط دینے کے بعد جو قاصد میرے منہ کی طرف دیکھ رہا ہے تو اس سے شبہ ہوتا ہے کہ خط کے علاوہ کچھ زبانی باتیں بھی اس نے کہی ہیں جو بہت سخت ہیں اور قاصد انہیں زبان پر لاتے ہوئے پس و پیش کر رہا ہے۔

شعر (۵) اعمار جمع عمر۔ قاطع اعمار نجوم یعنی قاتل سیارے۔ مطلب یہ ہے کہ اکثر قاتل ستارے عمروں کو کاٹ ڈالتے ہیں یعنی ان کی گردش سے ایام زندگی ختم ہو جاتے ہیں لیکن میرا معشوق وہ بلائے آسمانی ہے کہ وہ زندگی کو موت سے بھی بدتر بنا دیتا ہے۔

شعر (۶) شعر صاف ہے یعنی اور تو تمام مصیبتیں ہم برداشت کر چکے ہیں۔ صرف ایک اچانک موت والی باقی رہ گئی ہے۔

(۱۵۸) کوئی امید بر نہیں آتی　۱　کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے　۲　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　۳　اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد　۴　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ۵ ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں ۶ میری آواز گر نہیں آتی
داغ دل گر نظر نہیں آتا ۷ بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی ۸ کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی ۹ موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

شعر (۱) یعنی بہتیری کوششیں اور تدبیریں کیں لیکن کوئی امید پوری نہ ہوئی یعنی تمام عمر ختم ہو گئی اور کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

شعر (۲) یعنی یہ تو صحیح ہے کہ ہم نے تنگ آکر موت آنے کی دعائیں کیں اور ہماری دعائیں قبول نہ ہوئیں اور موت اپنے وقت مقررہ پر ہی آئیگی لیکن شب فراق میں نیند کیوں نہیں آتی؟ کیا یہ بھی دوسری موت تو نہیں؟

شعر (۳) یعنی اس سے پہلے تو اتنا بھی تھا کہ ہمیں اپنے دل کی بیتابیوں اور بےچینیوں پر ہنسی آجایا کرتی تھی لیکن مایوسیوں اور حرماں نصیبوں نے ایسا بےحس کر دیا ہے کہ اب کسی بات پر ہنسی نہیں آتی خواہ وہ خوشی کی ہی بات کیوں نہ ہو؟

شعر (۴) یعنی میں عبادت و پرہیزگاری کے فوائد سے بخوبی واقف ہوں لیکن کیا کروں طبیعت اس طرف مائل ہی نہیں ہوتی۔

شعر (۵) یعنی میری خاموشی بھی کسی مصلحت پر مبنی ہے ورنہ میں بھی بہت کچھ باتیں کرنا جانتا ہوں بقول شخصے ؎

ہماری خامشی پر یہ نہ سمجھو دل نہیں رکھتے
یہ تیرا منہ ہے ورنہ ہم کسی کی بات سنتے ہیں؟

شعر (۶) مطلب ہے کہ میں کیوں نہ نالہ و فریاد کروں کیونکہ میرے محبوب کو میرا نالہ و فریاد میں مبتلا رکھتی

پسند ہے۔

شعر (۷) چارہ گر کہتا ہے کہ سینہ پر بظاہر تو کوئی داغ نظر نہیں آتا مرہم کہاں لگاؤں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ داغ تو سینے کے اندر ہے کیا تمہیں دل کے جلنے کی بو بھی نہیں آتی۔

شعر (۸) یعنی ہم محبوب حقیقی کی محبت میں ایسے بیخود ہوئے ہیں کہ ہمکو اپنی بھی خبر نہیں کہ ہم کہاں اور کس حال میں ہیں

شعر (۹) میں انتظار موت میں مرا جاتا ہوں یہ موت مجازی ہے مطلب یہ ہے کہ مجھے مجازی موت آ آتی ہے لیکن حقیقی موت نہیں آتی۔

شعر (۱۰) مگر بمعنی شاید۔ یعنی تمہاری تمام عمر تو غالب سیہ کاری میں گزری اب تم کس منہ سے کعبہ جانے کا ارادہ کر رہے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی؟

(۱۵۹) دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ۱ آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار ۲ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں ۳ کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
ق جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود ۴ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ۵ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے ۶ نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ۷ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید ۸ جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا ۹ اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں ۱۰ میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب ۱۱ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

شعر (۱) شعر صاف ہے اور درد سے دردِ عشق مراد ہے۔

شعر (۲) گویا ابھی عشق کے کوچہ میں قدم رکھا ہے اور عاشق و معشوق میں جو راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں ان سے ناواقف ہے اسلئے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے اسکے بیزار ہونے پر تعجب کرتا ہے (یادگار غالب) یہ شعر بھی اسی شعر کا ہم معنی ہے

؎ یہ کہاں کی منصفی ہے تاج تو الفت کرے   اور تو ناراض ہو سن سن کے باتیں پیار کی

شعر (۴) مطلب یہ ہے کہ میں کوئی گونگا تو نہیں ہوں جو آپ مجھ سے بات تک نہیں کرتے اور یہ پوچھتے ہی نہیں کہ تمہارا کیا سوال ہے تمہاری کیا خواہش ہے بقول شخصے ؎

میں منتظر ہی رہا کب وہ خود ہی کہتے ہیں   کہ آج سے تری حسرت مٹائی جاتی ہے

قطعہ ۴، ۵، ۶، ۷، سرمہ سا، سبزگیں، معدومات نہ آپس میں ممتاز ہوتے ہیں اور نہ انکی طرف کوئی صفت منسوب ہو سکتی ہے امتیاز اور صفات کا انتساب وجود میں آنیکے بعد ہوتا ہے اسلئے شاعر کہتا ہے کہ جب تیرے سوا کوئی موجود نہیں اور سب چیزیں معدوم ہیں تو پھر یہ امتیازات و صفات یعنی پری چہرہ، غمزہ و عشوہ، سبزۂ گل، ابر و باد وغیرہ کیا ہیں؟ (مہدی)

شعر (۸ و ۹) دونوں شعروں کا مطلب صاف ہے۔

شعر (۱۰) یعنی میں دوسرے لوگوں کی طرح صرف زبانی دعا نہیں دیتا بلکہ تم پر جان نثار کرتا ہوں۔

شعر (۱۱) یعنی یہ تسلیم کیا کہ غالب ایک بے حقیقت ہستی ہے لیکن یہ تو دیکھو کہ غلام بے دام ہے مفت کا خادم ملتا ہے کیا برا ہے؟

اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے ۱ کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے (۱۷۰)
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے ۲ ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت
آتا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے ۳ ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے ۴ ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے ۵ جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے ۶ ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں ۷ اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے
کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر ۸ اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

اس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

شعر (۱) غالیہ، ایک مرکب خوشبو ہوتی ہے جو مشک و عنبر اور کافور وغیرہ سے ترکیب دیکر بنائی جاتی ہے۔ مو۔ بال۔ مطلب ہے کہ اے ہم نشینو تم تو ابھی یہی دعائیں کر رہے ہو کہ خدا کرے کہ وہ غالیہ مو یعنی گیسوئے مشکیں والا معشوق کبھی آ جائے لیکن میری یہ خواہش ہے کہ کوئی دن ایسا بھی آئے کہ تم میں سے کوئی شخص گھبرا کر یہ کہے اٹھئے کہ لو وہ آ گئے

شعر (۲) مطلب ہے کہ گو اس وقت میرا دم واپسیں ہے اور کوئی دم کا مہمان ہوں اور کشمکش نزع میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس سے ہمکلام نہیں ہو سکتا لیکن پھر بھی بتقاضائے محبت میری یہی خواہش ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح میری بیمار پرسی کو ضرور آتے۔

شعر (۳) عقب سا۔ بھی۔ مطلب ہے کہ دنیا میں ہمارا آنا بھی کوئی آنا ہے کیونکہ جتنا عرصہ بھی یہاں رہے بےچین و بیقرار رہے۔

شعر (۴) بادہ دوشینہ یعنی رات کی پی ہوئی شراب جو مرنے سے پہلے پی تھی محض از راہ شوخی کہتا ہے کہ نکیرین کے سوال و جواب سے بچنے کی کوئی تدبیر اسکے سوا نہیں کہ شراب پی کر مریں تاکہ نکیرین منہ کی بو کی کراہت سے بغیر سوال و جواب کے چلے جائیں۔ (یادگار غالب)

شعر (۵) مطلب ہے کہ ہمارا محبوب حقیقی خواہ کسی لباس میں جلوہ گری کرے ہمیں وہ محبوب ہی نظر آئے گا مگر وہ جلاد و قاتل کی صورت میں آئے تو اس سے لڑینگے نہیں اور اگر وہ غلام کی صورت میں آئے تو ہم اس سے جھگڑینگے نہیں؟

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش من انداز قدت را مے شناسم

شعر (۶) نایافت، نہ پانا۔ لاحاصل۔ مطلب ہے کہ اے اہل طلب جب تلاش کرنے پر بھی وہ ہم کو نہ ملا تو ہم ایسے حیرت زدہ ہوئے کہ خود بھی کھوئے گئے اور حیرت میں اچھے رہے ورنہ لوگ طعنہ دیتے کہ تلاش کیا اور کچھ نہ پایا۔

منزلیں عشق و محبت کی ہوئیں طے اسقدر   رفتہ رفتہ ہو کے گم میں خود ہی منزل ہو گیا

شعر (۷) شیوہ۔ طریقہ۔ مطلب ہے کہ ہمارا طریقہ بیکار بیٹھنا نہیں ہے اگر بتوں کے دروازے سے کچھ نہ ملا تو کعبہ چلے گئے کہ لوگ حاجی تو کہیں گے۔

شعر (۸) ہم نفسوں۔ دوستوں۔ مطلب ہے کہ میرے دوستوں نے اسکے سامنے میری گریہ و زاری کا تذکرہ کیا لیکن اُسے پتہ چل گیا کہ میری نالہ و زاری بیسود و بے اثر ہے دوستوں نے مجھ پر احسان کیا کہ مجھے ڈبو ہی دیا۔

شعر (۹) مطلب ہے کہ اس نازنین کی بزم ناز کے کیا کہنے وہاں تو بے پروائی ہی بے پروائی جلوہ گر ہے۔ اے غالب ہم بھی وہاں گئے تھے تیری باریابی کیلئے بہت کوشش کی لیکن اس نے ایک نہیں مانی گویا ہم تیری قسمت کا رونا رو آئے یا اس بات پر گریہ کیا کہ تو اس محفل میں باریاب نہیں۔

(۱۶۱) پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے ۱ سینہ جویائے زخم کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن ۲ آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز ۳ پھر وہی پردۂ عماری ہے
ق چشم دلالِ جنسِ رسوائی ۴ دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی ۵ وہی صد گونہ اشکباری ہے
دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر ۶ محشرستانِ بے قراری ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے ۷ روز بازارِ جاں سپاری ہے
پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں ۸ پھر وہی زندگی ہماری ہے
ق پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز ۹ گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر ۱۰ زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال ۱۱ ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب ١٢ اشکباری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا ١٣ آج پھر اس کی روبکاری ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
١٤- کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

شعر (١) جویا۔ متلاشی۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دلمیں پھر محبت کی بےچینی شروع ہو گئی ہے اور سینہ میں پھر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کسی کی تیغِ نگاہ سے دل پر گہرے زخم آئیں۔ اس خیال کو ایک شاعر یوں شرح و بسط سے بیان کرتا ہے۔

خیال آتا ہے پھر راہ و رسم پیدا کریں ١ پھر آرزوئے کہن کا وہی تقاضا کریں
پرانے زخمِ جگر جا کے خود ہی تازہ کریں ٢ کریں وہ وار تو ہم انکے منہ کو دیکھا کریں

مدت ہوئی انہیں بھی مشقِ ستم نہیں ہے

دل بھی یہاں جز تیغِ دو دم نہیں ہے

شعر (٢) موسمِ بہار میں وحشت و جنوں زوروں پر ہو جاتے ہیں مطلب یہ ہے کہ پنجۂ جنون سے پھر اپنے جگر کو زخمی کرینگے اور ہمارے زخمِ جگر رنگ لالہ کی بہار دینگے۔

شعر (٣) عماری۔ محمل۔ ہودہ۔ مطلب یہ ہے کہ پھر وہی پردۂ عماری ہماری نگاہِ نیازمند کا قبلہ بنا ہوا ہے۔

شعر (٤) مطلب یہ ہے کہ ہمارا دل پھر ذلت و خواری کی لذت کا خریدار بننا چاہتا ہے اور آنکھ انکی دلالی کرتی ہے۔

شعر (٥) وہی سینکڑوں طرح کی نالہ و زاری ہے اور پھر وہی سینکڑوں طرح کی بےچینی میں مبتلا رہنا شعار ہو گیا ہے۔

شعر (٦) ہوا۔ خواہش یعنی خرامِ ناز کی خواہش نے پھر دل میں ایک قیامت برپا کر رکھی ہے۔ خرامِ ناز اور محشرستان کی رعایت ظاہر ہے۔

شعر (٧) مولانا حسرتؔ شرح فرماتے ہیں کہ جلوۂ یار پھر برسرِ ناز ہے اور جاں سپاری عشق کا بازار گرم ہے۔

شعر (٨) شعر صاف ہے۔ بقول شخصے ؎ پھر دیدیا ہے ہم نے امانت شکن کو دل ۔ کافر پہ اعتبار کیا ہائے کیا کیا؟

قطعہ ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ ایک فریاد و زاری ہے یعنی چاروں طرف معشوق کی ستم شعاری ہے آہ و بکا کا عالم ہے۔ لفظ ایک کثرت کے معنی دیتا ہے دبکاری ہے یعنی حاکم کے سامنے پیشی ہے ماحصل سارے قطعہ کا یہ ہے کہ عشق و دلربائی کا بازار پھر گرم ہو گیا ہے ایک اور شاعر ان ہی خیالات کو ان الفاظ میں ادا کرتا ہے ؎

پھر بہار آئی ہرا زخم کا انگور ہوا   ہدف تیر نظر پھر دل رنجور ہوا
چٹکیاں دل میں نہ لے دیکھ تو اے جذب کلیم   پھر کوئی شخص فروغ شمع طور ہوا
پھر نگاہ غلط انداز نے جادو ڈالا   آج پھر عشق میں دیوانہ و مسحور ہوا

شعر (۱۴) یعنی بیخودی بے سبب نہیں ہے بلکہ راز محبت چھپانے کیلئے بیخودی کا پردہ کیا گیا ہے۔

(۲۴۹) جنوں تہمت کش تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی ۱ نمک پاش خراش دل ہے لذت زندگانی کی
کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی ۲ ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی
پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہ طفلاں ہے ۳ شرار سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی

شعر (۱) مطلب ہے کہ رنج یا تکلیف کی حالت میں اگر خوشی یا راحت مل جائے تو اسکے بعد رنج و تکلیف کا احساس اور بڑھ جاتا ہے اسے ان الفاظ میں ادا کیا ہے اگر ہم نے کچھ شادمانی حاصل کی تو ہمارے جنوں پر تسکین دہی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا لذت زندگی جو ملتی ہے وہ زخم دل پر نمک کا کام کرتی ہے جس سے تکلیف اور زیادہ ہو جاتی ہے۔

شعر (۲) مطلب ہے کہ اس دنیا میں کوئی شخص تعلقات کی کشمکش سے آزادی حاصل نہیں کر سکتا مثال کے طور پر دیکھئے کہ آب رواں میں جو موج ہوتی ہے وہ زنجیر کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔

شعر (۳) مطلب ہے کہ مرنے کے بعد بھی دیوانہ محبت کی قبر بچوں کی زیارتگاہ بنی ہوئی ہے یعنی بچے آ کر دیوانہ کی قبر پر بھی پتھر مارتے ہیں اور ان پتھروں کی رگڑ سے جو چنگاریاں نکلتی ہیں وہ پھولوں کا کام دے رہی ہیں۔

([illegible]) نکوہش ہے سزا فریادی بیداد دلبر کی ۱ مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبح محشر کی
رگ لیلیٰ کو خاک دشت مجنوں ریشگی بخشے ۲ اگر بو دے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی

پر پروانہ شاید بادبان کشتی مے تھا ۳ ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دور ساغر کی
کروں بیداد ذوق پرفشانی عرض کیا قدرت ۴ کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی
کہاں تک روؤں اسکے خیمہ کے پیچھے قیامت ہے ۵ مری قسمت میں یا رب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

شعر (۱) نکوہش۔ ملامت۔ مبادا۔ ایسا نہو لیکن یہاں نفی تعجب کیلئے استعمال ہوا ہے مطلب ہے کہ معشوق کے ظلم کی شکایت کرنیوالا سزائے ملامت کا مستحق ہے اسلئے اگر صبح محشر خندۂ دنداں نما بنجائے یعنی ملامت کرے تو کوئی تعجب نہیں،

شعر (۲) ریشگی۔ ریشہ دار ہونا۔ لیکن اسجگہ مراد زخمی ہونا ہے مطلب ہے کہ اگر صحرائے مجنوں کی خاک میں کسان دانہ کی جگہ نوک نشتر بوئے تو یقین ہے کہ لیلی کی رگ میں اسکا اثر محسوس ہو یعنی جب مجنوں کے پاؤں میں نوک نشتر سے خون جاری ہوگا تو رگ دست لیلی سے بھی خون جاری ہوگا۔ اتحاد محبت کا مضمون ہے۔

شعر (۳) چونکہ دور ساغر کی روانی گرمی مجلس پر منحصر تھی اور گرمی محفل سوز پروانہ پر اسلئے پروانہ گویا کشتی مے کا بادبان ٹھہرا کہ اسکی وجہ سے دور ساغر و کشتی کے ظہور میں آیا۔ (حسرت)

شعر (۴) پرفشانی۔ پر مارنا۔ مطلب ہے کہ مجھے اپنے ذوق پرفشانی کے ظلم بیان کرنیکی قدرت ہی نہیں کیونکہ اڑنے سے پہلے ہی میری طاقت پرواز زائل ہو چکی ہے۔

شعر (۵) شعر صاف ہے یعنی پتھر کی دیوار ہوتی تو سر پھوڑ کر ہی اپنی دیوانگی کا قصہ ختم کر دیتا۔

(۴۹) بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے ۱ جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے ۲ اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے ۳ یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے
سختی کشان عشق کی پوچھے ہے کیا خبر ۴ وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں ۵ تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں ۶ ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اللہ رے تیری تندیٔ خو جس کے بیم سے ۷ اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے
اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق ۸ جو پاؤں اُٹھ گئے وہی اُن کے علم ہوئے
نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے ۹ جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

شعر (۱) سبک یعنی ذلیل و حقیر۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی بے اعتدالیوں یا حدِ اعتدال سے بڑھ جانے کی وجہ سے ہم لوگوں کی نظروں سے گر گئے ذلیل ہو گئے یا جتنا ہمارا اعزاز ہوا تھا اتنا ہی لوگوں نے ہمیں ذلیل کیا۔

شعر (۲) ایک سخت مضبوط جال ہمارے آشیانہ کے قریب ہی کسی نے بچھا رکھا تھا اور ابھی ہم اُڑنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ اسیر ہو گئے۔

شعر (۳) یعنی ہماری برائے نام ہستی ہم معنی فنا ہے یعنی صرف قسم کھانے کو ہستی ہے۔

شعر (۴) یعنی عشق و محبت کی سختیاں برداشت کرنے والے خود مجسمہ الم بن گئے ہیں۔

شعر (۵) تلافی۔ دلجوئی۔ مطلب یہ ہے کہ صرف تیرے مہربان ہونے سے ہماری دلجوئی نہیں ہو سکتی کیونکہ صرف تو ہی ہم پر ظلم و ستم کرنے والا نہ تھا بلکہ ہم پر تمام زمانہ ظلم و ستم کر رہا ہے۔

شعر (۶) قلم ہوئے یعنی کاٹے گئے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے عشق و محبت کی حکایات خونچکاں برابر لکھتے رہے یا خونِ دل پی کر اشعار لکھتے رہے اگرچہ لوگوں نے روکنے کیلئے ہمارے ہاتھ بھی کاٹ دیئے اس شعر میں لکھنے اور قلم ہونے کی رعایت خوب ہے۔ ہاتھوں کا قلم بننا بھی ہو سکتا ہے۔

شعر (۷) اللہ رے۔ کلمہ تعجب۔ اجزائے نالہ یعنی نالے (خون) گجو وللبکل رزقِ ہم ہو گئے رزقِ یکدیگر اس طرح سے کہ ایک نالہ پیدا ہوا لیکن وہ مارے خوف کے باہر نہ نکلا تھا کہ دوسرا پیدا ہو گیا۔ اور اسی طرح دوسرا باہر نہ آیا تھا کہ تیسرا پیدا ہو گیا (قاضی صاحب)

شعر (۸) اہل ہوس، خواہشات نفسانی کی بنا پر جھوٹے عاشق ہونیوالے۔ نبرد۔ لڑائی۔ مطلب یہ ہے کہ اہل ہوس کی فتح یہی ہے کہ وہ میدان عشق سے فرار ہو جائیں اور ان کے جو پاؤں اُٹھ گئے گویا ان کے وہی علم فتح بلند ہوئے ہیں۔ پاؤں اُٹھنا محاورہ ہے جو بھاگنے کے ہم معنی ہے۔

شعر (۹) یعنی عدم میں ہمیں قدرت کی طرف سے صرف چند نالے دیئے گئے تھے جو ہم وہاں پورے نہ کر سکے اور نہ کھینچ سکے اور وہاں رہنے کی مدت ختم ہو گئی پس وہ نالے یہاں بصورت نفس اسانس، تبدیل ہو گئے۔

شعر (۱۰) یعنی اے اسد ہم نے گدائی میں بھی دل لگی کی عادت نہ چھوڑی یعنی فقیری میں بھی اہل کرم ہی کے عاشق ہوئے۔

(۱۷۵) جو نہ نقد داغ دل کی کرے شعلہ پاسبانی ۱ تو فسردگی نہاں ہے بہ کمین بے زبانی
مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانہ جوانی ۲ کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی
یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا ۳ کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

شعر (۱) فانی صاحب فرماتے ہیں کہ شعلہ سے مراد شعلہ محبت، داغ دل کو چونکہ اشرفی سے مشابہت ہے اس لئے نقد داغ دل کہا گیا ہے، شعلہ کا پاسبانی نہ کرنا وہی اُسکی بے زبانی اور بے زبان ہونا اسکی فسردگی یعنی بجھ جانا۔ کمین۔ گھات

شعر (۲) کودکی۔ بچپن یعنی جو بچپن میں ہی مجھ سے کشیدہ اور متنفر رہا وہ نوجوان ہو کر مجھ پر کیسے کرم کر سکتا ہے

شعر (۳) مطلب صاف ہے یعنی مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ خدا میری جیسی زندگانی دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ نہایت لطیف خیال ہے۔

(۱۷۶) ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے ۱ اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال ۲ مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
مے نے کیا ہے حسن خود آرا کو بے حجاب ۳ اے شوق یاں اجازت تسلیم و ہوش ہے
گوہر کو عقد گردن خوباں میں دیکھنا ۴ کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے
دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست ۵ بزم خیال میکدۂ بے خروش ہے

قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل ۶ زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ۷ میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی ۸ مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط ۹ دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ ۱۰ یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں ۱۱ نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی ۱۲ اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

شعر (۱) مرزا صاحب نے مولوی عبدالرزاق صاحب شاکر کو خط لکھتے ہوئے اس شعر کے معنی خود بیان فرمائے ہیں، لکھتے ہیں، "پیشتر دوسرا مصرعہ "اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے" یہ خبر ہے پہلا مصرعہ "ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے" یہ مبتدا ہے۔ شبِ غم کا جوش یعنی اندھیرا ہی اندھیرا ظلمتِ غلیظ۔ سحر کا پیدا گویا خلق ہی نہیں ہوئی۔ ہاں (ایک) دلیلِ صبح کی بودی ہے یعنی بجھی ہوئی شمع۔ اس ارادے سے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھا دیا کرتے ہیں، لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جو شے کہ دلیلِ صبح ٹھہرایا وہ خود ایک سبب ہے منجملہ اسبابِ تاریکی کے۔ پس دیکھا چاہیے جس گھر میں علامتِ صبح مؤیدِ ظلمت ہوگی وہ گھر کتنا تاریک ہوگا؟

شعر (۲) آشتی: صلح۔ مطلب یہ ہے کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ کان وصالِ یار کی خوشخبری سے لذت آشنا ہوا کرتے اور آنکھوں کو رشک پیدا ہوتا تھا کہ ہم لذتِ سماعت سے محروم۔ اسی طرح جب آنکھیں لذتِ نظارۂ جمال سے محظوظ ہوا کرتی ہیں تو کان محروم رہ جاتے ہیں اور معاملہ رشک و رقابت تک پہنچتا ہے لیکن اب دونوں ہی لذت سے محروم ہیں اور کسی کو رشک پیدا نہیں ہوتا۔ گویا اب دونوں میں صلح ہو گئی ہے۔

شعر (۳) حسن خود آرا اپنی آپ آرائش کرنیوالا تسلیم - سپرد کرنا - ہوش - دانائی - جان وغیرہ مطلب یہ ہے کہ حسن خود آرا کی شرم نے بے حجاب یعنی بے پردہ کر دیا ہے - شوق اب چاہتا ہے کہ اپنے ہوش و حواس اس کے سپرد کر دے ۔

شعر (۴) عقد گردن ، ہار ، مطلب یہ ہے کہ موتی معشوق کے گلے کے ہار تک پہنچا ہے ذرا جوہری کے ستارہ قسمت کی بلندی ملاحظہ ہو۔

شعر (۵) خروش ، شور و غل ۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری بزم خیال ایک ایسا شراب خانہ ہے کہ جس میں شور و غل کا نام نہیں یہاں بیدار شراب جو صاحب ساقی ہے کہ ہر ایک ظرف کے مطابق اسکو شراب پلاتا ہے نگاہ ایک مست بادہ کوش ہے کہ برابر پیتی جا رہی ہے مصرعۂ اولیٰ میں کوئی اضافت نہیں ہے ۔

شعر ۶ تا ۱۲ (قطعہ) اپنے انقلاب حالت کا نقشہ اس ہشتل قطعہ میں کھینچتے ہیں جو غالباً بیتی واقعہ سے مثنا فر ہمکر ہے "اے تازہ" الخ جوانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ اگر تم کو ناؤ نوش کا شوق ہے تو اسکے نتیجہ سے خبردار ہو جاؤ ۔ (ناؤ نوش بمعنی نغمہ و شراب) "دیکھو مجھے" الخ اس کوچہ میں قدم رکھنے سے اگر تم عبرت بین آنکھ رکھتے ہو تو میری حالت کا مشاہدہ کر لو اور اگر گوشِ نصیحت نیوش (سننے والا) ہے تو میری بات سن لو "ساقی بجلوہ" الخ ان جلسوں میں یہ ہوتا ہے کہ ساقی اپنی جلوہ گری سے عقل و ایمان غارت کر دیتا ہے اور مطرب اپنے نغمہ سے تمکین و ہوش کھو دیتا ہے پھر اس محفل کی گرمی اور لطف تھوڑی ہی دیر تک رہتا ہے۔ "یا شب کو" الخ رات کو یہ دیکھتے تھے کہ پھولوں سے اس طرح محفل آراستہ ہے کہ گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرش کا ہر گوشہ دامان باغبان اور کف گل فروش ہے "لطف خرام" الخ ساقی کی جلوہ گری اور مطرب کی چنگ نوازی سے آنکھ اور کان کو جنت کا لطف آ رہا ہے "یا صبحدم" تا "خموش ہے" صبح کو بزم میں آکر دیکھئے تو نہ وہ ساقی کی جلوہ گری ہے نہ مطرب کی نغمہ سرائی ۔ نہ جوش و خروش ہے نہ لطف و نشاط ہے بس ایک سناٹا سا چھایا ہوا ہے سامان آرائش و زینت کچھ نہیں صرف ایک شمع باقی ہے وہ بھی دم بخود ہے ۔

شعر (۱۳) نوا - آواز - سروش ، فرشتہ ، سر پردہ آواز جو لکھتے وقت قلم سے ظاہر ہوتی ہے باقی مطلب صاف ہے

(۱۶۷) آہ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے ۱ طاقت بیداد انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے ۲ نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے
گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو ۳ ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے
ہم سے عبث ہے گمان رنجش خاطر ۴ خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے
دل سے اٹھا لطف جلوہ ہائے معانی ۵ غیر گل آئینہ بہار نہیں ہے
قتل کا مرے عہد تو کیا ہے بارے ۶ وائے اگر عہد استوار نہیں ہے

تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے غالب
تری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے ۷

شعر (۱) یعنی بہت جلد آ کہ میں تیرے دیدار و وصال کیلئے بے چین ہو رہا ہوں اور اب ستم انتظار برداشت کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔

شعر (۲) نشہ سے کنایہ آرام جنت اور خمار سے تکالیف دنیا مراد ہے مطلب یہ ہے کہ دنیاوی زندگی میں جتنے مصائب برداشت کرنے پڑتے ہیں اسکے بدلے میں کہتے ہیں کہ جنت ملیگی لیکن ہمارے خیال میں ان کے مقابلہ میں آرام جنت بہت کم ہے اور یہ تلافی باعث تسکین نہیں۔

شعر (۳) یعنی میں جو انکی محبت میں رو محبت سے بیتاب ہو کر رونے لگا تو انکی بزم سے نکالا گیا کیونکہ اس سے انکی رسوائی ہوتی تھی اور راز محبت فاش ہو جاتا تھا افسوس ہے کہ مجھے اپنے رونے پر قابو حاصل نہیں ہے۔ بقول شخصے ؎

رسوا کیا محفل میں اے دیدۂ تر تو نے
لٹوا دیا خود مجھ کو اے دزد نظر تو نے

شعر (۴) خاک میں، سرشت میں، طینت میں، غبار، رنجش۔ مطلب یہ ہے کہ تیرا یہ گمان کرنا کہ میرے دل میں تیری طرف سے رنجش ہے یہ خیال غلط ہے کیونکہ عاشقوں کی خاک طینت میں غبار یعنی رنجش نہیں ہوتی۔

شعر (۵) دیگر شارحین نے اس شعر کی شرح اس طرح فرمائی ہے کہ اگر معانی کا لطف حاصل کرنا چاہئیے

تو دل سے حاصل کر کیونکہ بہار کا مزہ بغیر آئینہ گل کے نہیں آ سکتا یعنی گل ایک آئینہ ہے جس میں بہار کی تصویر نظر آتی ہے اسی صورت سے دل آئینہ ہے جس میں شاہدان معانی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے ۔"

ہماری رائے میں اس میں لفظ "اٹھا" بمعنی امر استعمال نہیں ہے بلکہ اسکے معنی یہ ہیں کہ دل سے جلوۂ معانی کا لطف اٹھ گیا۔ جاتا رہا کیونکہ جب لوگوں نے میرے کلام کو نہ سمجھا بلکہ اعتراض کئے تو میرے دل کا پھول یا غنچہ مرجھا گیا اور جب گل مرجھا گیا تو لطف بہار کیا حاصل ہو؟

شعر (۲) مطلب یہ ہے کہ اس نے میرے قتل کا عہد کیا ہے اور یہ میرے لئے خوشی کا مقام ہے اور اگر اس نے اسے اپنے دوسرے عہد و پیمان کی طرح مضبوط نہ رکھا تو پھر اس پر افسوس ہے۔

شعر (۷) یعنی غالب تو نے آئندہ کیلئے شراب پینے کی قسم کھائی ہے لیکن تیری قسم کا ہمیں اعتبار ہی نہیں تو اس سے پہلے سیکڑوں دفعہ ایسی قسمیں کھا چکا ہے اور انہیں توڑ بھی چکا ہے۔

(۱،۲،۳) ہجوم غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے ۱ کہ تار دامن و تار نظر میں فرق مشکل ہے
رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی ۲ سمجھیو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے
وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب ۳ چٹکنا غنچۂ دل کا صدائے خندۂ دل ہے

شعر (۱) یعنی کثرت غم کے بوجھ سے میرا سر اتنا جھک گیا ہے کہ سر دامن تک پہنچ گیا ہے اب تار دامن اور تار نظر میں کوئی فرق نظر نہیں آتا دونوں ایک ہو گئے ہیں۔

شعر (۲) یعنی زخم دل کے رفو کرنے سے میری یہ خواہش نہیں ہے کہ میرا زخم اچھا ہو جائے اور مجھے تسکین واطمینان حاصل ہو بلکہ اس سے میری یہ مراد ہے کہ نوک سوزن کے زخموں سے اور زیادہ لذت اندوزی حاصل ہو کہیں یہ خیال نہ کرنا کہ میرے جیسا دیوانہ لذت درد سے بے پروا ہو گیا ہے بقول شخصے ؎

اس کی لذت کو مجھ سے پوچھے کوئی درد دل کی دوا نہیں نہ سہی!

مرزا صاحب ایک اور شعر میں بھی اپنے اسی شعر کا مضمون لکھ چکے ہیں ؎

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن   غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

شعر (۱۳) وہ گل یعنی وہ گل اندام معشوق اگر کسی باغ میں جائے اور وہاں اگر کوئی غنچۂ گل چٹکے تو اس چٹکنے کی آواز کو خندۂ دل کی آواز سمجھنا چاہئے جس سے گلستاں کی مسرت و خوشی کا پتہ چلتا ہے۔ گل نام اس گلاب کے پھول کو کہتے ہیں اور اس کا غنچہ دل سے مشابہ ہوتا ہے اسلئے اسکے چٹکنے کو شعرا خندہ و گریہ دونوں سے استعارہ کیا کرتے ہیں۔

(۱۴۹) پا بہ دامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد ۱ خار پا ہیں جوہر آئینۂ زانو مجھے
دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت ۲ ہے نگاہ آشنا تیرا سر ہر مو مجھے
ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت کچھ نہ پوچھ ۳ ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

شعر (۱) اس شعر کی شرح میں جناب طباطبائی صاحب فرماتے ہیں کہ پاؤں جو زانو سے متصل ہیں تو گویا زانو ہی ہیں یعنی کانٹے پاؤں میں چبھے تھے وہی آئینۂ زانو کا جوہر بنے ہیں اس شعر میں تشبیہ کے سوا معانی میں کچھ لطف نہیں۔

شعر (۲) یعنی ہم آغوش ہونے کے وقت میرے دل کی حالت دیکھنے کے قابل ہوگی کیونکہ تیرا بال بال میرے دل سے آگاہ ہے یعنی میرا دل تیرے گیسوؤں کی محبت میں مبتلا رہ چکا ہے۔

شعر (۳) آہنگ۔ راگ مطلب یہ ہے کہ میں ایک ساز ہوں کہ جس میں شکایتوں کا راگ بھرا ہوا ہے پس تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ تو مجھے لوگوں میں نہ چھیڑے ورنہ تو نے بھرا باجا ساز کو چھیڑا نہیں کہ اس میں سے شکایتوں کے راگ شروع ہو جائیں گے۔ مرزا صاحب ایک اور جگہ یہی مضمون لکھ چکے ہیں ؎

پر ہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا   اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے؟

(۱۵۰) جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے ۱ جاں کالبد صورت دیوار میں آوے
سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر ۲ تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے
تب ناز گراں مایگی اشک بجا ہے ۳ جب لخت جگر دیدۂ خونبار میں آوے
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر ۴ کچھ تجھ کو مزہ بھی مرے آزار میں آوے

اس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ ۵ طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے
کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب ۶ اک آبلہ پا وادیِ پُرخار میں آوے
مر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک ۷ آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آوے
غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر ۸ کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے
تب چاکِ گریباں کا مزہ ہے دلِ نالاں ۹ جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے
آتشکدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے ۱۰ اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے!
۱۱- جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

شعر (۱) کالبد۔ بدن۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تو کسی محفل میں گفتگو نہ کرے تو چونکہ تیری گفتگو لبِ جاں بخش کے ذریعہ سے ہوگی اسلئے ممکن ہے کہ تیری معجز نما تقریر سے اس محفل کے در و دیوار میں زندگی کے آثار پیدا ہو جائیں

شعر (۲) مطلب یہ ہے کہ اگر تو باغ میں آئے تو تیرے قدِ دلکش کی کشش سے سرو و صنوبر بھی تیرے سایۂ قد کی طرح تیرے ساتھ ساتھ پھریں یعنی سرو و صنوبر کو بھی تیرے قدِ دلکش کے ساتھ عشق ہو جائے۔

شعر (۳) بیشک آنسو اس حالت میں اپنے گرانمایہ ہونے پر فخر کر سکتے ہیں جب چشمِ خونفشاں میں لختِ جگر بھی اُن کے ہمراہ گریں

شعر (۴) یعنی اگر میں اپنی تکلیف اور دردِ محبت کی شکایت کرونگا تو تجھے اس میں ایک قسم کی لذت حاصل ہوگی اے ظالم مجھے شکایت کی اجازت دے تاکہ میرے آزار دینے سے تجھے لطف حاصل ہو۔

شعر (۵) فسونگر۔ جادوگر۔ معشوق کی آنکھ کو چشمِ سخن گو بھی کہتے ہیں یعنی وہ آنکھ جو اشاروں سے باتیں کرے۔ مطلب یہ ہے کہ اسکی چشمِ سخن گو کے اشارہ کا عکس جب آئینہ میں پڑے گا تو آئینہ بھی طوطی کی طرح باتیں کرنے لگ جائے گا۔ لفظ آئینہ اور طوطی میں بھی ایک مناسبت ہے کہ آئینہ کی مدد سے طوطی کو بولنا سکھایا کرتے ہیں۔

شعر (۶) یعنی پیاس کی شدت سے جنگل کے کانٹوں کی زبانیں خشک ہو گئی ہیں اے خدا اس کانٹوں بھرے جنگل میں اس دیوانہ کو بھیجدے کہ جسکے پاؤں میں چھالے ہوں مطلب یہ ہے کہ جب کوئی آبلہ پا کانٹوں پر چلے گا تو کانٹے اسکے پاؤں میں چبھ کر آبلے پھوٹ جائیں گے اور ان میں سے پانی نکلے گا تو کانٹوں کی زبانیں تر ہو جائینگی۔

شعر (۷) کسی ہندو عاشق کا ہمزباں ہو کر مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اس نازنین کے تن نازک سے زنار لپٹا ہوا ہے افسوس کہ میں زنار کے تاگہ سے بھی گیا گزرا ٹھہرا کاش میں زنار ہی ہوتا تاکہ لذت ہم آغوشی حاصل ہوتی۔

شعر (۸) مولانا نظم صاحب فرماتے ہیں کہ گلاب میں جو زیرہ ہوتا ہے اسے زرگل کہتے ہیں شعر کا مطلب یوں سمجھو کہ گلاب کا کھلنا اور زرگل کا کھلنا کیا ہے گویا زر کی ہوس میں ہاتھ پھیلانا ہے جس کا انجام یہ ہوا کہ سر بازار آ پڑا تو بربادی ناموس کا کیوں سامنا ہوتا غنچہ کیطرح بندھی مٹھی جانا گیا ہوتا جب ہاتھ پھیلا کر زر لیا تو شاہد بازاری ہو گیا اور ناموس عزت برباد ہو گئی

شعر (۹) یعنی اے دل نالاں گریباں چاک کرنے کا مزہ تو جب آئیگا اگر تار نفس بھی ہر تار گریباں کے ساتھ الجھا ہوا آئے یعنی تار نفس کا بھی تار گریباں کے ساتھ کام تمام ہو جائے۔

شعر (۱۰) مطلب یہ ہے کہ جس راز پوشیدہ کی وجہ سے میرا سینہ آتشکدہ بنا ہوا ہے اگر وہ راز ظاہر ہو گیا تو بہت بری بات ہوئی یعنی ایک زمانے میں آگ لگ جائے گی۔

شعر (۱۱) گنجینہ۔ خزانہ۔ طلسم۔ جادو۔ مطلب یہ ہے کہ اے غالب میرے اشعار میں جسقدر الفاظ موزوں ہوتے ہیں وہ خزانہ معانی کا طلسم ہیں یعنی میں ایسا سحر البیان ہوں کہ میرے شعر کا ہر ایک لفظ کثیر المعنی ہوتا ہے جس سے عجیب و غریب معانی پیدا ہوتے ہیں۔

(۱۷) حسن مہ گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے ۱ اس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ ۲ جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا ۳ ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے
بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے ۴ وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

اُنکے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق ۵ وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
دیکھئے پاتے ہیں عُشاق بتوں سے کیا فیض ۶ اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کہا ۷ جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے
قطرہ دریا میں جو مِلجائے تو دریا ہو جائے ۸ کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے
خضر سلطاں کو رکھے خالق اکبر سرسبز ۹ شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

شعر (۱) مطلب یہ ہے کہ اگرچہ چودھویں رات کا چاند بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن میرا معشوق خورشید جمال ہے اس لئے وہ اس سے زیادہ بہتر ہے دراصل چاند بھی آفتاب ہی کی روشنی سے منوّر ہوتا ہے۔

شعر (۲) مطلب یہ ہے کہ وہ ہمارا دل لینا چاہتے ہیں اور ہم اسکے معاوضہ میں بوسہ طلب کرتے ہیں لیکن بوسہ دینے سے انہیں انکار ہے گویا ان کا مطلب یہ ہے کہ وہ مفت میں ہمارا دل لینا چاہتے ہیں اور اسکی کوئی قیمت ادا نہیں کرنا چاہتے

شعر (۳) جام سفال مٹی کا پیالہ۔ یعنی ایسی چیز کی کیوں جستجو کی جائے جس کی جستجو کی تکلیف اسکے ملنے سے زیادہ ہو یعنی ساغر جم اگر دستیاب ہو کر ٹوٹ گیا تو پھر کیا کرینگے اور اگر مٹی کا پیالہ ٹوٹ جائیگا تو بازار سے اور لے آئینگے۔

شعر (۴) شعر کا مطلب صاف ہے۔ سوال کرنے کی مذمت کی گئی ہے۔

شعر (۵) مطلب یہ ہے کہ جب وہ ازراہ ترحم میری بیمار پرسی کو آتے ہیں تو ان کو دیکھ کر میں فرط مسرت سے خوشحال ہو جاتا ہوں اور چہرے پر ایک قسم کی تازگی سی آجاتی ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ اس نے یونہی بیماری کا بہانہ کیا تھا یا یہ سمجھتے ہیں کہ اب تو اس کا مرض جاتا رہا ہے اور اس کا حال اچھا ہے۔

شعر (۶) گویا معشوق کی تمنا میں ایسا مستغرق ہے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں یہاں تک کہ برہمن نے جو سال کو اچھا بتایا ہے تو اسکے اچھا ہونے کے یہی معنی سمجھا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان ہو جائیں

نہ کہ اس سال قحط نہیں پڑیگا یا وبا نہیں آئیگی یا لڑائیاں نہیں ہونگی وغیرہ وغیرہ (یادگار غالب)

شعر (۷) مطلب یہ ہے کہ تیشہ زنی کے کمال نے فرہاد کو شیریں سے ہم سخن ہونے کا موقع دیا الغرض انسان میں کوئی نہ کوئی کمال ضرور ہونا چاہیئے۔

شعر (۸) صوفیوں میں جو توحید وجودی کے قائل ہیں ان کے نزدیک ہر چیز اپنی ہستی سے نالاں ہے اور طبعاً اپنے مبداء سے اتحاد و اتصال کے لئے کوشش کر رہی ہے اور اس کا مقصود یہی ہے کہ دریا میں فنا ہو جائے۔ یہی اس کا حق انجام ہے۔

شعر (۹) سلطان خضر۔ فرزند بہادر شاہ ظفر کو گلستان شاہی کے تازہ نہال سے تشبیہ دے کر ان کی سرسبزی کی دعا کی ہے۔ اس شعر میں خضر۔ سرسبز۔ باغ۔ نہال وغیرہ الفاظ کی رعایت ہے۔

شعر (۱۰) یعنی اے غالب ہمیں جنت کی حقیقت خوب معلوم ہے درحقیقت جنت کوئی چیز نہیں تو واعظ لوگ یونہی سبز باغ دکھاتے ہیں ہاں البتہ دل کے خوش رکھنے کیلئے اچھا خیال ہے فارسی میں مرزا صاحب اسے یوں لکھتے ہیں؎

فردوس جوئے عمر بوسواس دادہ آہ   سرمایہ نیز در سر او سود مے رود

(۱۶۲) نہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی ۱ امتحاں اور بھی باقی ہوں تو یہ بھی نہ سہی
خار خار الم حسرت دیدار تو ہے ۲ شوق گلچین گلستان تسلی نہ سہی
مے پرستاں خم مے منہ سے لگاتے ہی بنی ۳ ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی
نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا ۴ گر نہیں شمع سیہ خانہ لیلیٰ نہ سہی
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق ۵ نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی
نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا ۶ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

عشرت صحبت خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہوئی غالب اگر عمر طبیعی نہ سہی

شعر(۱) یعنی اگر تجھے یہ منظور نہیں کہ میں تجھ پر جان قربان کردوں اور اگر میں مر بھی جاؤں تو تیری تسلی نہ ہوگی، تو اچھا میں نہیں مرتا اگر ابھی میرا کوئی اور امتحان لینا باقی ہے تو میں حاضر ہوں۔

شعر(۲) یعنی اگر میرے شوق کو گلستانِ تسلی کی گلچینی حاصل نہیں تو کیا یہ تھوڑی بات ہے کہ خار زار الم حسرتِ دیدار میں رو رو کر کانٹے نکال رہے ہیں۔

شعر(۳) مطلب ہے کہ اے شراب پینے والو اگر آج بزم میں ساقی ہوتا تو یہی کہتا کہ جام سے شراب پلاتا لیکن اگر آج وہ نہیں ہے تو خود ہی خمِ مے کو منہ لگا دو نہ اس میں تو تمہارا فائدہ ہی ہے کہ خوب جی بھر کر جتنی چاہو گے پیوگے

شعر(۴) نفسِ قیس یعنی مجنوں کی آہ شعلہ فشاں۔ مطلب ہے کہ اگر نفسِ قیس جو چشم و چراغ صحرا ہے سیاہ خانہ لیلےٰ کی شمع نہیں ہے تو نہ سہی مسکنِ قیس تو اس سے روشن ہے۔

شعر(۵) ہنگامہ۔ مجمع و محفل۔ مطلب ہے کہ اگر گھر میں نغمۂ شادی ہوگا تو لوگوں کے اجتماع سے ایک رونق ہوگی اور اگر نوحۂ غم ہوگا تو جب بھی ایک مجمع ہوگا۔

شعر(۶) ستائش۔ تعریف۔ صلہ۔ انعام۔ مرزا غالب کے کلام پر انکے معاصرین نے سخت نکتہ چینیاں کی ہیں عموماً لوگ کہا کرتے تھے کہ ان کا کلام مہمل اور بے معنی ہوتا ہے یہ شعر انہیں لوگوں کے جواب میں بطور ناراضگی لکھا ہے مطلب ہے جو شخص میرے اشعار کو مہمل اور بے معنی کہتا ہے وہ میرے اشعار کی تعریف نہ کرے اور جو انعام اُسے دینا ہے اپنے پاس ہی رکھے

شعر(۷) طبیعی یعنی اصلی و واجبی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ معشوق کی صحبت اگر دلکش ہے لیکن انسان کی صحت اور اُن کی زندگی پر بُرا اثر ڈالتی ہے اور اس قسم کے لوگ عمرِ طبیعی تک پہنچنے سے پہلے مر جاتے ہیں لیکن غالب کے نزدیک عمرِ طبیعی کی اتنی زیادہ قدر نہیں ہے کہ اسکے خیال میں حسینوں کی صحبت سے آدمی باز رہے۔

لیکن بقول غالب ہماری رائے میں عمرِ طبیعی یا اصلی زندگی ہی یہی ہے کہ جو حسینوں کی صحبت میں گزرے۔

(اشعار) عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے ۱ کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے
قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت ۲ فقط "خراب" لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی ۳ وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے
خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا ۴ کہ اسکے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے
یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے ۵ تمہارے آئیو اے طرہ ہائے خم بخم آگے
دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے ۶ ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اسکو دم آگے

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب
۷۔ ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

شعر (۱) یہ ایک بدیہی بات ہے کہ دھوپ یا چاندنی میں انسان کے سر کا سایہ پاؤں سے آگے ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ ہم نہایت ذوق و شوق اور خوشی کے ساتھ جھومتے ہوئے جلاد کے ساتھ مقتل میں جاتے ہیں کہ فرطِ اشتیاقِ شہادت میں ہمارا سر پاؤں سے بھی دو قدم آگے جاتا ہے۔

شعر (۲) کاتبِ تقدیر نے چاہا تھا کہ مجھے خراب بادۂ الفت لکھے لیکن فقط لفظ خراب ہی لکھا تھا کہ آگے قلم نہ چل سکا اسلئے اب مجھے کوئی خراب بادۂ الفت نہیں سمجھتا فقط خراب ہی کہتے ہیں اور یہ میرے لئے سراسر خرابی ہے،

شعر (۳) مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ غمِ روزگار نے ذوق شوق اور عشق و محبت کا تمام نشہ اتار دیا یعنی زمانہ کے مصائب نے عشق و محبت کے غم بھی بھلا دیئے ہیں۔

شعر (۴) مطلب صاف ہے۔

شعر (۵) یعنی گیسوؤں کو مخاطب کرکے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ یہ جو تمام عمر ہم نے تمہارے عشق میں پریشانیاں اٹھائی ہیں خدا کرے کہ اے گیسو وہ تمہارے آگے آئے گویا یہ ایک قسم کی گیسوؤں کو بددعا ہے لیکن ہماری رائے میں تو گیسوؤں کا پریشان ہونا بھی ایک قسم کی رعنائی و دلفریبی میں داخل ہے اور یہ عاشق کیلئے اور بھی قیامت کا سامنا ہے

شعر (۶) زعم بمعنی گمان۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ "جگر" سے مراد یہاں پھیپھڑا ہے مطلب یہ ہے کہ جسکو ہم اپنا سانس سمجھتے ہیں یہ دراصل موجِ خون کی پرافشانی ہے" پرافشانی کے معنی ترکِ علائق یا ترکِ دنیا کے ہیں،

شعر (۷) آگے یعنی پہلے مطلب یہ ہے کہ پہلے تو وہ از راہ محبت و عزت ہمیشہ میری جان کی قسم کھایا کرتے تھے لیکن خدا کی شان ہے کہ اب یہی قسم دوسری شکل میں تبدیل ہو گئی ہے یعنی اب اس نے قسم کھائی ہے کہ اب اگر جاؤں گا تو غالب کے جنازے پر ہی جاؤں گا۔

(۱۷۴) شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے ۱ یہ بھی مت کہہ کہ جو کہئے تو گلا ہوتا ہے
پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا ۲ اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیئے کیا ہوتا ہے
گو سمجھتا نہیں پر حُسنِ تلافی دیکھو ۳ شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے
عشق کی راہ میں ہے چرخِ کوکب کی وہ چال ۴ سست رَہ جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم ۵ آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے
خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ ۶ کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے
نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب ۷ ق لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے
خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن ۸ شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے
اے شہنشاہ کواکب سپہ و مہر علم ۹ تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے
سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے ۱۰ تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے
ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال ۱۱ آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے
میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزلخوانی میں ۱۲ یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

شعر (۱) شکوہ کا لفظ بھی اگر زبان پر آجائے تو وہ خفا ہو جاتا ہے بلکہ یہ بھی کہئے کہ وہ خفا ہوتا ہے

شعر (۲) شعر کا مطلب صاف ہے۔

شعر (۳) مطلب یہ ہے کہ گو وہ میرے شکووں پر غور نہیں کرتا لیکن حسن تلافی بھی تو ملاحظہ ہو کہ شکوۂ ظلم و ستم سن کر اور بھی سرگرم جفا ہوتا ہے۔

شعر (۴) چرخ مکوکب۔ ستاروں بھرا آسمان۔ مطلب یہ ہے کہ راہِ عشق میں آسمان کی ایسی سست رفتار ہے کہ جیسے اسکے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہوں۔ ستاروں کو آبلوں سے تشبیہ دی ہے۔ سست روی سے یہ مراد ہے کہ جدائی کی راتیں اور دن کاٹنے مشکل ہو گئے ہیں۔

شعر (۵) ہدف۔ نشانہ۔ ناوک۔ تیر۔ خطا ہونا۔ تیر نشانہ پر نہ لگنا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم کیوں نہ تیر ستم کا نشانہ بنیں کہ اگر ہمارے معشوق کا تیر خطا ہو جاتا ہے تو ہم خود جا کر اٹھا لاتے اور معشوق کے ہاتھ میں دیتے ہیں کہ دوبارہ ہمیں نشانہ بنا دے۔

شعر (۶) یہی اچھا تھا جو اس سے پہلے ہم اپنے بدخواہ تھے۔ اور اب بھلائی کی دعا کرتے ہیں۔ تو برائی پیش آتی ہے۔ حضرت مومن فرماتے ہیں ؎

مانگا کرینگے اب سے دعا ہجر یار کی   آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ
یا ؎ اللہ بھی اب اس بت کافر کی طرف ہے   کچھ الٹا ہی ہوتا ہے دعاؤں کا اثر بھی

شعر (۷) پہلے تو میرے نالہ میں اتنا زور تھا کہ وہ عرش تک پہنچ جاتا تھا لیکن اب حالت ہے کہ زیادہ سے زیادہ زور مارا تو لب تک پہنچ گیا۔

شعر قطعہ ۸ تا ۱۲۔ باربد ایک مشہور موسیقی دان کا نام ہے جو خسرو پرویز کے مقربین میں سے تھا۔ نعل بہا کے معنی لغت میں اس طرح لکھے ہیں کہ وہ مال جو نذریہ یعنی صدقہ اپنی ولایت کا دشمن قوی کی فوج کو دیں تاکہ لوٹ مار نہ کرے۔ لیکن مرزا صاحب نے اس جگہ یہ معنی مراد نہیں لئے بلکہ لشکر کے نعل کی قیمت مراد لی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خامہ میرا یعنی میرا قلم جو بادشاہ کی بزم کا باربد ہے بادشاہ کی تعریف میں اس طرح گیت گاتا ہے کہ اے شہنشاہ ستارے تیری فوج اور آفتاب تیرا جھنڈا ہے تیری بخشش یا بزرگی کو کون بیان کر سکتا ہے۔ سات اقلیم الخ۔ اگر ساتوں

ولائتوں کا محاصل جمع کیا جائے تو وہ تیرے لشکر کا صرف نعل بہا ہوتا ہے یعنی لشکر کے گھوڑوں کی نعلبندی میں خرچ ہو جاتا ہے ہر مہینہ الخ چودھویں رات کا چاند جو گھٹ کر ہلال ہو جاتا ہے تو یہ اسلئے کہ تیرے آستانہ پر جبہ سائی کرتے کرتے ایسا ہو گیا ہے میں جو الخ اصول غزلخوانی میں کہیں کہیں حد سے بڑھ جاتا ہوں تو یہ بھی محض تیرا ہی کرم باعث فزونی ذوق ہے

شعر (۱۳) اے غالب میری یہ کڑوی کسیلی باتیں سن کر معاف کرنا کیونکہ آج مجھے بیحد صدمہ پہنچا ہے، جس نے مجھے حق بات کہنے پر مجبور کر دیا ہے۔

(۱۷۵) ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے" ۱ تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے
نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا ۲ کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تندخو کیا ہے
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے ۳ وگرنہ خوف بد آموزیٔ عدو کیا ہے
چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن ۴ ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا ۵ کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل ۶ جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
وہ چیز جسکے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز ۷ سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے
پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار ۸ یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے
رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی ۹ تو کس امید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے
ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
۱۰ وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

شعر (۱) شعر صاف ہے۔ تو کیا ہے یعنی تیری حقیقت کیا ہے۔

شعر (۲) یعنی میرا معشوق شوخی و تندخوئی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

شعر (۳) یعنی مجھے اس بات کا تو کوئی خوف نہیں کہ میرا دشمن تمہیں میرے خلاف کوئی بری باتیں سکھائیگا

مجھے تو صرف اسبات کا رشک ہے کہ وہ تجھ سے ہمکلام کیوں ہوتا ہے؟

شعر (۴)۔ شعر صاف ہے شرح کی ضرورت نہیں۔

شعر (۵) یعنی دل تو جسم کے ساتھ ہی جل گیا ہوگا پھر راکھ کرید کر کیا تلاش کر رہے ہو؟

شعر (۶) یعنی وہ خون ہی نہیں جو آنکھ سے اشک خونیں بن کر نہ ٹپکے۔

شعر (۷) یعنی ہمارے دل میں بہشت کی صرف اسلئے کچھ عزت ہے کہ وہاں شراب پینے کو ملیگی۔

شعر (۸) یعنی چھوٹے چھوٹے پیالے پیالیوں سے ہماری سیری نہیں ہوتی ہم تو کم از کم دو چار مٹکے شراب کے پئیں تو کچھ سرور آئے۔

شعر (۹) اول تو بات کرنے کی جرأت ہی نہیں اور اگر ہو تو کس امید پر یہ کہیں کہ ہماری یہ آرزو ہے؟ کیا اس نے کبھی ہماری کوئی آرزو پوری کی ہے؟

شعر (۱۰) غالب اسبات پر کیوں نہ فخر و ناز کرے کہ بادشاہ کے مصاحبوں میں داخل ہوگیا ورنہ شہر میں غالب کی کون عزت کرتا ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ دراصل اس شعر میں ذوق پر چوٹ کی گئی ہے اور شعر میں بجائے لفظ ذوق لکھنے کے غالب لکھ دیا ہے۔ مراد اس سے ذوق ہی ہیں۔

(۱۷۶) میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں ۱ چل نکلتے جو مے پیئے ہوتے
قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو ۲ کاشکہ تم مرے لئے ہوتے
میری قسمت میں گر غم اتنا تھا ۳ دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے
آہی جاتا وہ راہ پر غالب ۴ کوئی دن اور بھی جیئے ہوتے

شعر (۱) شعر صاف ہے۔

شعر (۲) خواہ تم کتنے ہی ظالم و سفاک ہو لیکن ہمیں سب کچھ منظور تھا کاشکہ تم ہمارے نصیبوں میں ہوتے یعنی تمہارا وصل ہمیں نصیب ہوتا۔ دواوین میں لفظ کاشکے لکھا ہے ہمارے خیال میں کاشکہ ہوگا۔

شعر (۳) شعر صاف ہے۔

شعر (۴) راہ پر آجانا۔ راہ راست پر آجانا۔ ہمارا کہا مان لینا۔

(۱۷۷) غیر لیں محفل میں بوسے جام کے ۱ ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ ۲ ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ۳ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم ۴ دھوئے دھبے جامۂ احرام کے
دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا۔ مگر ۵ یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے
شاہ کے ہے غسل صحت کی خبر ۶ دیکھئے کب دن پھریں حمام کے

عشق نے غالب نکما کر دیا!
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

شعر (۱) مطلب یہ ہے کہ رقیب تو محفل معشوق میں معشوق کے ہاتھوں سے دیئے ہوئے جام ہونٹوں سے لگائیں اور ہم صرف اتنی بات کیلئے بھی پیاسے ہیں کہ وہ ہمیں کب پیغام بھیجتا ہے کہ آؤ آکر مل جاؤ یا بزم عیش میں شریک ہونے کی دعوت دیتا ہے۔

شعر (۲) یعنی اپنے خستہ و خوار ہونے کی تم سے کوئی شکایت نہیں یہ سب فلک ناہنجار کے ظلم و ستم ہیں۔

شعر (۳) یعنی خط لکھنے میں اگر ہمارا کوئی خاص مقصد نہ بھی ہو لیکن ہمیں تو تیرے نام کے ساتھ عشق ہے اسلئے سرنامہ یا لفافہ پر تیرا نام تو لکھیں گے اور یہ بھی ہماری تسکین کا باعث ہوگا۔

شعر (۴) زمزم۔ مکہ معظمہ میں ایک کنواں ہے جو کہ مسلمانوں میں نہایت متبرک سمجھا جاتا ہے حاجی لوگ اس کا پانی بطور تبرک بھی اپنے ہمراہ لاتے ہیں لیکن مرزا غالب فرماتے ہیں کہ ہم نے رات کو زمزم کے کنوئیں پر بیٹھ کر شراب پی اور صبح کیوقت اسی زمزم کے پانی سے جامۂ احرام کے وہ دھبے دھوئے جو شرابکے گرنے سے پڑ گئے تھے۔ جامۂ احرا

وہ لباس ہوتا ہے جو حاجی لوگ حج سے پہلے پہنتے ہیں اور حج کے بعد اتارتے ہیں۔

شعر (۵) میرے دل کو میری آنکھوں نے تمہارے دام عشق میں پھنسایا گویا میری آنکھیں تمہارے دامِ حسن کے حلقے بن گئیں۔

بقول شخصے۔ آنکھوں نے تم کو دیکھا تھا دل قید کیوں کیا   آنکھوں کا ہے قصور یہ دل کی خطا نہیں

شعر (۶) بادشاہ کے غسل صحت کی خبر گرم ہے دیکھئے اہلِ حمام انعام و اکرام سے کب مالا مال ہوتے ہیں۔

شعر (۷) اے غالب صدمات عشق برداشت کرنے سے ہم ناکارہ ہو گئے ورنہ کبھی ہم بھی کام کے آدمی تھے یعنی دنیا کے ہر ایک کام کرتے تھے۔

(۱۷۸) پھر اس انداز سے بہار آئی ۱ کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
ق دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک ۲ اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر ۳ روکش سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی ۴ بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کیلئے ۵ چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر ۶ بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی
کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہ دیندار نے شفا پائی

شعر (۱) یعنی اب کے پھر بہار ایسے ٹھاٹھ سے آئی ہے کہ آفتاب و ماہتاب بھی اسکے تماشائی بن گئے ہیں۔

قطعہ ۲ تا ۶۔ روکش۔ مقابل۔ منہ پھیر دینے والی مطلب یہ کہ دیکھو اے زمین کے باشندو آرائش دنیا اسے کہتے ہیں کہ زمین (سبزہ بہار کی وجہ سے) ایک جانب سے لیکر دوسری جانب تک چرخ مینائی کو مات کر رہی ہے مینائی یعنی جس پر سبزی و سرخی سے نقش و نگار بنائے گئے ہوں۔ سبزہ کو الخ یعنی سبزہ کی اس کثرت سے ہمہ گیر روئیدگی ہوئی ہے کہ کوئی جگہ بھی اس سے خالی نہیں یہاں تک کہ تختہ آب پر بھی کائی کی شکل میں سبزہ نمودار ہے۔ سبزہ و گل الخ

اس بہار سبزہ و گل کے دیکھنے کیلئے چشم نرگس کو بینا کر دیا ہے۔ ہوائے الخ جب بہار نے شراب کی تاثیر ہوا میں پیدا کر دی ہے تو ہوا خوری سے ہی کیفیت بادہ نوشی پیدا ہو سکتی ہے۔

شعر (۷) شعر صاف ہے۔

(۱۷۹) تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز خالی ہے ۱ اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے ۲ بھرے ہیں جسقدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

شعر (۱) میں تغافل کو پسند کرتا ہوں اور میرا دماغ عجز اس قدر بلند ہے کہ آپ اگر مجھ سے پہلو تہی کریں تو میں اس پہلو تہی کو یہ سمجھوں گا کہ آپ نے میرے لئے جگہ خالی کی ہے۔

شعر (۲) یعنی دنیا اس وجہ سے آباد ہے کہ اہل ہمت اس میں نہیں گویا یہ دنیا ایک میخانہ ہے جس میں جام و سبو تو بھرے پڑے ہیں لیکن پینے والے اور پلانے والے ہی نہیں ورنہ سب چٹ کر جاتے۔

(۱۸۰) کب وہ سنتا ہے کہانی میری ۱ اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلش غمزۂ خونریز نہ پوچھ ۲ دیکھ خوننابہ فشانی میری
کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار ۳ مگر آشفتہ بیانی میری
ہوں ز خود رفتۂ بیدائے خیال ۴ بھول جانا ہے نشانی میری
متقابل ہے مقابل میرا ۵ رک گیا دیکھ روانی میری
قدر سنگ سر رہ رکھتا ہوں ۶ سخت ارزاں ہے گرانی میری
گرد باد رہ بیتابی ہوں ۷ صرصر شوق ہے بانی میری
دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا ۸ کھل گئی ہیچمدانی میری
کر دیا ضعف نے عاجز غالب
۹ -
ننگ پیری ہے جوانی میری

شعر (۱) شعر صاف ہے۔

شعر (۲) خونابہ۔ خالص خون۔ مطلب ہے کہ اسکے غمزۂ خونریز کی خلش کا اندازہ کیا لگانا چاہتے ہوں تو آپ میرے اشک خونیں کی روانی سے لگالو۔

شعر (۳) مطلب ہے کہ میرے خویش و اقربا یا دوست احباب میری کونسی خوبی یاد کر کے مجھے روئینگے سوائے اسکے کہ میری پریشان خیالی یا میری شاعری کو یاد کر کے روئیں۔

شعر (۴) بیدا۔ جنگل۔ میدان۔ خیال احباب ایک جنگل ہے جس سے میں نکل گیا ہوں اور اب میری نشانی صرف یہ ہے کہ وہ مجھے بھول گئے ہیں۔

شعر (۵) مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہوئے مرزا غالب نے خود اس شعر کے معنی بیان فرمائے ہیں لکھتے ہیں تقابل و تضاد کون نہ جانیگا۔ نور و ظلمت۔ شادی و غم۔ راحت و رنج۔ وجود و عدم۔ لفظ مقابل اس مصرع میں بمعنی مرجع ہے جیسے کہ حریف بمعنی دوست بھی مستعمل ہے۔ مفہوم شعر یہ ہے کہ ہم اور دوست از روئے خود عادت ضد ہمدیگر ہیں۔ وہ میری طبع کی روانی کو دیکھ کر رک گیا۔

شعر (۶) گرانی کے معنی بھاری پن اور گراں قیمت ہونے کے بھی ہیں۔ کہتا ہے کہ میری قدر اس پتھر کی سی ہے جو راہ کے سرے پر پڑا ہے اور ہر شخص آتے جاتے اس پر پاؤں رکھ کر گذرے یعنی ہوں تو گرانقدر مگر اس پتھر کی طرح بے قدر پس میری گرانی کس قدر ارزانی ہے (یادگار غالب)

شعر (۷) گردباد۔ بگولہ جو تیز ہوا سے پیدا ہوتا ہے۔ صرصر۔ آندھی۔ مطلب ہے کہ میں بیتابی کی رہگذر کا بگولہ ہوں اور صرصر شوق کی مہربانی ہے کہ مجھ کو ایسا بنا دیا ہے۔

شعر (۸) یعنی جب مجھے اپنے معشوق کا دہن معلوم نہ ہو سکا تو میری ہیچمدانی ظاہر ہو گئی۔

شعر (۹) ننگ، شرم۔ مطلب ہے کہ اگرچہ میں جوان ہوں لیکن صدمات نے ایسا ضعیف و زار کر دیا ہے کہ میری جوانی بھی بڑھاپے کو شرما رہی ہے۔

(۱۸۱) نقشِ نازِ بتِ طنّاز بہ آغوشِ رقیب ۱ پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
تو وہ بد خو کہ تحیّر کو تماشا جانے ۲ غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے
وہ تپِ عشق تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع ۳ شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

شعر (۱) خامہ۔ قلم۔ مانی ایک مشہور مصوّر گزرا ہے۔ طنّاز۔ ناز کے ساتھ چلنے والا۔ مطلب ہے کہ جب معشوق رقیب روسیاہ سے بغلگیر ہو کر ناز کرے تو اسکی اس حالت کی تصویر چاہتی ہے کہ مصوّر کے ہاتھ میں بجائے مو قلم کے پائے طاؤس کا قلم ہو۔ چونکہ طاؤس کا بدن خوبصورت ہوتا ہے اور پاؤں بدصورت اسلئے یہ رعایت مدنظر ہے۔

شعر (۲) مطلب ہے کہ تیری ایسی بری عادت ہے کہ میں حیرت زدہ ہوتا ہوں۔ تو تو میری حیرت کو تماشہ سمجھ کر خوش ہوتا ہے اور اگر اپنا افسانہ غم بیان کروں تو اُسے پریشان خیالی سمجھتا ہے۔

شعر (۳) ریشہ دوانی کرے یعنی دوڑے۔ مطلب ہے کہ مجھے اس تپ عشق کی تمنا ہے کہ جس کا شعلہ شمع کی طرح نبض جگر تک ریشہ دوانی کرے یعنی دوڑے۔ جگر سے اندرون سینہ مراد ہے اور نبض سے رگ کیونکہ جگر کی کوئی نبض نہیں ہوتی اور نبض حرکت قلب کا نام ہے اور اگر مجازاً جگر سے دل مراد لیا جائے تو پھر صحیح ہو سکتا ہے۔

(۱۸۲) گلشن کو تری صحبت از بس کہ خوش آئی ہے ۱ ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے
واں کنگرۂ استغنا ہر دم ہے بلندی پر ۲ یاں نالے کو اور الٹا دعویٰ رسائی ہے
از بس کہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے ۳ جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

شعر (۱) مطلب ہے کہ گلشن میں تیرا قیام کرنا پھولوں کو بہت مرغوب ہے کیونکہ ہر غنچہ کا شگفتہ ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ تجھ سے ہم آغوش ہونا چاہتا ہے۔

شعر (۲) کنگرہ جو عمارت کی دیوار کے اوپر چاروں طرف بناتے ہیں۔ استغنا بے پروائی۔ مطلب ہے کہ وہاں تو انکی بے پروائی کا کنگرہ روز بروز بلندی پر جا رہا ہے اور یہاں ہمارا نالہ بیجا فلک رسائی کا دعویٰ کر رہا ہے اگر ہمارا نالہ رسا ہوتا تو وہ اور زیادہ بے پروا نہ ہوتے۔

شعر (۳) غم مجھ کو ضبط کے قواعد سکھاتا ہے اور ہر داغ سے چشم نمائی کا کام لیتا ہے۔

(۱۸۳) جس زخم کی ہو سکتی ہے تدبیر رفو کی ۱ لکھ دیجیو یارب اسے قسمت میں عدو کی
اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصوّر ۲ دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی
کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے ۳ یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی
دشنہ نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو ۴ خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی
صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب ۵ حسرت میں رہے ایک بت عربدہ جو کی

شعر (۱) یعنی مجھے وہ زخم چاہئیں جس میں ٹانکے نہ لگ سکیں اور نہ ہی اچھے ہو سکیں۔

شعر (۲) لفظ "تو" نے جو دوسرے مصرعہ میں ہے یہ معنی پیدا کر دیئے ہیں کہ آنکھ سے لہو روتے روتے دل میں خون کا قطرہ بھی باقی نہیں رہا اسلئے دوست کے سر انگشت حنائی کے تصور کو غنیمت سمجھتا ہے کہ اس کی وجہ سے دل میں لہو کی ایک بوند تو نظر آتی ہے (یادگار غالب)

شعر (۳) مطلب ہے کہ اگر عشاق تنگ آکر بے صبری سے تیری شکایت کر بھی بیٹھتے ہیں تو تجھے اس کی کیا فکر ہے کیونکہ یہاں (دنیا میں) کوئی ان کی فریاد سننے والا نہیں۔

شعر (۴) دشنہ۔ خنجر۔ گلو۔ گلا سے مراد معشوق کے ناز و ادا ہیں۔

شعر (۵) ناکام۔ نامراد۔ عربدہ جو۔ لڑاکا۔ مطلب ہے کہ افسوس ہماری تمام عمر ایک ظالم معشوق کے تمنائے وصال اور حسرت میں ہی گزر گئی لیکن وہ ہمارے پاس نہ آیا۔

(۱۸۴) سیماب پشت گرمی آئینہ دے ہے ہم ۱ حیران کئے ہوئے ہیں دل بیقرار کے
آغوش گل کشودہ برائے وداع ہے ۲ اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

شعر (۱) پشت گرمی۔ پشت بانی۔ امداد۔ مطلب ہے کہ جس طرح کہ پارہ کی اعانت سے شیشہ آئینہ بن جاتا ہے اسی طرح میرے دل کی بیقراری نے مجھے آئینہ حیرت بنا دیا ہے۔

شعر (۲) یعنی رخصت ہونے کیلئے پھول آغوش کھولے ہوئے ہیں اسلئے اے عندلیب بس اب گلشن سے چلنا چاہیئے کہ بہار ختم ہونے پر ہے۔ فارسی میں یہ مضمون اس طرح لکھے گئے ہیں ؎

بروئے برگ گل تا قطرۂ شبنم نہ پنداری   بہار از حسرت فرصت بدنداں میگزد لب را

(۱۸۵) ہے ہجر وصل عالم تمکین و ضبط میں ۱ معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیئے
اس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں ۲ شوق فضول جرأت رندانہ چاہیئے

شعر (۱) یعنی اگر معشوق بلحاظ قدر و منزلت غرور و ناز میں رہا اور خوگر ضبط عاشق نے یہاں بھی رعب حسن سے مرعوب ہو کر ضبط سے کام لیا تو ایسا وصل ایک طرح کا ہجر ہی سمجھا جائے گا۔

شعر (۲) شعر صاف ہے۔

(۱۸۶) چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے ۱ یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے
صحبت رنداں سے واجب ہے حذر ۲ جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیئے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل ۳ بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیئے
چاک مت کر جیب بے ایام گل ۴ کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیئے
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی ۵ منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے
دشمنی نے میری کھویا غیر کو ۶ کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیئے
اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی ۷ یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ۸ ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے
غافل ان مہ طلعتوں کیواسطے ۹ چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
۱۰۔ آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

شعر (۱) اچھوں سے مراد حسین ہیں یعنی جس قدر محبت کرو حسینوں سے اور پھر اگر وہ بھی محبت کریں تو اس سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہو سکتی ہے -

شعر (۲) حذر - پرہیز مطلب ہے کہ میکشوں اور رندوں کی صحبت سے پرہیز کرنا چاہیئے اور میکشی کی بجائے اپنے آپ کو کھینچنا یعنی کشیدہ رکھنا چاہیئے -

شعر (۳) ہمارے دل نے تمہارے عشق میں مبتلا ہونا معمولی کام سمجھا تھا ذرا آپ اسکی اچھی طرح خبر لیں -

شعر (۴) پھول کھلنے کو چاک گریبان سے عموماً تشبیہ دیجاتی ہے کہتا ہے ہر ایک کام نیچر کی ہدایت سے کرنا چاہیئے پس جبتک پھول اپنا گریبان چاک نہ کرے تو بھی گریبان چاک کر اس میں لطف یہ ہے کہ مجنوں کو ہمیشہ بہار میں جوش جنوں زیادہ ہوتا ہے یادگار غالب)

شعر (۵) تم جو اخفائے محبت کیلئے مجھ سے پردہ کرتے ہو لوگ اس میں شک کرینگے یعنی ع کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے کیونکہ پردہ اسی سے کیا جاتا ہے جس سے کچھ لگاوٹ ہو پس مناسب یہی ہے کہ آپ ہم سے پردہ نہ کریں -

شعر (۶) مطلب ہے کہ میرا رقیب میرا کس قدر دشمن ہے کہ اس نے میری عداوت کیوجہ سے اپنے آپ کو تباہ کر لیا ہے کیونکہ نہ وہ شکایتاً میرے معشوق سے میرا ذکر کرتا اور نہ ہی میرا معشوق مجھ پر ناراض ہوتا -

شعر (۷) مطلب ہے کہ صرف معشوق ہی اپنے آپ کو رسوا کرنا چاہے تو ہو سکتا ہے ورنہ عاشق کی کوشش سے وہ رسوا نہیں ہو سکتا۔ یعنی اگر معشوق مہربان ہے تو پھر کون شکایت کر سکتا ہے۔

شعر (۸) یعنی ہماری تمام امیدوں کا دارومدار فقط اس بات پر ہے کہ صرف مرنیکے بعد ہی ہر قسم کی تکلیف سے نجات ہو سکتی ہے۔

شعر (۹) بات تو ٹھیک یہی ہے کہ حسینوں کا چاہنے والا بھی حسین ہونا چاہیئے -

شعر (۱۰) یہ شعر بھی شعر بالا کی کڑی ہے۔

(۱۸۷) ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے ۔ میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

در بعنوان تماشا بہ تغافل خوشتر ۲ ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے
وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں ۳ صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے
غمِ عشاق نہ ہو سادگی آمیزِ بتاں ۴ کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے
اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں ۵ صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
بیخودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہوجیو ۶ پُر ہے سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے
شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے ۷ ہو نگہ مثلِ گلِ شمع پریشاں مجھ سے
بیکسی ہائے شبِ ہجر کی حسرت ہے ہے ۸ سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے
[illegible] ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے ۹ آئینہ داری یک دیدۂ حیراں مجھ سے

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
۱۰
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

شعر (۱) مطلب ہے کہ جس قدر میں چلتا ہوں اُسی قدر منزلِ مقصود مجھ سے دُور ہوتی جا رہی ہے [illegible] بھی میری وحشیانہ رفتار سے ڈر کر دُور دُور بھاگ رہا ہے بقول شخصے ؎

بتاؤں کتنا محبت کا راستہ ہے طویل
کہ جتنا طے کیا اتنا ہی اور دُور ہُوا

شعر (۲) ظاہر ہے کہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں غیر محسوس ہوتا ہے پس مطلب ٹھہرا کہ کتابِ یار کے دیدار کا ورق (بمعنی استعارا) محبوب کے دیدار کا لطف اسی لئے ہے کہ ہم اسے دیکھیں اور اُسے ہمارے دیکھنے کا علم نہ ہو (حسرت)

شعر (۳) دُود۔ دھواں۔ گریزاں۔ بھاگنے والا۔ مطلب ہے کہ میری آتشِ دل کی وحشت سے ڈر کر شبِ تنہائی میں میرا سایہ بھی دھوئیں کی طرح بھاگتا ہے۔

شعر (۴) پہلے مصرعہ میں دعا ہے یعنی خدا نہ کرے کہ عشاق کا غم حسینوں کو سادگی سکھائے ور اُن سے زینت و آرائش چھوڑ دی۔ ایک میرے مرنے سے کس قدر آئینہ خانہ ویران ہو گیا کہ اب اس میں جلوۂ حسن دکھائی نہیں دیتا اور

میرے سوگ میں حسینوں نے آئینہ دیکھنا اور بناؤ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ (نظم)

شعر (۵) یعنی میرے صحرائے جنوں کا راستہ میرے پاؤں کے چھالوں کے نقوش سے موتیوں کی لڑی کی طرح چمک چمک کر چراغاں کا عالم دکھا رہا ہے۔

شعر (۶) یعنی میں اپنی بیخودی کیوجہ سے شبستان میں آرام کر رہا ہوں خدا کرے بیخودی کو بھی بستر استراحت نصیب ہو

شعر (۷) گردن مارے، قتل کرے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح گل شمع کاٹنے سے اور زیادہ شمع روشن ہو جاتی ہے اور اس کی روشنی پھیل جاتی ہے اسی طرح اگر میری گردن کاٹ بھی دی جائے تو اسکے بعد بھی تیرے شوق دید میں میری نگاہیں بے نور نہ ہونگی۔

شعر (۸) افسوس صد افسوس کہ میں اپنے شبہائے فراق کی بیکسی اور وحشت کا کیا ذکر کروں کہ ان تاریک راتوں کے خوف سے میرا سایہ بھی مجھ سے ایسا بھاگا ہے کہ آفتاب قیامت کی روشنی میں بھی وہ نظر نہیں آتا۔ بقول شخصے ؎

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے   کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انسان سے

شعر (۹) مطلب یہ ہے کہ تیرا جلوۂ رنگیں اس محفل میں گردش ساغر کا کام کر رہا ہے اور میرا دیدہ حیراں آئینہ کا۔

شعر (۱۰) یعنی میری نگاہ گرم نے گلستان میں آگ لگا دی۔ پھولوں کا سرخ ہونا آگ سے مشابہ ہے۔

(۱۸۸) نکتہ چیں ہے غم دل اسکو سنائے نہ بنے ۱ کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اسکو مگر اے جذبۂ دل ۲ اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے ۳ کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر ۴ کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا ۵ ہاتھ آویں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے
کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے ۶ پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے
موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے ۷ تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے ٨ کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

شعر (١) مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ میرا معشوق بہت بڑا نکتہ چیں واقع ہوا ہے یعنی ہر بات پر اعتراض کر دیا کرتا ہے اسلئے میں اپنا ماجرائے درد و غم اسے سنا نہیں سکتا۔ بھلا وہاں میری کامیابی کی کیا صورت ہو سکتی ہے کہ جہاں میری کوئی بات بھی صحیح تسلیم نہ کی جائے۔

شعر (٢) ماشاء اللہ نہایت ہی پاکیزہ شعر ہے جس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ مطلب ہے کہ اے جذبۂ دل میری بھی تو یہی خواہش ہے کہ وہ خود آجائے لیکن تو بھی تو اپنی کوئی خاص تاثیر دکھا بقول شخصے

جذبۂ دل میں تو جادو کا اثر پیدا کر اسکے دل میں بھی تری طرح تڑپ پیدا ہو

شعر (٣) چونکہ اُس نے میرے ستانے کو ایک تفریح طبع یا کھیل سمجھ رکھا ہے مجھے فکر ہے کہ اس کھیل سے اُس کی طبیعت اکتا نہ جائے اور وہ اس کھیل کو چھوڑ نہ دے میری تو یہی تمنا ہے کہ وہ میرے ستانے کا خوگر ہو جائے اور بغیر میرے ستائے چین نہ آئے

شعر (٤) مرزا صاحب ایک عجیب طریقہ سے اپنے معشوق اور رقیب کی خط و کتابت بند کرانا چاہتے ہیں بلکہ یہ بھی جتا دیا ہے کہ ہمیں بھی تیری خط و کتابت کا علم ہو گیا ہے مطلب ہے کہ رقیب کو میری رسوائی کا کوئی خیال نہیں یعنی تیرے خط کو وہ اس طرح کھلم کھلا لئے پھرتا ہے کہ اگر کوئی پوچھ بیٹھے تو اُسے مجبوراً بتانا پڑے کہ یہ فلاں معشوق کا خط ہے

شعر (٥) ہاتھ آویں یعنی ہمارے قبضہ میں آجاویں۔ مطلب ہے کہ ہمارا معشوق ایسا نازنین اور نازک بدن ہے کہ اگر وہ ہمارے پاس بھی آجائے تو ہم اُسے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ مبادا کلائی ٹوٹ جائے یا کمر دُہری ہو جائے۔

شعر (٦) یہ باغ و بہار۔ آفتاب و ماہتاب، زمین و آسمان میں جسکی جلوہ گری ہے اُسے کوئی نہیں بتا سکتا اُس نے رنگا رنگی اور کثرت کا ایسا پردہ چھوڑا ہے کہ وہ کسی کے اُٹھائے نہیں اُٹھ سکتا۔

شعر (٧) کہتے ہیں موت کی راہ کیوں نہ دیکھوں کہ وہ بغیر آئے نہ رہیگی۔ یہ مجھ سے نہ ہوگا کہ تم سے

کہوں کہ تم نہ آؤ۔ پھر مجھ سے بلاتے بھی نہ بن پڑے یعنی آپ ہی آنے کو منع کروں تو پھر کس مُنہ سے بلاؤں اشارہ اس طرف ہے کہ تمہارے نہ آنے سے موت کا آنا بہتر ہے۔

شعر (۸) مطلب صاف ہے۔

شعر (۹) مطلب ہے کہ اسے غالب یہ وہ آگ ہے کہ کسی کے لگائے نہیں لگتی اور کسی کے بجھائے نہیں بجھتی یعنی نہ تو زبردستی کسی کے کہنے پر کوئی کسی کا عاشق ہو سکتا ہے اور نہ ہی کسی کے کہنے سے عشق سے باز آسکتا ہے۔

(۱۸۹) چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے ۱ صبح کے مانند زخمِ دل گریبانی کرے
جلوہ کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجیے خیال ۲ دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے
ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک ۳ آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے
میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پائے شکست ۴ موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے
خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد ۵ یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

شعر (۱) یعنی اگر عریانی کی حالت میں میری وحشت گریباں چاک کرنا چاہے تو گریباں صبح کی طرح میرا زخم دل بن جائیگا

شعر (۲) یعنی تیرے جلوے کا وہ عالم ہے کہ دیکھنا تو ایک طرف صرف خیال کرنے سے بھی میرے دل کو سخت حیرانی ہوتی ہے۔

شعر (۳) آبگینہ۔ کانچ۔ شیشہ شراب، کوہ سے مراد معشوق سنگدل ہے مطلب ہے کہ ہمارا دل شکستگی سے بھی ناامید ہو گیا ہے یعنی ہم تو چاہتے ہیں کہ وہ ہماری دلشکنی کرے لیکن وہ اب ایسا بھی نہیں کرتا اے خدا ہم کب تک اس کوہ وقار معشوق سے عرض کرتے رہینگے کہ ہم سخت جان واقع ہوئے ہیں۔

شعر (۴) موئے شیشہ۔ عموماً شیشہ کو ٹھیس لگنے سے جو خط شکستگی آ جاتا ہے اسے بال کہتے ہیں مطلب ہے کہ اگر میکدہ اس کی چشم مست ناز سے شکست کھائے تو شیشوں میں جو بال پڑے ہیں وہ بھی دیدۂ ساغر کو حیران کر دیں گے کیونکہ یہ بال ایک نگاہ مست کے اثر سے پڑے ہیں۔

شعر (۵) یک قلم منظور یعنی سب منظور ہے لفظ قلم کے استعمال سے یہ ثابت بھی مقصود ہے کہ رخسار کی

بھی دونوں طرف قلمیں ہوتی ہیں مطلب یہ ہے کہ معشوق کے رخساروں پر جو خط نکل آیا ہے وہ دراصل ایک عہد نامہ ہے جو کہ میری الفت نے اسکی زلف کو لکھا ہے کہ جو کچھ میرے حق میں پریشانی کی ہے سب مجھے منظور ہے۔ (قاضی)

(۱۹۰) وہ آ کے خواب میں تسکین اضطراب تو دے ۱ ولے مجھے تپش دل مجال خواب تو دے
کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا ۲ تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے
دکھا کے جنبش لب ہی تمام کر ہم کو ۳ نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے
پلائے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے ۴ پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے
اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

شعر (۱) مطلب یہ ہے کہ شاید وہ خواب ہی میں آ کر دل بیقرار کو تسکین دے لیکن دل کی بھی بیقراری مجھے سونے بھی تو نہیں دیتی
شعر (۲) مطلب یہ ہے کہ تیرا بناوٹ کا رونا بھی مجھے قتل کئے ڈالتا ہے تیرے آنسوؤں کا پانی تیغ نگاہ کے لئے آبداری کا کام دیتا ہے۔

شعر (۳) یعنی اگر تو بوسہ دینا نہیں چاہتا تو نہ سہی انکار ہی کر دے تاکہ ہمارا کام تمام ہو جائے یعنی مرجائیں جس کے لئے تیرے لب ہلانا ہی کافی ہیں۔

شعر (۴) اوک۔ چلو۔ اگر ساقی کو یہ خیال ہے کہ پیالہ میں شراب پلانے سے پیالہ ناپاک ہو جائے گا تو نہ سہی ہم چلو سے ہی پی لیں گے لیکن وہ شراب تو دے۔

شعر (۵) شعر صاف ہے۔

(۱۹۱) تپش سے میری وقف کشمکش ہر تار بستر ہے ۱ مرا سر رنج بالیں ہے مرا تن بار بستر ہے
سرشک سر بصحرا دادہ نور العین دامن ہے ۲ دل بے دست و پا افتادہ برخوردار بستر ہے
خوشا اقبال رنجوری عیادت کو تم آئے ہو ۳ فروغ شمع بالیں طالع بیدار بستر ہے

یہ طوفاں گاہ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی ۴ شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے
ابھی آتی ہے بو بالش سے اسکی زلفِ مشکیں کی ۵ ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے
کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالب
کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

شعر (۱) میرے تڑپنے سے بستر کا ہر ایک تار تکلیف میں ہے میرا سر تکیہ کیلئے موجبِ ایذا اور میرا بدن بستر کیلئے عذاب ہے

شعر (۲) نور العین مجازاً فرزند۔ سرشیرازادہ۔ آوارہ۔ بیدست و پا افتادہ۔ ہاتھ پاؤں توڑ کر پڑ رہنے والا۔ نظم صاحب فرماتے ہیں کہ آنسو دامن کی آنکھ کا تارا اور دل بستر مرض کا مرادوں والا ہے یعنی آنسو ہمیشہ دامن میں رہتا ہے اور دل بیمار کو بستر پر پڑے رہنے سے انس ہو گیا ہے۔

شعر (۳) بیمار کے سرہانے عموماً شمع جلائی جاتی ہے مطلب یہ ہے کہ میری بیماری کا بڑا اچھا نصیب ہے کہ تم میری بیمار پرسی کے لئے آئے ہو اور مجھ بیمار کا نصیب بھی سرہانے رکھی ہوئی شمع کی طرح روشن ہو گیا ہے۔

شعر (۴) یعنی میری شامِ تنہائی میں ایسے جوشِ اضطراب کا طوفان آیا ہوا ہے کہ میرا ہر تارِ بستر شعاعِ آفتاب بنگیا ہے۔

شعر (۵) بالش۔ تکیہ۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی تک اس تکیہ سے اسکے گیسوئے مشکیں کی بو آ رہی ہے کہ جس پر سر رکھ کر وہ شبِ وصال میں سویا تھا اور ہمارا ذوقِ دیدار اس کو اپنی ہتک سمجھتا ہے کہ وہ زلیخا کی طرح خواب میں اپنے معشوق کو دیکھے۔

شعر (۶) شعر صاف ہے۔

(۲۱۲) خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے ۱ غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے
سمجھ اس فصل میں کوتاہیٔ نشو و نما غالب ۲ اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

شعر (۱) رگِ گردن۔ غرور۔ سرکشی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ رشتۂ الفت جو مجھ میں اور تجھ میں کمال کو پہنچ گیا ہے رگِ گردن نہ بن جائے اور میرے اس غرور پر تو مجھ سے ناراض ہو کر میری گردن ہی نہ کاٹ دے۔

شعر (۲) یعنی اب کے اگر فصلِ گل میں اس قدر پھول نہ آئیں کہ سرو کو ڈھانپ لیں اور اس کا پیراہن نہ بن جائیں تو اس سے سمجھنا چاہیئے کہ اب کے فصلِ گل خاطر خواہ نہیں ہوئی۔

(۱۹۳) فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے ۱ نالہ پابندِ نَے نہیں ہے
کیوں بوتے ہیں باغباں تونبی ۲ گر باغ گدائے مَے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے ۳ پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ۴ ہر چند کہ ہے نہیں ہے
شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے ۵ اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے
کیوں ردّ و قدح کرے ہے زاہد ۶ مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

شعر (۱) یہ شعر سہل ممتنع ہے ہر شخص کو یہ بات معلوم ہے کہ نالہ نَے نے (بانسری) کا پابند نہیں ہوتا اور فریاد کی کوئی نَے نہیں ہوتی اسلئے اس کا کوئی بھی ذکر نہیں کرتا لیکن شاعر نے اسے دلنشیں الفاظ میں ادا کر کے بھولی ہوئی بات یاد دلا دی۔ ان واقعات سے مرزا کا دیوان بھرا پڑا ہے۔

شعر (۲) مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اگر باغ شراب کی بھیک مانگنے والا نہیں تو باغبان باغ میں تونبی کیوں بوتے ہیں واضح ہے کہ تونبیوں سے کشکول گدائی بھی بنتا ہے اور انہیں تونبیوں میں شراب بھی رکھی جاتی ہے۔

شعر (۳) اگرچہ تو ہر ایک شے میں ہے مگر عالم جسمانی میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جو تجھ سے مشابہ ہو ہر ایک شے میں تیرا ظہور ہے اور سب سے جدا۔ با ہمہ و بے ہمہ۔

شعر (۴) ہستی مخلوق۔ موجودات کا ہرگز دھوکا نہ کھانا کوئی لاکھ کہے جائے کہ "ہے" لیکن تو یہی سمجھ کہ "نہیں" ہے۔

شعر (۵) رنج انسان کو اسلئے ہوتا ہے کہ وہ خوشی و مسرت سے مقابلہ کرتا ہے مثلاً ہم کو خزاں کا اسلئے غم ہوتا

ہے کہ ہم بہار سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں اسلئے کہتے ہیں کہ تم شادی سے قطع نظر کرلو تو پھر غم نہیں ہو سکتا اور (بہار کا مہینہ) نہ ہوگا تو دے (خزاں کا مہینہ) نہیں ہو سکتا۔

شعر (۶) مگس کی قے یعنی شہد۔ زاہد جو شہد پینے کو موجب ثواب سمجھتا ہے اور شراب سے نفرت کرتا ہے اسکو شراب کی ترغیب دیتا ہے اور یہ جتاتا ہے کہ نفرت کی چیز شراب نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جو مگس کی قے سے حاصل ہوتی ہے۔

شعر (۷) نہ ہستی کوئی چیز ہے نہ عدم کوئی شے ہے تو پھر اے جناب نہیں ہے صاحب آخر تو کیا ہے۔ از راہِ شوخی ردیف غزل کو نام بنایا گیا ہے۔

(۱۹۴) نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا ۱ کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے
بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی ۲ وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

شعر (۱) الماس، ہیرا، ہیرا وہ چیز ہے جو شیشے تک کو کاٹ دیتا ہے پھر بھلا وہ زخم میں اور شگاف کیوں نہ کریگا مطلب یہ ہے کہ میرے زخم دل کے مرہم کا نسخہ آپ کیا پوچھتے ہیں اس میں جزوِ اعظم تو الماس ہے الماس کا یہی مضمون فیضی پہلے لکھ چکا ہے ~

زشد اروئے محبت را مپرس اجزا کہ چیست سودۂ الماس در زہر ہلاہل می کنند

شعر (۲) بہت دنوں کے بعد تیرے تغافل نے یہ بات پیدا کی ہے کہ اب تو ہم کو نگاہِ غلط انداز سے دیکھ لیتا ہے اگرچہ یہ نگاہ نگاہ نہیں کہی جا سکتی۔ اس شعر میں لفظ نگہ کو لفظ نگاہ سے کم بنایا گیا ہے کیونکہ نگہ میں الف نہیں ہوتا اور نگاہ میں ایک الف ہوتا ہے۔

(۱۹۵) ہم رشک کو بھی اپنے گوارا نہیں کرتے ۱ مرتے ہیں مگر اس کی تمنا نہیں کرتے
در پردہ انہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی ۲ ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے
یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے ۳ غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

شعر (۱) یہ شعر اس شعر کا ہم معنی ہے ~ دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے ۔ میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

شعر (۲) چونکہ وہ غیر سے پردہ نہیں کرتے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انہیں غیر سے در پردہ پوشیدہ ربط وتعلق ہے اور بظاہر اپنی بے تعلقی کو چھپانے کے لئے پردہ کرنا غیر سے چھوڑ دیا ہے۔

شعر (۳) جب جھوٹے عاشقوں کے سامنے تم غالب جیسے عاشق صادق کو برا کہتے ہو تو اس سے تمہارے جھوٹے عاشق شکستہ خاطر ہو جائینگے اور وہ خیال کرینگے کہ جب غالب کی یہ گت بنتی ہے تو ہمارا کیا ہوگا؟

(۱۹۶) کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ ۱ خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے
کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے ۲ کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے
بجا ہے گر نہ سنے نالہ ہائے بلبلِ زار ۳ کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے
اسد ہے نزع میں چل بیوفا برائے خدا ۴ مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

شعر (۱) مطلب ہے کہ شراب تیرے لبوں کی سرخی سے رنگ و رونق حاصل کر رہی ہے اور خط پیالہ نگاہ گلچیں ہے جو اس کسب رنگ کا تماشہ دیکھ رہی ہے۔

شعر (۲) یعنی تمام عمر اسی حسرت میں گزر گئی کہ کبھی تو ہم اور تم ایک تکیہ پر سر رکھ کر سوئیں

شعر (۳) اگر بلبل بیمار کے نالے پھول نہیں سنتے تو صحیح بات ہے کیونکہ گوش گل میں شبنم کی روئی بھری ہوئی ہے

شعر (۴) اے بیوفا اس وقت تو غالب کو چل کر دیکھ آ کیونکہ وہ حالت نزع میں ہے اور یہ وہ حالت ہے کہ اس موقع پر شرم و حجاب اور غرور و ناز نہیں کرنا چاہیئے۔

(۱۹۷) کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل کیوں نہ ہو ۱ یعنی اس بیمار کو نظارہ سے پرہیز ہے
مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائیگی ۲ وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے
عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد ۳ جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

شعر (۱) چونکہ شاعر چشم محبوب کو اسکی مستی کی وجہ سے چشم بیمار کہا کرتے ہیں اسلئے مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ کہ وہ اس لئے ہماری طرف نہیں دیکھتے کہ چشم بیمار کا پرہیز یہ ہے کہ وہ ہماری طرف نہ دیکھے۔

شعر (۲) افسوس ہے کہ میرے قاتل کا خنجر بہت تیز ہے اور وہ ایک آن میں میرا گلا کاٹ دیگا اور اسے جی بھر کر دیکھنے کی حسرت میرے دل ہی میں رہ جائیگی۔

شعر (۳) عارض۔ چہرہ۔ چونکہ گلاب کے پھول کو چہرہ سے تشبیہ دی جاتی ہے اسلئے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ پھول کو دیکھ کر مجھے معشوق کا رُخ رنگیں یاد آگیا اور موسم بہار کا جوش پر ہونا بھی میرے لئے اشتیاق دیدار کا باعث ہے۔

(۱۹۸) دیا ہے دل اگر اسکو بشر ہے کیا کہیے ۱ ہوا رقیب تو ہو۔ نامہ بر ہے کیا کہیے
یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے ۲ قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے
رہے ہے یوں گہ و بیگہ کہ کوئے دوست کو اب ۳ اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے
زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب ۴ کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیے
سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال ۵ کہ یہ کہے کہ سر رہگذر ہے کیا کہیے
تمہیں نہیں ہے سر رشتہ وفا کا خیال ۶ ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہیے
انہیں سوال پہ زعم جنوں ہے کیا لڑیے ۷ ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کہیے
حدِ سزائے کمال سخن ہے کیا کیجے ۸ ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کہیے
کہا ہے کس نے کہ غالب بُرا نہیں لیکن
۹۔ سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

شعر (۱) مطلب ہے کہ اگر نامہ بر اُسے دیکھ کر عاشق ہو گیا ہے تو کیا کیا جائے میرے معشوق کا حُسن ہی ایسا ہے کہ جو اس کو دیکھ لیتا ہے وہ عاشق ہو ہی جاتا ہے اور نامہ بر بھی تو آخر ہماری طرح بشر ہی ہے۔

شعر (۲) یوں تو موت ایک دن ضرور آئیگی مگر ہم چاہتے تھے کہ آج شب فراق کے صدموں سے جو تنگ آئے ہوئے ہیں آج ہی موت آجائے مگر اُسے ضد ہے کہ ہمیں ترسا ترسا کر اور تڑپا تڑپا کر ہلاک کریگی پس اندازہ لگاؤ کہ ہمیں قضا سے کس قدر شکایت ہے۔

شعر (۳) مطلب ہے کہ رقیب وقت بے وقت ہمیشہ کوچۂ یار میں ہی پھرتا نظر آتا ہے۔ اگر ایسی حالت میں ہم معشوق کے گھر کو دشمن کا گھر تصور نہ کریں تو کیا کہیں۔

شعر (۴) کرشمہ۔ آنکھ کا اشارہ۔ مطلب ہے کہ اس کے کرشمے نے مجھے یہ دھوکا دیا کہ میں اسے اپنا حالِ دل بیان نہ کر سکوں اور میں اسی دھوکے میں رہوں کہ اسے میرا حال پہلے ہی سب کچھ معلوم ہے۔

شعر (۵)۔ مطلب صاف ہے۔ معشوق کی عیاری ظاہر کی ہے۔

شعر (۶) مرزا صاحب معشوق سے پوچھتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ میں کیا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ مصرعہ اولیٰ میں بتا بھی دیا ہے کہ ہمارے ہاتھ میں سر رشتۂ وفا ہے جو تمہارے ہاتھ میں نہیں یعنی تم بے وفا ہو۔

شعر (۷) مطلب ہے کہ میں کوئی سوال کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ دیوانہ ہے بتائیے میں ان کی بات کا کیا جواب دوں معشوق سے لڑنا ٹھیک نہیں لیکن وہ ٹھیک بھی تو کہہ رہے ہیں عاشق دیوانہ ہی تو ہوتا ہے۔

شعر (۸) مرزا صاحب اپنی ناقدردانی کی شکایت کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میرے کمالِ سخن کی سزا مجھے یہ دی جا رہی ہے کہ لوگ مجھ سے حسد کر رہے ہیں اور میرے متاعِ ہنر کی قیمت یہ ہے کہ زمانہ مجھ پر ستم کر رہا ہے اب بتائیے کہ کیا کیجیے اور کیا کہیئے؟ اس مضمون کو عرفی نے بھی خوب ادا کیا ہے ؎

از من بگیر عبرت و کسبِ ہنر مکن — با بختِ خود عداوتِ ہفت آسماں مخواہ

شعر (۹) یعنی غالب برا تو ضرور ہے لیکن اس میں برائی صرف یہی ہے کہ وہ آشفتہ دماغ ہے۔

(۱۹۹) دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے ۱ کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے
بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں ۲ مرحبا میں کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے
کیوں نہ ہو بے التفاتی اسکی خاطر جمع ہے ۳ جانتا ہے محوِ پرسشہائے پنہانی مجھے
میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی ۴ لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے
بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاشکے ۵ اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا ۶ لیگیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے
وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے ۷ تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے
ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ وا ۸ پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے
دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
۹- میرزا یوسف ہے غالب یوسفِ ثانی مجھے

شعر (۱) دامن فشانی۔ دامن جھاڑنا۔ مجازاً دنیا سے قطع تعلق کرنا مطلب ہے کہ دنیا سے قطع تعلق کرنے کی کوشش کرنا محض بیکار ہے کیونکہ دامن افشانی کے بعد بھی جسم کے لئے لباس کا تعلق رکھنا پڑتا ہے۔

شعر (۲) سنگ فساں۔ سان مطلب ہے کہ میں ایسا سخت جان واقع ہوا ہوں کہ تیغ نگاہ یار کے وار پیہم پڑے ہیں لیکن پھر بھی زندہ ہوں جس طرح کہ سان پر تلوار کو کتنا ہی رگڑو وہ نہیں کٹتی۔ دوسرے مصرعہ میں از راہِ طنز کہا ہے کہ آفرین ہے کہ مجھ کو میری سخت جانی بہت ہی مبارک ہو کہ تیغ نگاہ یار کا سنگ فساں تم نے مجھے بنا دیا

شعر (۳) پرسش ہائے پنہانی وہ پرسش جو علانیہ نہ ہو بلکہ در پردہ ہو مطلب ہے کہ معشوق چونکہ اس خیال سے مطمئن ہے کہ عاشق پرسشہائے پنہانی کی وجہ سے خوش ہے اسلئے وہ اپنی بے التفاتی میں بیجا نہیں ہے۔

شعر (۴) غم خانہ یعنی مرزا غالب کا گھر۔ مطلب ہے کہ کاتبِ تقدیر نے جب میری خانہ ویرانی کی کیفیت لکھی تو منجملہ اسباب ویرانی مرزا صاحب کا نام بھی لکھ دیا۔

شعر (۵) مطلب ہے کہ میں نغمہ ہائے بلبل کے سننے کا جو شائق ہوں تو میرا معشوق مجھ سے بدگمان ہے کہ میں معشوق کی دلکش آواز کے مقابلہ میں بلبل کی آواز پر بھی عاشق ہوں کاش کہ مجھے خوش آوازی کا شوق نہ ہوتا۔

شعر (۶) یعنی میں نے تو اس لئے موت اختیار کی تھی کہ گوشہ قبر میں آرام سے پڑے رہینگے لیکن افسوس کہ شور محشر نے وہاں بھی آرام سے نہ رہنے دیا۔

شعر (۷) سبحان اللہ بالکل نیا خیال اور نیا مضمون ہے جسے آج تک کسی شاعر نے چھوا تک نہیں ہے ایفائے

وعدہ کی کیا تدبیر نکالی ہے اور نئی قسم کی دربانی کا ثبوت دیا ہے۔

شعر (۸) یعنی اے آمد موسم بہار کی خوشی تیرے کیا کہنے ہیں میرا سودائے غزلخوانی پھر تازہ ہو گیا ہے۔

شعر (۹) قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ مرزا غالب کے بھائی مرزا یوسف تیس برس تک دیوانے رہے اور زمانہ غدر میں نہایت بیکسی کے عالم میں انتقال کیا۔ گویا بقول غالب ان کو از سر نو زندگی حاصل ہوئی۔

لیکن بظاہر الفاظ سے تو یہ پایا جاتا ہے کہ اُن کو بیماری سے صحت حاصل ہوئی۔

(۲۰۰) یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے ۱ سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیر لب مجھے
ہے کشاد خاطر وابستہ در رہن سخن ۲ تھا طلسم قفل ابجد خانۂ مکتب مجھے
یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیئے ۳ رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے
طبع ہے مشتاق لذت ہائے حسرت کیا کروں ۴ آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مجھے
دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

شعر (۱) طباطبائی صاحب فرماتے ہیں کہ یارب کے معنی فارسی محاورہ میں ہائے ہوئے کے ہیں اور سبحۂ زاہد سے وہ ذکر خفی مراد ہے جو چپکے چپکے ہونٹوں پر کرتے ہیں کہتے ہیں کہ شادی میں کبھی مجھ سے شور یارب نہیں بھولا، میرا خندۂ زیر لب گویا زاہد کا ذکر خفی ہے۔" لیکن ہم عرض کرتے ہیں کہ اہل تصوف کی اصطلاح میں ذکر خفی اس ذکر کو کہتے ہیں جو منہ بند کر کے بلکہ زبان تالو سے لگا کر دل سے ذکر کیا جائے حیرت ہے کہ طباطبائی صاحب ایک ہی بات کو ذکر خفی بھی کہتے ہیں اور شور یارب بھی اور پھر لفظ ہنگامہ کے معنی ہیں وقت مجمع محفل کے۔

شعر (۲) یعنی میں نے طلسم قفل ابجد سے ایک ہی سبق پڑھا ہے اور وہ یہ ہے کہ جس طرح اس کا کھلنا لفظ مقررہ کے بننے پر موقوف ہے یا بالفاظ دیگر جس طرح کہ اس کا وا ہونا در رہن سخن ہے اسی طرح میرے خاطر وابستہ کا کھلنا در رہن سخن ہے یعنی حاصل یہ کہ صرف شعر گوئی سے ہی میری طبیعت کو شگفتگی حاصل ہوتی ہے (قاضی)

شعر (۳) یا الٰہی اس پریشانی کا بھی کوئی علاج ہے کہ قیدیوں کی آسائش پر مجھے رشک آرہا ہے یعنی وہ آرام سے بیٹھے ہیں اور میں مارا مارا صحرا بصحرا پھر رہا ہوں۔

شعر (۴) یعنی میری طبیعت ہمیشہ حسرتوں اور ناکامیوں سے لذت اندوز ہونے کی مشتاق رہتی ہے اس لئے ہر آرزو سے میری یہ مراد ہوتی ہے کہ میری کوئی آرزو پوری نہ ہو۔

شعر (۵) میرزا صاحب یعنی مرزا غالب دوسرے لوگوں کو دل لگانے اور عشق بازی سے منع کیا کرتے تھے لیکن اب خود کسی کو دل دے بیٹھے اور دوسرے لوگوں کی طرح خود بھی عاشق ہو گئے۔

(۲۰۱) حضور شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے ۱ چمن میں خوش نوایان چمن کی آزمائش ہے
قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے ۲ جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر ۳ ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے
نسیم مصر کو کیا پیر کنعاں کی ہوا خواہی ۴ اسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے
وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھا ۵ شکیب و صبر اہل انجمن کی آزمائش ہے
رہے گر دل میں تیر اچھا۔ جگر کے پار ہو بہتر ۶ غرض شست بت ناوک فگن کی آزمائش ہے
نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی ۷ وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
پڑا رہ اے دل وابستہ بیتابی سے کیا حاصل ۸ مگر پھر تاب زلف پرشکن کی آزمائش ہے
رگ و پے میں جب اترے زہر غم تب دیکھیے کیا ہو ۹ ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

وہ آئینگے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالبؔ
۱۰ نئے فتنوں میں اب چرخ کہن کی آزمائش ہے

شعر (۱) مطلب صاف ہے اور کسی درباری مشاعرہ کی غزل ہے۔

شعر (۲) دار سولی۔ رسن رسی مجازاً پھانسی مطلب یہ ہے کہ ہمارا امتحان فرہاد و مجنوں سے زیادہ سخت ہے

یہ دونوں عاشق تو قد و گیسو کی محبت میں مبتلا ہیں لیکن ہمیں تو قد کے مقابلہ میں سولی پر چڑھایا جاتا ہے اور گیسو کے مقابلہ میں پھانسی کا پھندا ہے۔

شعر (۳) نیرو یعنی زور و قوت۔ مطلب ہے کہ ابھی تو صرف فرہاد کی قوت جسمانی کی آزمائش ہے کہ پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر نکال لاؤ لیکن عشق میں ثابت قدم رہنے کا امتحان تو ابھی باقی ہے کہ جب ایک بڑھیا فرہاد کو شیریں کے مرنے کی خبر آکر سنائیگی اور وہ تیشہ مار کر مر جائے گا اور ہمت ہار دیگا۔

شعر (۴) پیر کنعاں سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں مطلب ہے کہ ہوائے مصر جو حضرت یوسف علیہ السلام کے پیرہن کی خوشبو لیکر آئی ہے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ یوسف کے باپ کی خیر خواہی کر رہی ہے نہیں بلکہ اس کا مطلب ہے کہ وہ یعقوب علیہ السلام کا امتحان لے کہ اس بو کا ان پر کیا اثر ہوتا ہے؟

شعر (۵) دیکھو خبردار ہو جاؤ۔ ہوشیار ہو جاؤ۔ پھر نہ کہنا کہ اس نے غفلت میں ہمیں مار ڈالا یعنی آج وہ غارتگر ہوش و حواس محفل میں آ رہا ہے جس میں اب صبر و قرار کا امتحان ہوگا۔

شعر (۶) مطلب ہے کہ اگر ہمارے تیر انداز کا تیر دل میں پیوست ہو جائے تو بھی اچھا ہے اور اگر جگر کے پار ہو جائے تو بھی اچھا ہے ہمیں تو اس کے کمال نشانہ بازی کا امتحان منظور ہے۔

شعر (۷) مطلب ہے کہ نہ تو کچھ شیخ کی تسبیح میں رکھا ہے اور نہ برہمن کے جنیو میں یعنی نہ تو تسبیح چلانے والا مقرب الٰہی ہے اور نہ زنار پہننے والا بلکہ یہ تو ایک وفاداری کی آزمائش ہے کہ ان کو اس میں لگا رکھا ہے۔

شعر (۸) مطلب ہے کہ اے وابستۂ دام زلف دل تڑپنے سے کیا فائدہ آرام سے پڑا رہ تو نے اس پھندے سے نکلنے کی کئی دفعہ کوشش کی لیکن نہ نکل سکا۔ کیا اب جو پھر تڑپنے لگا ہے تو طاقت زلف کی آزمائش کرنے لگا ہے

شعر (۹) غم عشق کا زہر سے مقابلہ کیا ہے یعنی جس طرح زہر ابتدا میں صرف زبان و حلق میں اثر کرتا ہے اور بعد میں تمام جسم میں سرایت کرکے ہلاک کر ڈالتا ہے اسی طرح زہر عشق کا کام ہے۔

شعر (۱۰) مطلب ہے کہ انہوں نے جو میرے گھر آنے کا وعدہ کیا ہے اور میں نے اسے صحیح مان لیا ہے یہ میرا خام خیال ہے کیونکہ اس نے وعدہ ایفا کرنا نہیں ہے بلکہ یہ تو آسمان ایک نیا فتنہ برپا کرنے والا ہے۔

(۲۰۲) کبھی نیکی بھی اسکے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے ۱ جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے
خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے ۲ کہ جتنا کھینچتا ہوں اتنا کھنچتا جائے ہے مجھ سے
وہ بد خو اور میری داستان عشق طولانی ۳ عبارت مختصر قاصد بھی شرما جائے ہے مجھ سے
ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے ۴ نہ پوچھا جائے ہے مجھ سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے
سنبھلنے دے مجھے اے ناامید کیا قیامت ہے ۵ کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
تکلف بر طرف نظارگی میں بھی سہی لیکن ۶ وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے
ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی ۷ نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

شعر (۱) مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی اسکے دل میں مہربان ہونے کا خیال بھی آتا ہے تو وہ اپنے مظالم یاد کرکے محجوب ہو جاتا ہے۔

شعر (۲) مگر بمعنی شاید۔ مطلب صاف ہے یعنی محبت کرتا ہوں وہ کشیدہ خاطر ہوتا ہے۔

شعر (۳) مطلب ہے کہ جب قاصد تک میرا طویل پیغام سنکر گھبرا جاتا ہے تو میرا معشوق تو ہے ہی بدخو اور تند مزاج۔ وہ بھلا کب اتنی طویل داستان سنے گا۔

شعر (۴) مطلب صاف ہے یعنی نہ تو وہ میری بدگمانی کی وجہ سے میری محبت کا حال پوچھ سکتا ہے اور نہ ہی میں ضعف و ناتوانی کے باعث حقیقت حال بیان کر سکتا ہوں۔

شعر (۵) مطلب ہے کہ انتہائے ناامیدی کی حالت میں بے اختیار یہ منہ سے نکلتا ہے کہ اے ناامیدی دیکھ مجھے اتنا مایوس نہ کر کہ خیال یار کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ جائے۔

شعر (۶) یعنی اگر میں اسکے دیکھنے والوں میں بھی شریک ہو جاؤں تو میرے لئے یہ بھی تکلیف دہ ہے کیونکہ میں مارے رشک کے یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ میرے سامنے اسے غیر بھی دیکھ سکیں۔

شعر (۷) اس شعر میں وجدانی کیفیت کی تمثیل محسوسات کے ساتھ دی گئی ہے مطلب یہ ہے کہ وہ قوی جن سے عشق کے ترک کرنے یا اس کے شدائد پر تحمل کرنے کی قدرت تھی ابتدائے عشق میں انہیں کو صدمہ پہنچا ہے بس اب نہ عشق ترک ہو سکتا ہے اور نہ اس پر صبر و تحمل ہو سکتا ہے"۔ میدان عشق میں بے بس ہو جانے کی کیا مثال دی ہے (یادگار غالب)

کئی صدمے طریق عشق میں اے تاج آتے ہیں تجھے تو پا شکستہ پہلی ہی منزل میں دیکھا ہے

شعر (۸) اس شعر میں مرزا صاحب نے انتہائے غیرت و رقابت کا ثبوت دیا ہے یعنی خدا تک سے بدگمان ہو گئے فرماتے ہیں اے غالب یہ کیا قیامت ہے کہ جس معشوق کو سفر کے موقع پر سپرد خدا کرنا بھی گوارا نہ کرتا تھا وہ اب رقیب کے ساتھ ہم سفر ہوتا ہے۔

(۲۰۳) زبسکہ مشق تماشا جنوں علامت ہے ۱ کشاد و بست مژہ سیلیِ ندامت ہے
نہ جانوں کیونکہ مٹے داغ طعن بدعہدی ۲ تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے
بہ پیچ و تاب ہوس سلک عافیت مت توڑ ۳ نگاہ عجز سر رشتۂ سلامت ہے
وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد ۴ جنون ساختہ و فصل گل قیامت ہے

شعر (۱) سیلی، طمانچہ۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کے لہو و لعب اور سیر و تماشہ میں اپنا وقت صرف کرنا دیوانہ پن کی علامت ہے اور پلکوں کا کھلنا اور بند ہونا ایک طرح سے سیلی شرم و ندامت ہے۔ غالباً مرزا صاحب نے یہ مضمون مرزا بیدل کے ان اشعار سے اخذ کیا ہے۔ ؎

دیدہ را کہ بہ نظارۂ دل محرم نیست مژہ برہم زدن از دست ندامت کم نیست
ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو چمن درا تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بچمن درا

شعر (۲) ورطہ۔ جائے ہلاکت، گرداب مطلب یہ ہے کہ تیرے دامن عزت پر سے بدعہدی کے طعن کا داغ کس طرح مٹے گا۔ تیرے لئے تو آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے۔

شعر (۳) سلک، لڑی، عافیت آسائش و دلجمعی۔ مطلب یہ ہے کہ عافیت کی لڑی کو ہوس کے پیچ

سے کر نہ توڑا۔ اگر سلامتی چاہتا ہے تو عاجزی اور قناعت سے بسر کر۔

شعر (۴) تمام شارحین اسکی شرح یہی فرماتے ہیں کہ معشوق تو وفا کیلئے آمادہ ہے لیکن رقیب کا دعویٰ عشق جھوٹا ہے یعنی بار یہ جو بنوں پہ ہے لیکن کوئی دیوانہ نظر نہیں آتا کہ جوشِ جنوں کا ثبوت دے کہتے ہیں کہ اس شعر میں رقیب پر چوٹ ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں رقیب کی کیا خصوصیت ہے۔ شاعر ہی اپنے جنوں کا ثبوت دیتا ہے۔

(۲۰۴) لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے ۱ میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے
کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آ جائے رحم ۲ واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے
منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر بہ انداز عتاب ۳ کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے
یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں ۴ زلف گر بن جاؤں تو شانے میں الجھا دے مجھے

شعر (۱) مطلب یہ ہے کہ تیرے عشق میں اسقدر لاغر اور نحیف و زار ہوں کہ اگر تو اپنی محفل میں مجھے بیٹھنے کیلئے جگہ دے تو میں اسبات کا ذمہ لیتا ہوں کہ کوئی مجھے دیکھ کر ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں کوئی غیر شخص بیٹھا ہے۔

شعر (۲) مطلب صاف ہے۔

شعر (۳) معشوق کو بے حجاب کرنیکی اچھی تدبیر نکالی ہے آنکھیں ہی دکھا دے یعنی اپنا غصہ ہی مجھ پر ظاہر کر دے

شعر (۴) مطلب صاف ہے۔

(۲۰۵) بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ۱ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک ۲ اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے
جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور ۳ جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے ۴ گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے ۵ تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
سچ کہتے ہو خودبین و خودآرا ہوں نہ کیوں ہوں ۶ بیٹھا ہوں بت آئینہ سیما مرے آگے

پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار ۷ رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے
نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا ۸ کیونکر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر ۹ کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام ۱۰ مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے
خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے ۱۱ آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے
ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو ۱۲ آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے ۱۳ رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

۱۴۔ ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے اپنا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

شعر (۱) بازیچۂ اطفال۔ بچوں کا کھیل۔ مطلب صاف ہے۔

شعر (۲) اورنگ۔ تخت۔ یعنی میری نظر میں تخت سلیمان ایک کھیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو قُم کہہ کر مردے زندہ کیا کرتے تھے میں اسے بھی ایک بات سمجھتا ہوں یعنی ناچیز بات۔

شعر (۳) یعنی یہ جو دنیا کی صورت نظر آ رہی ہے یہ صرف اعتباری نام ہے اسکی حقیقت کوئی نہیں اور وجود اشیاء محض وہم ہی وہم ہے۔

شعر (۴) یعنی میری صحرا نوردی اور اشکباری کے مقابلہ میں صحرا اور دریا کوئی ہستی نہیں رکھتے۔

شعر (۵) یعنی تو یہ کیوں پوچھتا ہے کہ میری عدم موجودگی میں تیرا کیا حال ہوتا ہے بس تو بھی نقشہ دیکھ لے کہ جو تیرا حال میرے سامنے ہوتا ہے یعنی تو یہاں بیٹھے ہوئے نہایت بیقرار اور دیکھتا ہے کہ کب اٹھ کر یہاں سے جاؤں

شعر (۶) سیما۔ پیشانی۔ یعنی تم جو مجھے خود آرائی و خود بینی کا الزام لگاتے ہو تو یہ واقعی صحیح ہے و میرا خود بین ہونا حق پر مبنی ہے کیونکہ میں تیرے جیسے آئینہ سیما کا عاشق بنا ہوں اگر خود بین و خود آرا ہوں تو محض تیری وجہ سے ہوں

شعر (۷) یعنی اگر کوئی میرے سامنے ساغر و شراب رکھ دے اور ایک دو جام اڑاؤں اور دماغ میں رنگینی پیدا ہو تو پھر دیکھیے کہ میرے منہ سے مضامین و اشعار کے پھول جھڑتے ہیں۔

شعر (۸) یعنی میں تو از راہِ غیرت لوگوں کو اس کا نام لینے سے منع کرتا ہوں لیکن دھوکا یہ ہوتا ہے کہ میں اس سے نفرت کرتا ہوں اس لیے اب میں نے رشک کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔

شعر (۹) یعنی میں عجب کشمکش میں مبتلا ہوں کہ اِدھر تو ایمان مجھے اس بت کافر کے پاس جانے سے روکتا ہے اور اُدھر اس بتِ کافر کا عشق مجھے کھینچ رہا ہے کہ آ اور معشوق کے قدموں پر آکر سر رکھ دے تو گویا کعبہ مجھے پیچھے سے کھینچ رہا ہے اور کافر آگے سے۔

شعر (۱۰) مطلب یہ ہے کہ میں ایسا چالاک اور عیار عاشق ہوں کہ معشوق بھی دھوکا کھا جاتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر سچا عاشق ہی دنیا میں نہیں گزرا ہے حتیٰ کہ لیلیٰ بھی میرے مقابلہ میں مجنوں کو ذلیل سمجھتی ہے

شعر (۱۱) یعنی شبِ فراق میں جو میں نے یہ دعا کی تھی کہ یا الٰہی اگر مجھے مارنا ہی چاہتا ہے تو وصل کی رات میں موت نصیب ہو شبِ فراق میں مرنا تو بہت برا ہے بس وہ بول بولا ہوا میرے آگے آیا اور مجھے شادیِ مرگ نصیب ہوئی۔

شعر (۱۲) یعنی میرے دل میں ایک دریائے خون موجزن ہے کاش یہی دریا مجھے بہا کر لیجائے اور میری مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔ نہیں معلوم ابھی کیا کیا طوفان دیکھنے نصیبوں میں ہیں۔

شعر (۱۳) مطلب صاف ہے مرزا صاحب نے کمال صفائی سے اپنی حرصِ بادہ نوشی کا اظہار کیا ہے۔

شعر (۱۴) قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ مرزا غالب کی ذوق مرحوم سے ہمیشہ چشمک رہتی تھی۔ اکثر اشعار میں ان پر چوٹ کر جاتے تھے۔ ممکن ہے کہ اس شعر میں بھی در پردہ انہیں پر حملہ ہو جیسے ایک شعر پہلے گزر چکا ہے۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا   دگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

(۲۰۶) کہا جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے   ۱   تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے
نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستمگر ہیں"   ۲   مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اُتر جاوے ۳ نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے
نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں ۴ وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے
جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے ۵ جو ناسزا کہے اس کو نہ ناسزا کہیے
کہیں حقیقتِ جانکاہیٔ مرض لکھیے ۶ کہیں مصیبتِ ناسازیٔ دوا کہیے
کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے ۷ کہیں حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے
رہے نہ جان تو قاتل کو خونبہا دیجے ۸ کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے
نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے ۹ روانیٔ روشِ و مستیٔ ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے ۱۰ طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ
۱۱ خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

شعر (۱) مطلب صاف ہے۔ معشوق کے تجاہلِ عارفانہ کا چربہ اُتارا ہے۔

شعر (۲) مطلب یہ ہے کہ میری تو عادت ہو گئی ہے کہ آپ کی ہر ایک بات پر خواہ صحیح ہو یا غلط بیساختہ کہہ دیا کرتا ہوں کہ بجا ہے۔ پس جب آپ نے یہ کہا کہ "ہم ستمگر ہیں؟" تو میں نے حسبِ عادت کہہ دیا کہ بجا ہے پھر آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں میں نے آپ کی بات کو کاٹا تو نہیں اگر اپنی بات سے ستمگر بن گئے ہو تو آئندہ ذرا سوچ کر منہ سے بات نکالا کریں ع
سوچ کر منہ سے نکالو بات پھر پچھتاؤ گے لوٹ کر آتا نہیں ہے تیر چل جانے کے بعد

شعر (۳) نیشتر۔ نشتر۔ دل میں اُتر جائے یعنی دلنشین ہو جائے یہ تو صحیح ہے کہ نگاہِ یار نشتر کی طرح زخم کر دیتی ہے لیکن جب وہ دلنشین ہو جائے اور دل خود ہی اسے پسند کرے تو کیوں نہ اُسے محبوب سمجھا جائے۔

شعر (۴) مطلب یہ ہے کہ جو کوئی دشمنی کرے اس سے دشمنی نہ کیجے اور جو تمہیں بُرا کہے اُسے بُرا نہ کہو۔

شعر (۵) یعنی صرف تیر کے زخم سے میری تسکین نہیں ہو سکے گی۔ وہ تو تلوار ہی کا زخم ہوتا ہے جس سے

دلکشائی حاصل ہوتی ہے یعنی گداز خم آتا ہے۔

شعر (۶ و ۷) بس ہماری تو اسی طرح بسر ہو رہی ہے کہ کسی کو اپنی بیماری کا حال لکھ رہے ہیں، کسی کے آگے دوا کے ناموافق آنے کا حال بیان کر رہے ہیں کہیں اپنے انتہائی رنج و الم کا اظہار کر رہے ہیں اور کہیں اپنی بے صبری کی کہانی بیان کر رہے ہیں۔

شعر (۸) ماشاء اللہ یہ بھی اچھوتا مضمون ہے مطلب یہ ہے کہ اگر قتل ہو جاؤ تو الٹا خود ہی قاتل کو خونبہا یعنی خون کی قیمت دو (حالانکہ خونبہا قاتل کو دینا لازم ہے) اور اگر زبان کٹے تو تیزی خنجر کی تعریف کرو۔

شعر (۹) مطلب یہ ہے کہ جب ایک شخص کو معشوق (محبوب) تسلیم کر لیا تو پھر اس کی عادات و مظالم کی شکایت نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس کے نقش و نگار اور حسن و جمال کی تعریف کرنی چاہیئے۔

شعر (۱۰) یہ شعر بھی شعر بالا کی کڑی ہے۔

شعر (۱۱) کشتی میں سوار ہو کر دریا کے پار اترنا تھا راستہ خطرناک تھا راستہ میں ناخدا یعنی کشتی بان نے تنگ کیا تکلیف پہنچائی ناجائز فائدہ اٹھایا۔ شکر ہے کہ کشتی کنارے پر لگی۔ مرزا صاحب نصیحت فرماتے ہیں کہ جان بچی لاکھوں پائے اب ناخدا کی شکایت کرنا مناسب نہیں۔ جو ہوا سو ہوا۔

(۲۰۷) رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے ۱ دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے
صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی ۲ تھے یوں ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے
رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے ہم ۳ بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے
کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر ۴ پردے میں لاکھ گل کے جگر چاک ہو گئے
پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا ۵ آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے
کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ ۶ کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے
اس رنگ سے کل اس نے اٹھائی اسد کی نعش ۷ دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

شعر (۱) دھو یا جانا، بے شرم و بیباک ہونا۔ پاک و آزاد۔ شہدا۔ مطلب یہ ہے کہ جبتک آنکھوں سے آنسو نہ نکلے تھے تو اس بات کا پاس و لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر ہونے پائے۔ مگر جب رونا ضبط نہ ہو سکا اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے تو اخفائے راز عشق کا خیال جاتا رہا اور ایسے بے شرم و بیحجاب ہو گئے (یادگار غالب)

شعر (۲) آلات میکشی کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ شراب کشید کرنے کا سامان یا شراب پینے کا سامان مثلاً ساغر و مینا وغیرہ مطلب یہ ہے کہ ہم آزاد منش تھے لیکن دو فکریں بھی ساتھ تھیں ایک تو یہ کہ شراب کہاں سے پئیں جب پیسے نہیں دوسرے آلات میکشی کی حفاظت کون کرے یہی مناسب سمجھا کہ آلات میکشی کی قیمت وصول کرو اور پھر اسی قیمت سے شراب پیو اس طرح دونوں فکروں سے نجات ہو گئی۔

شعر (۳) مطلب صاف ہے۔

شعر (۴) مطلب ہے کہ بلبل ہی کے نالہ پر اثر سے گلوں کے جگر چاک ہوئے ہیں جنہیں لوگ پھولوں کا شگفتہ ہونا کہتے ہیں

شعر (۵) مطلب یہ ہے کہ جس طرح خس و خاشاک آگ میں جلکر آگ ہو جاتی ہے اور اسے پھر نہ موجود کہتے ہیں اور نہ معدوم۔ اسی طرح آتش شوق فنا میں جلنے والے عشاق کا حال ہے۔

شعر (۶) شاہد حقیقی کا جو معاملہ عشاق کے ساتھ ہے اسکو تغافل کیساتھ اور عشاق کے معاملہ کو نگاہ کیساتھ تعبیر کیا ہے پس شاعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسکے تغافل سے تنگ آکر شکایت کی تھی اور اسکی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے جب اُس نے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں ہم کو خاک کر دیا۔ (یادگار غالب)

شعر (۷) یعنی ایسی مضمحل اور مغموم صورت بنا کر اس نے اسد کی لاش اُٹھائی کہ دشمن بھی یہ نظارہ دیکھکر آبدیدہ ہو گئے

(۲۰۸) نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب ۱ شیشۂ مے سرو سبز جوئبار نغمہ ہے
ہمنشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزم عیش دوست ۲ واں تو میرے نالے کو بھی اعتبار نغمہ ہے

شعر (۱) جوئبار۔ نہر۔ مطلب یہ ہے کہ محفل محبوب میں ایسا سرور ہے کہ خود نشے اسکے رنگ سے شاداب ہیں اور ساز جو بج رہے ہیں وہ بھی نشہ طرب سے مست ہیں اور شیشۂ مے جوئبار نغمہ کا سرو بنا ہوا ہے ساز کی تار کو بھی طرب کہتے ہیں اور طرب کے معنی خوشی بھی ہیں

شعر (۲) یعنی اے دوست تیرا یہ خیال غلط ہے کہ میں اپنی آہ و فغاں سے بزمِ یار کا عیش خراب کر رہا ہوں یہاں تو میرے نالوں سے بھی وہ نغمۂ مسرّت کا کام لیتے ہیں۔

(۲۰۹) عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے ۱ دعویٰ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے
ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل ۲ یک جہاں زانو تامّل در قفائے خندہ ہے
کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام ۳ ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے
سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں ۴ دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

شعر (۱) مطلب یہ ہے کہ ہنسی کے وقت دانت اپنی شوخیِ ناز کا اظہار کرتے ہیں (اجتماعِ دنداں کو چونکہ جمعیت احباب سے شعرا تشبیہ دیا کرتے ہیں) اسلئے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ دنیا کے دوستوں کی جمعیت جائے خندہ ہے۔

شعر (۲) یعنی غنچہ ہنوز عدم میں ہے مگر انجامِ گل کی عبرت پر حیرت میں ہے۔ یک جہاں زانو تامّل سے مراد فکرِ بے حد مطلب یہ ہے کہ اس کا بھی وہی انجام ہوگا جو دوسرے پھولوں کا ہوا۔

شعر (۳) دنداں بدل افشردن، مصائب و تکلیف اٹھانا مطلب یہ ہے کہ ہم افسردگی سے مجبور ہیں جن کے مذہب میں عیشِ بیتابی حرام ہے ورنہ اپنے دل کو زخمی کرنا اور خون بہانا یہ تو عین خوشی کی جگہ ہے اور اس پر فخر کرنا چاہیئے

شعر (۴) محیط کے معنی گھیرنے والے کے ہیں لیکن یہاں مجازاً دریائے محیط کے معنوں میں استعمال ہوا ہے آشنا کے معنی جاننے والے کے ہیں لیکن پیراک کے معنوں بھی آتا ہے اور اس میں دریا کی مناسبت مضمر ہے مطلب یہ ہے کہ احباب میری سوزشِ باطن کے قائل نہیں اور یہ اس لئے کہ ہونٹوں پر ہنسی ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں یعنی وہ سمجھتے ہیں کہ اس کا دل تو بحرِ گریہ ہے پھر سوزش کہاں؟

(۲۱۰) حُسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے ۱ آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن ۲ چشمِ وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

شعر (۱) مطلب یہ ہے کہ اب حسن بے پروا بھی اپنے جلوہ کی نمود کا خواہشمند ہو گیا ہے چنانچہ اس جذبۂ جلوہ گری کا

زانوئے فکر آئینہ بنا ہوا ہے۔

شعر (۲) مطلب یہ ہے کہ جلوۂ عالم بے ثبات ہے اسکی مدت قیام ایک چشم زدن سے زیادہ نہیں گویا تماشے کیلئے آنکھ کا کھلنا اسکے رخصت کرنے کیلئے آغوش وداع کے کشادہ کرنے کے ہم معنی ہے۔

(۲۱۱) جبتک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی ۱ مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی
عالم غبار وحشت مجنوں ہے سر بسر ۲ کبتک خیال طرۂ لیلےٰ کرے کوئی
افسردگی نہیں طرب انشائے التفات ۳ ہاں درد بنکے دل میں مگر جا کرے کوئی
رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے ۴ آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی
چاک جگر سے جب رہ پرسش نہ وا ہوئی ۵ کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی
لخت جگر سے ہے رگ ہر خار شاخ گل ۶ تا چند باغبانی صحرا کرے کوئی!
ناکامی نگاہ ہے برق نظارہ سوز ۷ تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
ہر سنگ و خشت ہے صدف گوہر شکست ۸ نقصاں نہیں جنوں ہی جو سودا کرے کوئی
سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر ۹ فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
ہے وحشت طبیعت ایجاد یاس خیز ۱۰ یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی
بیکاری جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل ۱۱ جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
۱۲۔ پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

شعر (۱) صوفیہ کی اصطلاح میں محادثت اور مسامرت (یعنی عبد و معبود کے درمیان گفتگو ہونا) دو مرتبے ہیں جو کاملین اور عرفا کو حاصل ہوتے ہیں کہتا ہے کہ شاہد حقیقی کیساتھ اس معمولی لب و دہن سے گفتگو نہیں ہوسکتی بلکہ اسکے لئے دہان زخم پیدا کرنا چاہیے یعنی جبتک دل تیغ عشق سے مجروح نہ ہو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا (یادگار غالب)

شعر (۲) یعنی تمام عالم وحشت مجنوں کا غبار ہے اسی طرح لیلیٰ کب تک خیال کرتے رہیں مطلب یہ ہے کہ کائنات ایک دھوکا ہے ہم کب تک معشوق حقیقی کی جلوہ گری سمجھتے رہیں۔

شعر (۳) صرف افسردہ ہو کر رہ جانے سے کوئی معشوق کے التفات کی توقع پیدا نہیں کر سکتا ہاں کوئی سراپا درد بن جائے تو اس کے دل میں جگہ پانا ممکن ہے۔

شعر (۴) مطلب صاف ہے۔ عقدہ - گرہ - وا - کھلنا۔

شعر (۵) جب جگر تک زخمی کر کے چلاتے رہے تو اس نے ہمیں پوچھا تک نہیں تو وحشت میں آ کر جیب و گریبان کی دھجیاں اڑائیں گے تو وہ کب پوچھے گا۔

شعر (۶) میرے جگر کے ٹکڑے ہر خار پر الجھے ہوئے ہیں اس لحاظ سے ہر خار شاخ گل بنا ہوا ہے اب کب تک ہم اس جنگل کے باغ کی باغبانی کرتے رہیں؟

شعر (۷) یعنی تجھ کو ہرگز کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ تیرے دیکھنے کیلئے ہماری آنکھیں الٹی برق نظارہ سوز کا کام رہی ہیں

شعر (۸) جنوں کا سودا اپنے سر لینے میں کوئی نقصان نہیں اسلئے کہ جو اینٹ اور پتھر عاشق کے سر پر مارے جاتے ہیں وہ بمنزلہ صدف ہیں کہ جن میں سے شکست سر کے موتی نکلتے ہیں۔

شعر (۹) یعنی تمام عمر تو وعدہ صبر آزما کے انتظار میں کٹ گئی پھر دوبارہ تیرے ملنے کی آرزو کب کرتے

شعر (۱۰) ایجاد کی طبیعت میں جو وحشت ہے وہ یاس انگیز ہے یعنی ہم وحشی لوگ یاس کو ایجاد کرتے ہیں اور اس طرح گویا مایوس ہونے پر مجبور رہیں۔ (حسرت)

شعر (۱۱) مطلب ہے کہ بہ سبب وحشت و جنون بیکار بیٹھے رہنے سے تو طبیعت میں الجھن و اداسی پیدا ہوتی ہے آخر کوئی شغل چاہیئے ناچار جب کلیجہ منہ کو آتا ہے تو سر پیٹ لیا کرتے ہیں لیکن جب پیٹتے پیٹتے ہاتھ بھی ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کریں۔

شعر (۱۲) غالباً مرزا صاحب نے اس شعر میں بھی اپنے کسی معاصر پر چوٹ کی ہے کہ جب تک دل میں سوز و گداز پیدا نہ ہو شاعری کو فروغ حاصل ہونا مشکل ہے۔

(۲۱۲) ابن مریم ہوا کرے کوئی ۱ میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی ۲ ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر ۳ دل میں ایسے کہ جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے ۴ وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ ۵ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
نہ سُنو گر بُرا کہے کوئی ۶ نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی ۷ بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند ۸ کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے ۹ اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

شعر (۱) یعنی اگر مسیح ابن مریم ہی کیوں نہ ہوں جو مُردے زندہ کیا کرتے تھے لیکن اگر وہ میری بیماری کا علاج نہیں کر سکتے تو میرے کس کام! میں انہیں کیا سمجھوں؟

شعر (۲) یعنی شرع و قانون سے تو اس شخص کو سزا دی جا سکتی ہے جو کسی کو کسی اسلحہ وغیرہ سے قتل کرے لیکن ایسے قاتل پر کوئی کیا گرفت کرے کہ جو ہاتھ بھی نہ لگائے اور بغیر تلوار وغیرہ کے صرف ناز و غمزہ سے قتل کر ڈالے۔

شعر (۳) یعنی ایسے شخص کے دل میں کون جگہ پا سکتا ہے جو تیر کی طرح پاس سے گزر جاتا ہے اور بات کرنے کا موقع نہیں دیتا

شعر (۴) مطلب صاف ہے۔

شعر (۵) مطلب یہ ہے کہ مرزا صاحب کچھ تصوّف اور حقیقت کی باتیں کہہ گئے اور اب ان پر پردہ ڈالنے کے لئے کہتے ہیں کہ یہ تو مجنونانہ اور مجذوبانہ بڑ تھی۔

شعر (۶ و ۷ و ۸) مطلب صاف ہے۔

شعر (۹) مطلب یہ ہے کہ جب خضر جیسا رہنما سکندر کو آب حیات تک بھی لے گیا لیکن سکندر کی قسمت میں آب حیات پینا نہ لکھا تھا تو پھر کسی اور کی رہنمائی کسی کے کیا کام آسکتی ہے؟

شعر (۱۰) یعنی جب کسی شخص سے تعلقات ہی منقطع ہوگئے اور اس سے کسی قسم کی امید ہی باقی نہ رہی تو پھر اس کا تذکرہ و شکایت بھی بیکار ہے۔

(۲۱۳) بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے ۱ غلام ساقیٔ کوثر ہوں مجھکو غم کیا ہے
تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے ۲ رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے
کٹے تو شب کہیں کاٹے تو سانپ کہلاوے ۳ کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے
لکھا کرے کوئی احکام طالع مولود ۴ کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے
نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا ۵ خدا کیواسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے
وہ داد و دید گرانمایہ شرط ہے ہمدم ۶ وگرنہ مہر سلیماں و جام جم کیا ہے
سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
۷ یقین ہے ہمکو بھی لیکن اب ان میں دم کیا ہے

شعر (۱) گیتی، دنیا، ساقی کوثر حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، مطلب یہ ہے کہ اگر ہم کو دنیا کے غم لگے ہوئے ہیں تو کوئی غم کی بات نہیں ان کے غلط کرنے کیلئے شراب کیا تھوڑی ہے یہ بھی تو بہت ہے۔ اب رہا آخرت کا غم تو اس غم کو غلط کرنے کیلئے ساقی کوثر پلا دینگے۔

شعر (۲) یعنی رقیب پر تمہارا لطف و کرم کرنا بھی تو ہمارے لئے ایک ستم ہے۔

شعر (۳) یعنی انکی زلف کا خیال ایک جدائی کی شب دراز ہے جو کاٹے کٹتی نہیں اور کٹتی بھی ہے تو اس طرح کہ جیسے کوئی سانپ کسی کو کاٹ کھائے تو وہ مار گزیدہ تمام رات تڑپ تڑپ کر کاٹے اس شعر میں شب اور زلف اور

سانپ اور کاٹنے کی رعایتیں خوب ہیں۔

شعر (۴) یعنی اگر کوئی نجومی جوتشی کسی پیدا ہونیوالے بچے کے طالع و نصیب خواہ کیسے دل خوش کن کیوں نہ نکال دے لیکن اسے ہرگز ہرگز معلوم نہیں کہ کاتبِ تقدیر نے اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔

شعر (۵) یعنی جو شخص کسی مذہب و ملت کا ہی پیرو نہ ہوا اور نہ ہی روزِ قیامت کا قائل تو پھر ایسا شخص اگر خدا کی قسم کھائے تو اس کا اعتبار ہی کیا ہے؟

شعر (۶) داد۔ عدل و انصاف بخشش و عطا، دید۔ دیکھنا۔ گرانمایہ بہت بڑی پونجی اور اصل چیز۔ مطلب ہے کہ سلطنت و حکومت کیلئے عدل و انصاف اور بخشش و عطا شرطِ اصلی ہے اور بادشاہ کیلئے اہلِ دید اور اہلِ نظر ہی بہت بڑی دولت اور سرمایہ ہیں ورنہ مہرِ سلیمان اور جامِ جمشید بادشاہی کا سرمایہ نہیں اور انکی کوئی ہستی نہیں۔

مندرجہ بالا اشعار نمبر ۳، ۴، ۵، ۶ بقول جناب قاضی صاحب پرانے دیوانوں میں نہیں پائے جاتے اردوئے معلی میں مرزا صاحب نے ایک خط میں مولانا علائی کو تاکید کی ہے کہ ان کو درجِ حاشیہ کر لیا جائے اسلئے ہم نے ان کا اضافہ کر دیا ہے۔”
لیکن حیرت ہے کہ قاضی صاحب نے ان کی کوئی شرح نہیں لکھی خیر جو کچھ ہمارے فہم و دانش میں آیا ہم نے انکی شرح لکھدی ہے۔

شعر (۷) یعنی شاعری میں غالب کے قلم کی آتش افشانی کا ہمیں یقین ہے مگر اب صدمات زمانہ سے وہ عاجز آگیا ہے اور خاموش پڑا رہتا ہے۔

(۲۱۴) باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے ۱ سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے
جوہرِ تیغ بہ سرچشمۂ دیگر معلوم ۲ ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اگاتا ہے مجھے
مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے ۳ آئینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے
نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک ۴ آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے
زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے ۵ دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

شعر (۱) افعی، سانپ مطلب ہے کہ میں باغ میں جاتا ہوں تو باغ بھی ایک خفقانی وہمی سمجھ کر ڈرانے لگ جاتا

ہے یعنی ہر پھول کی شاخ کا سایہ مجھے سانپ کی طرح نظر آتا ہے طباطبائی صاحب فرماتے ہیں کہ نظیری کے اس شعر سے اس تشبیہ کی طرف مرزا صاحب کا ذہن منتقل ہوا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

بزیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را   نواگران نخوردہ گزند را چہ خبر

شعر (۲) جس طرح تلوار کا جوہر ہمیں معلوم ہے کہ زہر آب میں بجھانے کے سوا کسی اور چشمہ میں غوطہ دینے سے پیدا نہیں ہو سکتا اسی طرح میں وہ سبزۂ روئیدہ ہوں کہ جس کی پیدائش صرف غم و غصہ کے زہر سے ہوئی ہے۔

شعر (۳) میرا مدعا شکستگی دل کے تماشے میں گم ہے یعنی میرا دل ایک آئینہ تھا جسکے ٹوٹنے سے ایک آئینہ خانہ بنگیا۔

شعر (۴) یعنی میری نظر میں آسمان بیضۂ قمری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اور جس طرح قمری ایک مشت خاکستر ہے اس طرح یہ دنیا بھی ایک مشت خاک ہے اور قمری کا سرمایۂ زندگی نالہ ہے اسی طرح دنیا کی ہستی بھی نالہ و فریاد ہی ہے۔

شعر (۵) کون اٹھاتا ہے مجھے۔ اسکے دو معنی ہیں ایک یہ کہ زندگی میں تو مجھے محفل سے اٹھا دیتے تھے اب مرنے کے بعد دیکھوں مجھے وہاں سے کون اٹھاتا ہے؟ دوسرے معنی یہ ہیں کہ محفل سے تو اٹھا دیتے تھے اب میرا جنازہ کون اٹھاتا ہے؟ (یادگار)

(۲۱۵) روندی ہوئی ہے کوکبہ شہریار کی ۱ اترائے کیوں نہ خاک سر رہگذار کی
جب اسکے دیکھنے کے لئے آئیں بادشاہ ۲ لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی
بھوکے نہیں ہیں سیر گلستاں کے ہم ولے ۳ کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

شعر (۱) کوکبہ۔ ستارہ مجازاً انبوہ وغیرہ، شہریار، بادشاہ۔ مطلب یہ ہے کہ راستہ کی خاک کیوں ناز کرے کہ اس پر سے شاہی لشکر کا گزرا ہوا ہے۔

شعر (۲) مطلب صاف ہے۔

شعر (۳) ہوا کھانا، سیر کرنا۔ بھوکے نہیں ہیں یعنی خواہش سیر گلستان نہیں ہے۔ کھانا اور بھوکے کی رعایت رکھی گئی ہے

(۲۱۶) ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے ۱ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اسکی گردن پر ۲ وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دم بدم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن ۳ بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا ۴ اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے
مگر لکھوائے کوئی اسکو خط تو ہم سے لکھوائے ۵ ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے
ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی ۶ پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے
ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی ۷ وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ دودم نکلے
محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا ۸ اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

شعر (۱) خواہش پہ دم نکلنا، اسکے پورے ہونے کیلئے جلدی کرنا، چنانچہ کہتے ہیں کہ کیوں دم نکلا جاتا ہے۔ یا کیوں مرے جاتے ہو۔ یعنی کیوں جلدی کرتے ہو (یادگار غالب)،

شعر (۲) مطلب ہے کہ میرا قاتل میرا خون بہانے سے کیوں ڈرتا ہے یہی خون جو ہمیشہ میری آنکھوں سے جاری رہتا ہے اور اسے قرار ہی نہیں، اسکی گردن پر کیسے رہے گا؟

شعر (۳) مطلب صاف ہے۔

شعر (۴) بھرم کھل جائے یعنی پردہ فاش ہو جائے، اس شعر میں درازیٔ زلف اور قد کا چھوٹا ہونا ثابت کیا ہے

شعر (۵) یعنی جس طرح منشی لوگ کان پر عموماً قلم رکھا کرتے ہیں اسی طرح مرزا صاحب بھی منشی خط و کتابت بنکر بازاروں میں پھرتے ہیں کہ شاید مجھے لکھا پڑھا آدمی سمجھ کر کوئی مجھ سے خط لکھوائے اور ممکن ہے کہ میرے معشوق ہی کو خط لکھوائے اور مجھے کسی رقیب کا بھید معلوم ہو جائے۔

شعر (۶) یعنی جس طرح جمشید کی طرف شراب کی نسبت مشہور ہے اسی طرح میں کثرت مے نوشی سے ضرب المثل بنگیا ہوں۔

شعر (۷) مطلب ہے کہ جن لوگوں سے ہمیں امید تھی کہ ان سے اپنے مجروح دل کا علاج کرائینگے وہ ہم سے

بھی زیادہ زمانے کے ستائے نکلے۔ اور ہر ایک نے ہم سے یہی کہا کہ ع میرا فسانہ جفا تجھ سے بھی کچھ دراز ہے۔

شعر (۸) مطلب صاف ہے۔

شعر (۹) مطلب یہ ہے کہ حضرت واعظ جو ہمیشہ شراب کی مذمت بیان کیا کرتے تھے بھلا کسکو گمان ہو سکتا تھا کہ وہی شرابخانہ کے دروازے پر نظر آئیں گے لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب ہم نے یہ دیکھا کہ ہم تو میخانے کے دروازے سے نکل رہے تھے اور وہی حضرت واعظ داخل ہو رہے تھے۔

(۲۱۷) کوہ کے ہوں بار خاطر گر صدا ہو جائیے ۱ بے تکلف اے شرار جستہ کیا ہو جائیے
بیضہ آسا ننگ بال و پر ہے یہ کنج قفس ۲ از سر نو زندگی ہے گر رہا ہو جائیے

شعر (۱) کیا ہو جائیے یعنی شرار بنکر ایکدم فنا ہو جائیے۔ کیونکہ کوہ کے ہوں بار خاطر گر صدا ہو جائیے اس لحاظ سے کہ آواز پہاڑ سے ٹکرا کر واپس آ جاتی ہے۔ گویا اسکے بار خاطر ہی ہوئی جو واپس آ گئی۔ (قاضی)

شعر (۲) کنج قفس مجازاً دنیا۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح پرندے کی اصل زندگی انڈے سے نکلنے کے بعد شروع ہوتی ہے اسی طرح ہم اس بیضہ قالب سے اس قدر تنگ آ گئے ہیں کہ اگر ہم اس سے رہا ہو گئے یعنی مر گئے تو ہم سمجھیں گے کہ ہم کو از سر نو زندگی حاصل ہوئی۔ (قاضی)

(۲۱۸) مستی بہ ذوق غفلت ساقی ہلاک ہے ۱ موج شراب یک مژہ خوابناک ہے
جز زخم تیغ ناز نہیں دل میں آرزو ۲ جیب خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے
جوش جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد ۳ صحرا ہماری آنکھ میں اک مشت خاک ہے

شعر (۱) مطلب یہ ہے کہ ساقی کے انداز تغافل نے مستی کو بھی ہلاک کر دیا ہے اور شراب کی لہریں مژگاں خواب آلود بنی ہوئی ہیں۔

شعر (۲) جیب خیال مجازاً دل۔ مطلب یہ ہے کہ دل میں فقط یہی آرزو ہے کہ تیری تیغ ناز کے زخم کھاتے رہیں۔

شعر (۳) مطلب صاف ہے۔

(۲۱۹) لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی — قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

شعر (۱) مطلب یہ ہے کہ کشتۂ لبِ معشوق کس قیامت کی نیند سو رہا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام قُم باذن اللہ بھی کہتے ہیں تو یہ الفاظ جُھولا جُھلانے کا کام دیتے ہیں۔

(۲۲۰) آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے ۱ نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے
بزمِ مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا ۲ شیشے میں موجِ پری پنہاں ہے نبضِ بادہ سے

شعر (۱) مطلب یہ ہے کہ پانی کی صدا اور طوفان کا سیلاب آ رہا ہے اور نقشِ پا نے اپنے کان میں جادہ کی انگلی رکھ لی ہے

شعر (۲) موجِ شراب کو نبضِ پری تصور کیا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ محفلِ شراب کس کی چشمِ مست کے اثر سے وحشت کدہ بنی ہوئی ہے کہ موجِ بادہ نبضِ پری بن گئی ہے۔

(۲۲۱) ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنّا ۱ مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آئے

شعر (۱) یعنی میں تو اپنی تمنا کی نیرنگیوں کا تماشہ دیکھ رہا ہوں۔ تمنا کرنے سے مطلب برآری مقصود نہیں۔

(۲۲۲) سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر — مری قسمت میں یوں تصویر ہے شب ہائے ہجراں کی

شعر (۱) میری قسمت نامہ میں شبِ فراق کی تصویر اس طرح کھنچی ہوئی ہے کہ جیسے کاغذ پر لکھتے وقت سیاہی کی دوات ہی الٹ جائے اور وہ تمام تصویر سیاہ ہو جائے، شبِ فراق کی تاریکی کا نقشہ کھینچا ہے کہ جس میں کچھ سجھائی نہیں دیتا الغرض میری قسمت میں شبِ فراق کی سیاہ راتیں ہی لکھی ہیں۔

(۲۲۳) ہجومِ نالہ حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے ۱ خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے
تکلف برطرف ہے جانستانِ تر لطفِ بدخویاں ۲ نگاہِ بے حجابِ ناز تیغِ تیزِ عریاں ہے
ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی ۳ کہ صبحِ عید مجھکو برتر از چاکِ گریباں ہے
دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے ۴ کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دست گرداں ہے
غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو ۵ چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

شعر(۱) خس بدنداں ہونا۔ اظہار مغلوبیت ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے ہجوم نالہ میں جو حیرت فریاد سے عاجز ہوں۔ میری خاموشی سے ناراض نہ ہونا بلکہ اس کو میرا خس بدنداں ہونا سمجھ لے۔

شعر(۲) نگاہ تیغ ہے اور جب نگاہ بے حجاب ہوگئی تو تیغ عریاں ہوگئی، اور اس کا نگاہ لطف کرنا اور قاتل ہو گیا

شعر(۳) مطلب صاف ہے۔

شعر(۴) متقاضی [illegible] گرداں۔ وہاں جو ہاتھوں ہاتھ پھرتا ہے مطلب یہ ہے کہ اگر ساقی سے شراب لینا چاہتا ہے تو اس کو دینے کیلئے [illegible] کی نقد نقد کی ضرورت ہے، یہاں ادھار سے کام نہیں چلتا۔

شعر(۵) مرجان، مونگا اس کا درخت دریا میں ہوتا ہے۔ قلزم۔ دریا۔ صرصر۔ طوفان، آندھی۔ مطلب یہ ہے کہ بلا کی گود میں غم عاشق کی پرورش کرتا ہے یعنی عاشق کی زندگی غم سے ہے گویا جس طرح مرجان کی پرورش اور زندگی قلزم میں ہوتی ہے اسی طرح ہماری زندگی کا چراغ قلزم طوفان صرصر میں روشن رہتا ہے حالانکہ نہ تو پانی میں چراغ روشن رہ سکتا ہے اور نہ ہی آندھی میں۔

(۲۲۴) خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے ۱ نگاہ دل سے تری سرمہ سا نکلتی ہے
فشار تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم ۲ صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے
نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ ۳ کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

شعر(۱) ہماری جو خاموشیاں ہیں ان میں جو ادا نکلتی ہے وہ قابل تماشا ہے کیونکہ یار کی نگاہ سرمگیں ہمارے دل میں اتر گئی ہے اور ہم اسی لئے خاموش رہتے ہیں۔ سرمہ کھانے سے آواز بیٹھ جاتی ہے اس میں یہی رعایت مضمر ہے۔

شعر(۲) فشار۔ بھینچنا۔ غنچہ جو کہ تنگ اور خلوت پسند ہے اسلئے وہ باد صبا کو کوچۂ تنگ میں پاکر ایسا بھینچتا ہے کہ وہ شرم سے پسینہ پسینہ ہو جاتی ہے۔

شعر(۳) آب۔ تیزی یعنی جس دروازہ سے معشوق جھانکتا ہے وہ روزن نہیں ہے بلکہ تیغ نگاہ نے ایسا کاری زخم لگایا ہے کہ جس میں سے ہوا نکلتی ہے پھر سینۂ عاشق کی کیا ہستی ہے اس شعر میں آب سے ہوا کی رعایت بھی رکھی گئی ہے اور کیا

عجب ہے کہ مصنف نے ہوا کے معنی خواہش رکھے ہوں۔

(٢٢٥) حسن جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے ١ نافہ دماغ آہوئے دشتِ تتار ہے
کس جا سُراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا ٢ آئینہ فرشِ ششِ جہتِ انتظار ہے
ہے ذرہ ذرہ تنگیٔ جا سے غبارِ شوق ٣ گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے
دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ ۴ نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے
چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پر آب ٥ اے عندلیب وقت وداعِ بہار ہے
پیچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے ٦ وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے
بے پردہ سوئے وعدہ مجنوں گزر نہ کر ٧ ہر ذرے کے نقاب میں دلِ بیقرار ہے
اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں ٨ طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی ٩ اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

غفلت کفیلِ عمر و اسد ضامنِ نشاط
١٠- اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

شعر (١) شانہ کش، کنگھی کرنے والی۔ لیکن اس جگہ ہوا سے معشوق کی زلفِ مشکیں کا بکھرنا مراد ہے دشت تتار جس ملک کے آہوانِ صحرائی کے نافوں سے کستوری نکلتی ہے۔ مطلب صاف ہے۔

شعر (٢) مطلب یہ ہے کہ یا الٰہی حیرت کس کے جلوہ کا سراغ لگا رہی ہے کہ جس کے انتظار میں فرشِ شش جہت آئینہ بنا ہوا ہے۔

شعر (٣) یعنی غبارِ شوق دل میں تنگیٔ جا کی وجہ سے پسکر اور بھی ذرہ ذرہ ہو گیا ہے اگر ان ذروں کو پھیلا کر دام بنایا جائے تو تمام صحرا شکار ہو جائے گا۔ یعنی وہ دام تمام صحرا پر چھا جائے گا۔

شعر (۴) یعنی دل نے آنکھ پر دعوےٰ کیا ہے کہ اس لئے کیوں ایسے حسین قاتل کو دیکھا کہ جس نے میرا خون کر دیا آج اس کی پیشی ہے۔

شعر(۵) ایران میں رسم ہے کہ جب کوئی وطن چھوڑ کر سفر کو جاتا ہے تو آئینہ پر چند سبز پتے رکھ کر پانی چھڑکتے ہیں تاکہ وہ جلد بخیر واپس آئے۔ چنانچہ اس شعر میں بھی وہی مضمون ہے۔

شعر(۶) پیچ آپڑنے سے کسی بات کا نباہنا مراد ہوتا ہے۔ مطلب صاف ہے۔

شعر(۷) ذرہ کے جگمگانے کو دل کی بیقراری سے تشبیہ دی ہے مطلب ہے کہ صحرائے مجنوں کا ذرہ دل مجنوں کی بیتابی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

شعر(۸) اے بلبل! ایک مٹھی خار و خس کی اپنے آشیانہ کیلئے فراہم کر ورنہ پھر طوفان بہار میں تنکے ڈھونڈے سے نہیں ملیں گے۔

شعر(۹) تمثال، تصویر جس میں دنیا بھر کی حسرتیں و آرزوئیں بھری ہوں وہ آئینہ تصویر ہے کہ اگرچہ اس میں ایسی صفائی نہیں کہ جلوۂ معرفت ہو سکے لیکن یہ میسر کیا کم ہے۔ (نظم)

شعر(۱۰) کفیل، ضامن۔ غفلت نے عمر بھر کا ٹھیکہ لے لیا ہے اور اب ہمیشہ کی شادمانی کا ضامن ہو چکا ہے۔ اے مرگ ناگہاں تجھے کس بات کا انتظار ہے یعنی تو تو ایسے سامان غفلت کو اچانک آکر تباہ کیا کرتی ہے۔

(۲۲۶) آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے ۱ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
حسرت نے لا رکھا تری بزم خیال میں ۲ گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے
پھونکا ہے کس نے گوش محبت میں اے خدا ۳ افسون انتظار تمنا کہیں جسے
سر پر ہجوم درد غریبی سے ڈالیے ۴ وہ ایک مشت خاک کہ صحرا کہیں جسے
ہے چشم تر میں حسرت دیدار سے نہاں ۵ شوق عناں گسیختہ دریا کہیں جسے
درکار ہے شگفتن گلہائے عیش کو ۶ صبح بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے ۷
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

شعر (۱) میں تیرے جوبن کا حسن تو بیان کر ہی نہیں سکتا لیکن میں تجھے آئینہ ہی کیوں نہ لادوں کہ جسے دیکھ کر تو محوِ حیرت ہو جائے اور لوگ تیرا تماشہ دیکھیں۔

شعر (۲) بزمِ خیال یعنی عاشق کا دل۔ مطلب یہ ہے کہ میرا سویدائے دل ایک گلدستۂ نگاہ ہے جو تیری حسرتِ دیدار سے میرے دل میں پیدا ہو گیا ہے۔

شعر (۳) تمنائے شوق کو آستینِ انتظار تصور کیا گیا ہے۔ مطلب صاف ہے۔

شعر (۴) یعنی کثرتِ دردِ غربت سے تنگ آ کر بس اب صحرانوردی اختیار کیجئے۔

شعر (۵) شوقِ عناں گسیختہ۔ اشتیاقِ معشوق میں جس کی عنانِ صبر ٹوٹ چکی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ حسرتِ دیدارِ معشوق میں بفرطِ شوق میری چشمِ تر سے دریائے اشک جاری ہیں۔

شعر (۶) مطلب یہ ہے کہ عیش و مسرت کیلئے صبحِ بہار کی ضرورت ہے اور وہ صبحِ بہار شیشۂ شراب کی روئی میں پنہاں ہے۔

(۲۲۷) شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے ۱ داغِ دلِ بیدرد نظر گاہِ حیا ہے
دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار ۲ آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے
شعلے سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی ۳ جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے
تمثال میں تیرے ہے وہ شوخی کہ بصد شوق ۴ آئینہ بہ اندازِ گل آغوش کشا ہے
قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ ۵ اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے
خو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو ۶ معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے
مجبوری و دعوائے گرفتاریِ اُلفت ۷ دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے
معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ ۸ تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے
اے پرتوِ خورشیدِ جہانتاب ادھر بھی ۹ سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد ۱۰ یارب اگران کردہ گناہوں کی سزا ہے

بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ
۱۱- کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

شعر(۱) مطلب ہے کہ گل ولالہ پر قطرات شبنم کا ہونا خالی از علت نہیں کیونکہ لالہ خیال کرتا ہے کہ میرے دل میں داغ تو ہے لیکن حقیقی درد وسوز نہیں اس لئے یہ شبنم عرق ندامت ہے۔

شعر(۲) یعنی حسرتِ دیدار کی کشمکش نے میرے دلکو بیکر اس کا خون کر دیا ہے اس طرح سے میرا دل آئینہ حنا بنگیا ہے۔

شعر(۳) میرا دل افسردہ ہو کر رہ گیا ہے یعنی اسے جلنے کی حسرت ہے کہ میں کیوں نہ جل گیا اور اس جلنے سے جلا ہے کہ اگر شعلہ بھی اسے جلانا چاہتا تو اس قدر نہ جلتا۔

شعر(۴) تیری تصویر کے عکس میں وہ شوخی و دلفریبی ہے کہ آئینہ نے بفرطِ شوق پھول کی طرح اپنی آغوش کھولدی ہے۔

شعر(۵) مطلب ہے کہ قمری جو ایک کفِ خاکستر سے زیادہ اور بلبل جو ایک قفس عنصری سے زیادہ نہیں ہے ان کے جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف انکے چہکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔

شعر(۶) مطلب ہے کہ اے ساکت وصامت رہنے والے معشوق تیری عادت نے میرے جنون وشوق کو افسردہ کردیا ہے معشوق ہو کر ایسی بےحسی زیبا نہیں۔

شعر(۷) مطلب ہے کہ کسی سنگین مزاج محبوب کو دل دیکر پیمان وفا پورا کرتے ہیں جس طرح پتھر کے نیچے ہاتھ دب جائے اور مجبوراً نکل نہ سکے۔

شعر(۸) تیری خون آلودہ تیغ ستم کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ تونے شہیدانِ گزشتہ کو کس بیرحمی سے قتل کیا ہے گویا تیری تلوار ایک آئینہ ہے۔

شعر(۹) یعنی ہم پر بھی اے مہروش معشوق نظر کرم کر۔ پرتو اور سایہ کی لفظی رعایت اور وقت پڑنا محاورہ کی بات ہے۔

شعر(۱۰) مطلب صاف ہے۔ شعر(۱۱) یعنی جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے۔

(۲۲۸) منظور تھی یہ شکل تجلّی کو نور کی ۱ قسمت کھُلی ترے قد و رُخ سے ظہور کی
اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں ۲ پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی
واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو ۳ کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی
لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اُٹھا ۴ گویا ابھی سُنی نہیں آواز صُور کی
آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج ۵ اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی
گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں ۶ کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب ۷ آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر ۸ کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی
غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
۹ حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

شعر (۱) تجلّی۔ جلوہ۔ نور خداوندی مطلب ہے کہ خدا کو اپنے نور کا جلوہ دکھانے کیلئے تیری صورت کا منظور تھا۔

شعر (۲) چونکہ خون سے کفن لالہ زار بنا ہوا ہے اسلئے اس میں کروڑوں بناؤ ہیں اور ایک شرعی مسئلہ بھی ہے۔ کہ جنت اور حوریں شہیدوں کا انتظار کرتی ہیں۔

شعر (۳) جنت میں جو شراب ملیگی اُسے شراب طہور کہتے ہیں۔ طہور معنی پاک۔

شعر (۴) صور۔ وہ قرنا جو فرشتہ اسرافیل قیامت کے دن بجائے گا اور زمین و آسمان فنا ہو جائینگے۔ مطلب ہے کہ قاتل الٹا مجھ سے لڑتا ہے کہ قیامت کا دن ہو گیا ہے اور یہ کشتۂ تیغ جفا داور محشر کے سامنے قاتل کو مجرم گردانے گا۔

شعر (۵) مطلب صاف ہے۔ شعر (۶) یعنی پہلے کعبہ میں بُت ہی تو ہوتے تھے۔

شعر (۷) جرأت و ہمت کا مضمون ہے۔

شعر (۸) یعنی کسی آدمی سے تو نرمی سے گفتگو کرنی چاہیئے۔

شعر (۹) اس شعر سے مرزا کی کمال شوخی طبع ظاہر ہوتی ہے یہ غزل اس زمانہ میں لکھی تھی جبکہ بہادر شاہ مرحوم کا ارادہ حج کو جانے کا تھا مرزا اس سفر میں بادشاہ کے ساتھ جانے کا کمال اشتیاق ظاہر کرتے ہیں یہاں تک کہ اس کیلئے منت مانتے ہیں کہ حج کا ثواب حضور کی نذر کرونگا۔ ادھر سفر حج کا وہ اشتیاق اور ادھر حج کے ثواب کی یہ بے قدری (یادگار غالب)

(۲۲۹) غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے ۱ یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ ۲ ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہ جام بہت ہے
نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں ۳ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی ۴ پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے
ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں ۵ پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے
زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے ۶ آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے
ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو ۷ انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ ۸ رہنے دے ابھی یاں کہ مجھے کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
۹ شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

شعر (۱) یعنی رنج زیادہ ہے اور شراب کم ہے جس سے غم غلط ہوتا۔

شعر (۲) دُردِ تہ جام۔ تلچھٹ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ساقی مجھے تلچھٹ بھی عنایت کرے تو میں اسی پر صابر و قانع رہونگا لیکن ساقی سے یہ بات کہتے شرم آتی ہے کہ کہیں وہ مجھے کم ظرف نہ سمجھے۔ یہی مضمون ایک شاعر اس طرح ادا کرتا ہے

لے رہے ہیں اور تو ساغر پہ ساغر بار بار
اور ہمیں کافی ہے ساقی کی نگاہ چشم مست

شعر (۳) یعنی ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را۔

شعر (۴) کہتے ہیں میرے دل میں زہد اور پارسائی کی اگرچہ اس میں ریاکاری نہو کوئی وقعت نہیں ہو سکتی کیونکہ [illegible] طمع کیا ہے۔ مطلب ہے کہ نیکی و پارسائی بلا خیال جزا ہونی چاہیئے۔

شعر (۵) اہل خرد۔ عقلمند۔ یعنی جو لوگ اپنے آپ کو بہت بڑے فلسفی کہتے اور عقل و دانش کے پتلے ہوتے ہیں وہ بھی عامیانہ رسوم کے تو پابند ہیں اور اپنی روشن خیالی پر نازاں ہیں۔

شعر (۶) یعنی مجھے چاہ زمزم پر ہی بیٹھا رہنے دو۔ تاکہ جامۂ احرام جو شراب پی پی کر آلودہ ہو چکا ہے۔ اُس کے دھبے صاف کر لوں۔

شعر (۷) ابرام۔ ضد کرنا۔ مطلب ہے کہ جب میں بھی اپنی ہٹ اور ضد کا پورا ہوں اور انہیں کبھی کوئی انکار نہیں تو پھر وصل سے شاد کام نہ ہونا تعجب اور غضب کا مقام ہے۔

شعر (۸) یعنی اے اجل ذرا دم لے اور مجھے اپنی مصیبتوں پر دنیا میں تھوڑے دن اور خون کے آنسو رو لینے دے۔

شعر (۹) یعنی شراب خواری کی وجہ سے بدنام ہے۔

(۲۲۰) مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے ۱ جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو ۲ عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم ۳ برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے
پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفس ۴ مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق ۵ سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے
پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخونِ دل ۶ سازِ چمن طرازیِ داماں کئے ہوئے
باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب ۷ نظارۂ خیال کا ساماں کئے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے ۸ پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے
پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب ۹ عرضِ متاعِ عقل دل و جاں کئے ہوئے

ڈھونڈے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال ۱۰ صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا ۱۱ جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کئے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس ۱۲ زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو ۱۳ سُرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ ۱۴ چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں ۱۵ سر زیرِ بارِ منّت درباں کئے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن ۱۶ بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کئے ہوئے
غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
۱۷۔ بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

شعر (۱) قدح، شراب کا پیالہ۔ مطلب ہے کہ اہل محفل شراب پیتے اور اُن کے چہرے سُرخ ہو جاتے ہیں جس سے بزم میں چراغاں کا سماں نظر آتا ہے۔

شعر (۲) مطلب صاف ہے۔

شعر (۳) وضع احتیاط یعنی گریبان چاک کرنے میں احتیاط کرنا۔

شعر (۴) مطلب صاف ہے۔ شرر چنگاری۔ نفس۔ سانس۔

شعر (۵) یعنی عشق پھر زخموں پر نمک افشانی کرنے لگا ہے۔

شعر (۶) یعنی دامن پر گلکاری کرنے کے لئے قلم مژگاں خون سے تر ہو گیا۔

شعر (۷) یعنی دل میں پھر خیال معشوق اور آنکھ میں پھر خواہش دید پیدا ہوتی ہے۔

شعر (۸) طواف، کعبۃ اللہ کے گرد پھرنا۔ مطلب ہے کہ غرور اور وضعداری کے بتخانہ کو توڑ کر کوچہ عشق کے طواف کو چلا ہوں۔

شعر (۹) یعنی دل کا شوق پھر چاہتا ہے کہ اگر کوئی حسین خریدار ہو تو میں دل و جان، عقل و خرد کا مال و اسباب فروخت کر ڈالوں۔

شعر (۱۰) گل و لالہ سے حسین مراد ہیں۔ مطلب صاف ہے۔

شعر (۱۱) یعنی یہ چاہتا ہوں کہ پھر کوئی معشوق میرے نام خط لکھے اور جس کی سُرخی محبت نامہ ہو اور میں اس فریب محبت پہ جان قربان کر دوں۔

شعر (۱۲-۱۳-۱۴-۱۵-۱۶) سلسلہ وار ایک ہی صاف مضمون ہے۔

شعر (۱۷) جوش اشک رونا۔ تہیہ۔ ارادہ۔

(۲۲۳) نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لئے ۱ رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے
بلا سے گر مژہ یار تشنہ خوں ہے ۲ رکھوں کچھ اپنی بھی مژگاں خونفشاں کیلئے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر ۳ نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے
رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفت رشک ۴ بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے
فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں ۵ دراز دستی قاتل کے امتحاں کیلئے
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر ۶ کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے ۷ اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے
بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل ۸ کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے
دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے ۹ بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے
زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا ۱۰ کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے
نصیر دولت و دیں اور معین ملت و ملک ۱۱ بنا ہے چرخ بریں جس کے آستاں کیلئے
زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرائش ۱۲ بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے ۱۳ سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے
ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
۱۴۔ صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کیلئے

شعر (۱) مطلب یہ ہے کہ میری جان زار کیلئے معشوق کا ستم امن کی خوشخبری ہے کیونکہ اس کے انداز ستم دیکھ کر آسمان بھی اپنے ستم بھول گیا ہے ؎

ترے انداز اے ظالم حسینوں سے نرالے ہیں   ستم کے اے ستم آرا عجب پہلو نکالے ہیں

شعر (۲) اگر مژۂ یار خونخوار ہے تو میری مژہ بھی خونبار ہے۔

شعر (۳) یعنی ایسی ہمیشہ کی زندگی کس کام کی کہ اے حضرت خضر چوروں کی طرح چھپتے پھرتے اور کسی کو نظر نہیں آتے ہو۔

شعر (۴) یعنی اگر تیری ادا بلا تھی تو کاش میرے ہی لئے ہوتی لیکن یہ دوسری بلا مجھ سے برداشت نہیں ہوتی کہ دوسرے لوگ بھی اس بلا میں شریک ہوں۔ یہ بلا رشک ہے۔

شعر (۵) مطلب صاف ہے۔

شعر (۶) یعنی میری کوشش اور تدبیر ایسی ہی بیکار ہوتی ہے کہ جیسے کوئی مرغ اسیر قفس میں آشیانے کے لئے خس و خاشاک جمع کرے۔

شعر (۷) غالب نے نئے مضمون کو کہ میں جو معشوق کے مکان پر پہنچا تو اول خاموش کھڑا رہا پاسبان سائل سمجھ کر کچھ نہ کہہ سکا جب معشوق کے دیکھنے کا حد سے زیادہ شوق ہوا تو پاسبان کے قدموں پر گر پڑا، اب اس نے جانا کہ اس کا مطلب کچھ اور ہے اسلئے میرے ساتھ وہ سلوک کیا جو ناگفتہ بہ ہے۔ اس شعر میں ادا کیا ہے (حالی)

شعر (۸) مطلب یہ ہے کہ مدح و منقبت کیلئے غزل ایک تنگ کوچہ ہے اسلئے اس غزل میں قصیدہ کا انداز پیدا کرتا ہوں۔

شعر (۹) یعنی عیش و عشرت تو دراصل صرف میرے ممدوح تجمل حسین خاں کیلئے قدرت نے وضع کیا تھا۔ لیکن

اس خیال سے بعض لوگوں کو اس میں سے کچھ حصہ دے دیا گیا ہے تاکہ میرے ممدوح کو نظر بد نہ لگ جائے۔

شعر (۱۰) مطلب صاف ہے۔

شعر (۱۱) نصیر و معین۔ معاون و مددگار۔

شعر (۱۲) مرزا نے اپنے ممدوح کو ایک ایسے کمال کی صفت سے موصوف کیا ہے جو تمام کمالات کی جڑ ہے یعنی وہ ہر چیز کو کامل تر اور افضل تر حالت میں دیکھنا چاہتا ہے اسلئے ہر شے اپنے تئیں کامل تر حالت میں اسکو دکھانا چاہتی ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر یہی حالت ہے تو شاید آسمان کی زیب و زینت کیلئے اور ستارے پیدا کئے جائیں اس پر سوائے اس کے کہ کوئی منطقی اعتراض کیا جائے اور کسی طرح کی گرفت نہیں ہو سکتی۔ (مقدمہ شعر و شاعری)

شعر (۱۳) سفینہ۔ کشتی۔ بحر بیکراں جس دریا کا کنارہ نظر نہ آتا ہو یعنی جس طرح دریا کو کشتی کے سوا عبور کرنا محال ہے اسی طرح اس غزل میں مدح ممدوح پوری نہیں ہو سکتی۔

شعر (۱۴) یعنی غالب نے ایک جدید انداز میں باریک مضامین لکھے ہیں۔ دیگر شعرا کو بھی یہی روش اختیار کرنی چاہیئے۔

حکیم مومن خاں مرحوم نے بھی اس زمین میں ایک معرکہ آرا غزل لکھی ہے جس کے بعض اشعار ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

دعا بلا تھی شب ہجر میری جاں کے لئے
سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لئے
نہ دل رہا نہ جگر دونوں جل کے خاک ہوئے
رہا ہے سینہ میں کیا چشم خونفشاں کیلئے
اگر امیر نہ ہمسایہ ہو تو خانہ یاس
بہشت ہے ہمیں آرام جاوداں کے لئے
وہ مول لیتے ہیں جس دم کوئی نئی تلوار
لگاتے پہلے مجھی پر ہیں امتحان کے لئے
ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کے لئے

قصائد

قصیدۂ اول در منقبت!

ساز یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار ۱ سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار
ہستیِ بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ ۲ ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار
سبز ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ ۳ تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار
مستیِ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت ۴ کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار
کوہ و صحرا ہمہ معموریِ شوقِ بلبل ۵ راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار
سونپے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم ۶ سرِ نوشتِ دو جہاں ابر بہ یک سطرِ غبار
کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بانداز ہلال ۷ قوتِ نامیہ اسکو بھی نہ چھوڑے بیکار
کفِ ہر خاک بگردوں شدہ قمری پرواز ۸ دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار
میکدے میں ہو اگر آرزوئے گل چینی ۹ بھول جا یک قدحِ بادہ بطاقِ گلزار
موجِ گل ڈھونڈ بخلوت کدۂ غنچۂ باغ ۱۰ گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار
کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر ۱۱ سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار
لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ ۱۲ طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار
وہ شہنشاہ کہ جس کے پئے تعمیرِ سرا ۱۳ چشمِ جبریل ہوئی غالبِ خشتِ دیوار
فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور ۱۴ رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار
سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام ۱۵ رفعتِ ہمتِ صد عارف یک اوجِ حصار
واں کہ خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ ۱۶ وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار
خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عرفا ۱۷ چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار

ذرہ اس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز ۱۸ گرد اس دشت کی امید کو احرامِ بہار
آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیِ ناز عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موج بہار

مطلعِ ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار ۱ دلِ پروانہ چراغاں پرِ بلبل گلزار
شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز ۲ ذوق میں جلوے کے تیرے بہ ہوائے دیدار
تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں ۳ سلکِ اختر میں مہِ نو مژۂ گوہر بار
ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مُہرِ نماز ۴ ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار
مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبی ۵ جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار
جوہرِ دستِ دعا آئینہ یعنی تاثیر ۶ یک طرف نازشِ مژگان و دگر سو غمِ خار
مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبالِ نگاہ ۷ خاکِ در کی ترے جو چشم نہ ہو آئینہ دار
دشمنِ آلِ نبی کو بہ طربِ خانۂ دہر ۸ عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار
دیدۂ تا دل اسدؔ آئینہ اک پرتوِ شوق
۹- فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

شعر (۱) مطلب ہے کہ فیضِ چمن سے باغ کا کوئی ذرہ بھی بیکار نہیں ہے چنانچہ لالۂ بیداغ کا سایہ دلِ بہار کا سیاہ نقطہ بنا ہوا ہے اور اسی لئے اسے بیداغ کہا ہے۔

شعر (۲) تیغ کہسار۔ پہاڑ کی چوٹی۔ جوہرِ تیغ کہسار سے مراد سبزۂ کوہ ہے مطلب ہے کہ بادِ صبا کی مستی سے سبزۂ کوہ بھی شیشے کے ریزے بنا ہوا ہے۔ شیشے کی کرچوں کو بوجہ سبزی سبزے سے تشبیہ دی ہے۔

شعر (۳) پلنگ۔ چیتا۔ مطلب ہے کہ بہار کے اثر سے چیتے کے سیاہ داغ سبز ہو گئے ہیں اور ریشۂ نارنج

کی طرح شرارے سُرخ ہو گئے ہیں۔

شعر (۴) انشار۔ نچوڑنا، بھینچنا۔ مطلب ہے کہ مستی ابر سے حیرت تک مسرور ہو رہی ہے کیونکہ ایسی حالت میں جبکہ ابرِ بہار دونوں جہان کو آغوش میں لئے ہے اور ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے دین و دنیا کا غم بھول جانا ممکن ہے۔

شعر (۵) مطلب ہے کہ آمدِ بہار سے پہاڑ اور جنگل بلبل کے ترانوں سے آباد و ویران اور سنسان راستے پھولوں کی شگفتگی سے بارونق معلوم ہوتے ہیں۔

شعر (۶) مطلب ہے کہ جس طرح ایک یتیم کی خاک آلودہ پلکوں سے مدتوں آنسوؤں کی جھڑی لگی رہتی ہے اُسی طرح فیضِ ہوا کے اثر سے غبار میں بھی بادل کی قوت پیدا ہو گئی ہے۔

شعر (۷) قوت نامیہ۔ جو جسمِ انسانی کے طول و عرض اور عمق کو بڑھاتی ہے۔ مطلب ہے کہ قوت نامیہ کا وہ زور ہے کہ اگر ایک ناخن تراش کر پھینکدیا جائے تو وہ اسکو ہلال سے بدر بنا دیتی ہے۔

شعر (۸) اگر خاک کی ایک مٹھی اڑتی ہے تو وہ قمری معلوم ہوتی ہے اور اگر کاغذ کو جلایا جائے تو اس میں جو نقطے پڑ جاتے ہیں وہ تصویرِ دام بن جاتے ہیں، اور اس میں سینکڑوں طاؤس نظر آتے ہیں۔

شعر (۹) یعنی اگر میخانہ میں پھول توڑنے کی خواہش ہے تو ایک ساغرِ مے طاقِ گلشن میں رکھ کر بھول جا پھر بہار میں تو دیکھے گا کہ قوت نامیہ اس ایک پیالہ کے ہزاروں پیالے بنا دیگی گویا گلشن میں ایک میکدہ بن جائیگا۔

شعر (۱۰) یعنی فیضِ ہوا گوشۂ میخانہ کو غنچہ اور پگڑی کو موجِ گل بنا دیگا۔

شعر (۱۱) مطلب ہے کہ اگر مانی (مصور) اندیشۂ چمن کی تصویر اتارے تو تاثیرِ بہار سے خطِ پرکار سبزۂ نوخیز کی طرح سبز ہو جائے۔

شعر (۱۲) مطلب ہے کہ بادشاہ کی مدح سرائی کیلئے لعلِ کوہ طوطیِ سبزۂ کہسار کی چونچ بن گیا ہے۔

شعر (۱۳) وہ شہنشاہ کہ جسکے قصر کی تعمیر کیلئے اینٹیں چشمِ جبریل کے سانچے میں بنائی گئی ہیں۔

شعر (۱۴) ساز۔ سامان، طناب۔ وہ ڈوری کہ جس سے معمار دیوار کی کجی اور راستی ناپتے ہیں۔ مطلب ہے کہ اس قصرِ شاہی کی تعمیر میں فلک العرش پانی بھر کر لانے کیلئے دوشِ مزدور کا ایک مٹکا ہے اور رشتۂ فیضِ ازل گویا معمار کی ڈوری ہے۔

شعر (۱۵) یعنی قصر ممدوح پشت لب بام کا ایک خط سبزی میں سبزۂ نو چمن کے برابر ہے اور اس کا قلعہ بلندی میں سو عارفوں کی ہمت کے برابر ہے۔

شعر (۱۶) مروحہ۔ پنکھا۔ مطلب یہ ہے کہ جس کسی کو وہاں کی خس و خاشاک سے ایک تنکا بھی مل جائے پھر اُسے پری کے پروں کے پنکھے کی حاجت نہیں رہتی۔

شعر (۱۷) یعنی عارفوں کی سیر کا باعث صرف خاک صحرائے نجف ہے اور اس خاک پر جو اُن کے نقش قدم پڑتے ہیں وہ گویا آئینہ ہیں جس میں بخت بیدار کی تصویر نظر آتی ہے۔

شعر (۱۸) یعنی گرد نجف کا ہر ذرہ خورشید کیلئے آئینہ نما ہے اور دشت نجف کی گرد امید کے لئے فصل بہار کا جامۂ احرام ہے۔

شعر (۱۹) یعنی ایجاد کو اسکی خاک پاک کی آفرینش پر ناز ہے پس نجف کی ہر موج غبار گویا آفرینش و ایجاد کی انگڑائی ہے جس کے ذریعہ وہ بہ زباں حال یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم کو اس شراب فخر و ناز (یعنی ناز ایجاد نجف) کی خواہش ہے، خلاصہ کلام یہ کہ اس سرزمین کو پیدا کرکے آفرینش کو بار بار ناز ہوتا ہے (حسرت)

مطلع ثانی

شعر (۱) چونکہ پروانہ کی معشوقہ شمع ہے اور بلبل کا معشوق پھول۔ اس لئے تیرے اثر سے دل پروانہ چراغاں اور پر بلبل گلزار بنا ہوا۔

شعر (۲) یعنی تیرے جلوہ کے ذوق اور تیرے دیدار کے شوق میں تمام آئینہ خانہ اڑنے لگ جائے۔

شعر (۳) مطلب ہے کہ شہیدانِ کربلا کے غم میں جو آنسو نکلتے ہیں وہ موتی کے ہم رتبہ ہیں۔

شعر (۴) مہر نماز۔ سجدہ گاہ، استظہار۔ مددگار ہونا۔ یعنی تیرا نقش پا عبادت کے لئے سجدہ گاہ اور تیرا حوصلہ ریاضت کے لئے پشت پناہ ہے۔

شعر (۵) مطلب صاف ہے۔

شعر (۶) مطلب ہے کہ میرے ممدوح کی تاثیر دعا ایک طرف مژگان اشک آلود کے لئے مایۂ ناز اور دوسری خار غم کے لئے باعث ملال ہے۔

شعر (۷) مطلب یہ ہے کہ اگر آنکھ تیرے در کے خار کی آئینہ دار نہ ہو تو آنکھ کی پتلی نگاہ فتح مندی کا ماتم خانہ بن جائے۔

شعر (۸) مطلب یہ ہے کہ یا الٰہی دشمن آلِ نبی کے حق میں عشرت خانۂ دنیا کا ہر طاق دیوار خمیازۂ سیلابِ بلا ہو جائے یعنی ان کو کبھی مسرت حاصل نہ ہو۔

شعر (۹) یعنی آنکھ سے دل تک اسد انوار شوق کا آئینہ بنا ہوا ہے اور اسی وجہ اور اسی فیض سے اس کا خط ساغر شوق بادۂ معانی سے لبریز ہے۔

قصیدہ دوم

در منقبت

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ۱ ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں
بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق ۲ بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم ۳ لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں
نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت ۴ سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم ۵ دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں
مثلِ مضمونِ وفا باد بدستِ تسلیم ۶ صورتِ نقشِ قدم خاک بہ فرقِ تمکیں
عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس ۷ وصلِ زنگارِ رخِ آئینۂ حسنِ یقیں
کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب ۸ بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں
کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز ۹ کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں
سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن ۱۰ نہ سر و برگِ ستائش نہ دماغِ نفریں
کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ ۱۱ یک قلم خارجِ آداب و وقار و تمکیں
نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر ۱۲ یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

مظہرِ فیضِ خدا جان و دلِ ختمِ رسل ۱۳ قبلۂ آلِ نبی کعبۂ ایجادِ یقیں
ہے وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرمِ خرام ۱۴ ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں
جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اُس کا جس جا ۱۵ وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں
نسبتِ نام سے ہی اسکے یہ رتبہ کہ رہے ۱۶ ابدا پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں
فیضِ خلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا ۱۷ بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں
برشِ تیغ کا اسکی ہے جہاں میں چرچا ۱۸ قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں
کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے ۱۹ رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بتخانۂ چیں
جاں پناہا دل و جاں فیض رسانا شاہا ۲۰ وصیِ ختمِ رسل تو ہے بفتوائے یقیں
جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر ۲۱ نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں
کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب ۲۲ شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں
آستاں پہ ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ ۲۳ رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں
تیرے در کے لئے اسبابِ نثار آمادہ، ۲۴ خاکیوں کو جو خدا نے دیئے جان و دل و دیں
تیری مدحت کیلئے ہیں دل و جاں کام و زباں ۲۵ تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں
کس سے ہو سکتی ہے مداحیٔ ممدوحِ خدا ۲۶ کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں
جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسد ۲۷ کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
شوخیٔ عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب ۲۸ ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ یقیں
دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول ۲۹ کہ اجابت کہے ہر لفظ پہ سو بار آمیں
غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز ۳۰ کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں
طبع کو الفتِ دلدل میں یہ سرگرمیٔ شوق ۳۱ کہ جہاں تک چلے اُس سے قدم اور مجھ سے جبیں
دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا ۳۲ نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں
صرفِ اعدا اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ ۳۳ وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوسِ بریں

شعر (۱) مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ہر ایک چیز مظہر ذات باری ہے اور تمام عالم اسکی خود بینی کا آئینہ ہے۔

شعر (۲) تماشا گاہ عالم کو بہت بیدلی سے دیکھا گیا نہ تو اس سے کوئی عبرت حاصل ہوئی اور نہ ہی کوئی لذت یعنی نہ تو دینی فائدہ حاصل ہوا نہ دنیوی۔

شعر (۳) ہرزہ۔ بیہودگی۔ زیر۔ پست آواز۔ بم۔ بلند آواز۔ مجازاً زیر ہستی۔ اور بم عدم۔ مطلب یہ ہے کہ نغمہ ہائے فنا و بقا بیہودہ ہیں اور تمکین و جنون میں تمیز بھی لغو ہے اور یہ سب بیکار چیزیں بلکہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔

شعر (۴) فی زمانہ نقش معنی سے یعنی اس کے دعویٰ سے اپنے ظاہر کی آراستگی اور ذکر و عبادت سے ذوق تحسین کا کام لیا جاتا ہے۔

شعر (۵) لاف۔ شیخی۔ مطلب یہ ہے کہ دنیاوی معاملات میں دعویٔ فرزانگی غلط ہے اور عبادت میں امید نفع فضول۔ کیونکہ دونوں جہان ایک ساغر غفلت کی تلچھٹ ہیں۔

شعر (۶) بادبدست، لاحاصل، فرق، سر کی مانگ۔ یعنی وفا کی طرح تسلیم و رضا سے کوئی فائدہ نہیں اور نقش پا کی طرح تمکین و خودداری سے ذلت ہی نصیب ہوگی۔

شعر (۷) یعنی فی زمانہ دیوانہ پن کا نام عشق ہے اور اہل یقین کی نگاہ میں آئینہ یقین کا زنگ وصل ہے۔

شعر (۸) یعنی فرہاد اپنے رقیب (خسرو) کی عشرت گاہ کا ایک کھنبو کا مزدور تھا اور کوہ بے ستون شیریں کے خواب گراں یعنی تغافل کا نمونہ۔

شعر (۹) مطلب صاف ہے۔

شعر (۱۰) یعنی اہل جہاں کے نغموں کو سن تو لیتا ہوں لیکن اتنی طاقت اور اتنا دماغ نہیں کہ ان کی تعریف یا مذمت کرسکوں۔

شعر (۱۱) معاذ اللہ میں بھی کیا لغو گو ہوں کہ مجھ کو آداب وقار و تمکین کا ذرا بھی لحاظ نہیں ہے یہاں سے اب قصیدہ کی تخلیص یا گریز شروع ہوتی ہے۔

شعر (۱۲) لاحول، نہیں ہے طاقت، مجازاً کلمہ بیزاری و نفرت، مطلب یہ ہے کہ اے دل باتیں لکھنے والے قلم اب نقش لاحول لکھ اور باطل کا ورد کرنا کہ تجھے اس ہذیان گوئی اور وساوس شیطانی کی مصیبت سے نجات حاصل ہو۔

اس شعر میں ایک عجیب نکتہ ہے جس کی طرف کسی شارح کا ذہن منتقل نہیں ہوا یعنی لاحول الخ میں اسم علی بھی آتا ہے جو اللہ تبارک تعالےٰ کا اسم ہے اور مرزا صاحب کے ممدوح حضرت علی کا بھی اسم ہے اب خود فرمایئے کہ شعر کی شان کس قدر بلند ہو گئی ہے۔

شعر (۱۳) یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ فیض الٰہی کے مظہر ہیں اور حضرت خاتم النبیئین صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ہیں۔ آل نبی کے قبلہ اور اہل یقین کے کعبہ ہیں۔

شعر (۱۴) گروہ مصوّروں کا خاکہ۔ گردہ تصویر زمین یعنی کرۂ زمین مطلب یہ ہے کہ جہاں وہ سرمایہ ایجاد عالم سرگرم خرام ہو وہاں کی ہر کف خاک ایک کرۂ زمین بن سکتی ہے۔

شعر (۱۵) جس جگہ ان کا نقش قدم پڑے وہ زمین دین و دنیا کے ناموس کا باعث ہے۔

شعر (۱۶) یہ اسی کے نام کی نسبت سے زمین کو رتبہ حاصل ہے کہ ہمیشہ زمین کے ناز اٹھانے کیلئے پشت فلک خم رہتی ہے حضرت علی کی کنیت ابوتراب ہے اور تراب مٹی کو کہتے ہیں۔

شعر (۱۷) مطلب صاف ہے۔

شعر (۱۸) برش تیغ۔ تلوار کی کاٹ۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ اس کی برش تیغ کا تذکرہ ہے خوف ہے کہ کہیں سررشتہ ایجاد ہی نہ کٹ جائے۔

شعر (۱۹) مطلب صاف ہے۔

شعر (۲۰) وصی جس شخص کو وصیت کی گئی ہو یعنی تو حضرت خاتم النبیئیں کا یقیناً وصی ہے۔

شعر (۲۱) ناصیہ۔ پیشانی۔ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھے پر سوار ہو کر فتح مکہ کے دن حضرت علی نے کعبۃ اللہ کے بت توڑے تھے۔ مطلب صاف ہے۔

شعر (۲۲) واجب، خداوند تعالیٰ۔ یعنی تیری مدح خدا کے سوا کوئی نہیں کر سکتا جس طرح کہ شعلہ شمع ہی شمع کی زینت کا اظہار کر سکتا ہے۔

شعر (۲۳) یعنی تیرا سنگ آستان ایسا ہے جس میں حضرت جبریل کے سجدوں کے نشان ہیں اور وہ نشان گویا اس آئینہ کے جوہر ہیں۔

شعر (۲۴) مطلب صاف ہے۔

شعر (۲۵) یعنی تیری منقبت کیلئے دل وجان کام و زباں بن گئے ہیں اور تجھے تسلیم کہنے کیلئے لوح و قلم دست و جبیں ہو گئے ہیں۔

شعر (۲۶) مطلب صاف ہے۔

شعر ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، اسد اللہ لقب حضرت علی شیر خدا۔ اجابت، قبولیت، شبیر۔ لقب حضرت امام حسین علیہ السلام۔ مطلب صاف ہے۔

شعر (۳۱) دُلدُل، حضرت علی کا گھوڑا، یعنی ایسا شوق ہو کہ وہ جہاں قدم رکھے میں اپنی پیشانی کو اُس کیلئے فرشِ راہ بنا دوں۔

شعر (۳۲) میرے دل کو الفت ممدوح سے نسبت ہو اور میرے سینہ کی فضا توحید ہو یعنی دل میں ہو جوشِ ولا اور سینہ میں نورِ عرفاں"۔

شعر (۳۳) دشمنوں کیلئے دوزخ کا دھواں اور شعلے ہوں اور دوستوں کیلئے فردوس کے گل و سنبل ہوں

قصیدہ سوئم

بادشاہ ظفرؒ کی مدح میں عید الفطر کے موقع پر لکھا گیا

ہاں مہِ نو سنیں ہم اُس کا نام ۱ جسکو تو جُھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح ۲ یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب ۳ بندہ عاجز ہے گردشِ ایام
اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا ۴ آسماں نے بچھا رکھا ہے دام
مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص ۵ حبذا اے نشاطِ عامِ عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے ۶ لیکے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا ۷ صبح جو جائے اور آئے شام

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا ۸ تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے ۹ مجھ کو سمجھا ہے تو کہیں نمّام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں ۱۰ ایک ہی ہے امید گاہ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش ۱۱ غالبؔ اس کا مگر نہیں ہے غلام
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو ۱۲ تب کہا ہے بطرزِ استفہام
ق مہر تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ ۱۳ قرب ہر روزہ بر سبیلِ دوام
تجھ کو کیا پایۂ روشناسی کا ۱۴ جز بتقریبِ عیدِ ماہِ صیّام
جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو ۱۵ پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن ماہتاب بن میں کون ۱۶ مجھ کو کیا بانٹ دیگا تو انعام
میرا اپنا جدا معاملہ ہے ۱۷ اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخشش خاص ۱۸ گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فرّ فروغ ۱۹ کیا نہ دیگا مجھے مئے گلفام
جب کہ چودہ منازلِ فلکی ۲۰ کر چکے قطع تیری تیزی گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر ۲۱ کوئے مشکوئے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز ۲۲ اپنی صورت کا اک بلوریں جام

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
۲۳ -
طوسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غ زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام ۲۴ تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام
مے ہی پھر میں نہ کیوں پیے جاؤں ۲۵ غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام
بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے ۲۶ کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام
کعبہ میں جا بجائیں گے ناقوس ۲۷ اب تو باندھا ہے دیر میں احرام

اس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد ۲۸ چرخ نے لی ہے جس سے گردش دام
بوسہ دینے میں ان کو ہے انکار ۲۹ دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام

چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصہ آئے
۳۰۔ کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ ۳۱ اے پری چہرہ پیک تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا ۳۲ ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن ۳۳ نام شہنشاہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ ۳۴ مظہر ذو الجلال والاکرام
شہسوار طریقۂ انصاف ۳۵ نو بہار حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز ۳۶ جس کا ہر قول معنئ الہام
بزم میں میزبان قیصر و جم ۳۷ رزم میں اوستاد رستم و سام
اے ترا لطف زندگی افزا ۳۸ اے ترا عہدِ فرخی فرجام
چشم بد دور خسروانہ شکوہ ۳۹ لوحش اللہ عارفانہ کلام
جاں نثاروں میں تیرے قیصر روم ۴۰ جرعہ خواروں میں تیرے مرشد جام
وارث ملک جانتے ہیں تجھے ۴۱ ایرج و تور و خسرو و بہرام
زور بازو میں مانتے ہیں تجھے ۴۲ گیو و گودرز و بیزن و رہام
مرحبا موشگافئ ناوک ۴۳ آفریں آبداری صمصام
تیر کو تیرے تیر غیر ہدف ۴۴ تیغ کو تیری تیغ خصم نیام
رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند ۴۵ برق کو دے رہا ہے کیا الزام ق
تیرے فیل گراں جسد کی صدا ۴۶ تیرے رخش سبک عناں کا خرام
فن صورت گری میں تیرا گرز ۴۷ گر نہ رکھتا ہو دستگاہ تمام ق

اُس کے مضروب کے سر و تن سے ۴۸ کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے ۴۹ صفحہ ہائے لیالی و ایام
اور ان اوراق میں بہ کلکِ قضا ۵۰ مجملاً مندرج ہوئے احکام
لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کُش ۵۱ لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام
آسماں کو لکھا گیا کہ کہیں ۵۲ گنبدِ تیز گرد نیلی فام
حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں ۵۳ خال کو دانہ اور زلف کو دام
آتش و آب و باد و خاک نے لی ۵۴ وضع سوز و غم و رم و آرام
مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز ۵۵ ماہِ تاباں کا اسم شحنۂ شام
تیری توقیعِ سلطنت کو بھی ۵۶ دی بدستور صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم ۵۷ اس رقم کو دیا طرازِ دوام
ہے ازل سے روائیِ آغاز ۵۸ ہو ابد تک رسائیِ انجام

شعر (۱، ۲) ماہ نو، ہلال، نیا چاند، طلوع ہونے سے دو روز قبل چاند نظر نہیں آتا، دم صبح، صبح کے وقت، مطلب صاف ہے

شعر (۳) چونکہ تو گردشِ ایام کا بندہ ہے اسلئے مجبور ہے، آسمان نے تاروں کا جال بچھا رکھا تھا اس لئے کہیں اڑ کے جا نہ سکا۔

شعر (۴، ۵) مطلب صاف ہے۔

شعر (۶) یہ ایک ضرب المثل ہے کہ اگر صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آجائے تو اسے بھولا نہ جانیے۔

شعر ۷، ۸، ۹، ۱۰، مطلب صاف ہے۔ نمام، چغل خور۔ انام۔ مخلوقات۔

شعر (۱۱) اگر تو میرے ممدوح کا حلقہ بگوش ہے تو کیا غالب اس کا غلام نہیں؟

شعر (۱۲) مطلب صاف ہے۔ شعر (۱۳) بر سبیل دوام۔ ہمیشہ۔

شعر (۱۴) ماہ صیام۔ ماہ رمضان شعر (۱۵) ماہ تمام۔ بدر۔ ماہ کامل۔

شعر (۱۶) فر۔ بمعنی بھاگنے، لیکن اس جگہ یہ معنی مراد نہیں۔ بلکہ شان و شوکت، کر و فر۔ نور اور

پرتو کے معنی مراد ہیں لیکن یہ معنی بفتح اور بہ تخفیف رائے آئے ہیں اور بہ تشدید را یہ لفظ گریزندہ کے معنوں میں آتا ہے۔

شعر ۱۷ تا ۲۳، گام، قدم، شکوئے، محلات۔ بام۔ کوٹھا، چودہ منازل فلکی، یعنی جب تو بدر بن جائے۔

شعر ۲۴۔ یعنی میرا تو زہر غم ہی نے کام تمام کر دیا تھا۔ تو نے ناحق مجھے قتل کر کے رسوائی حاصل کی۔

شعر ۲۵ تا ۳۰، زیست، زندگی۔ دشنام۔ گالی، ناقوس۔ سنکھ۔ جو بتخانوں میں بجاتے ہیں۔ گھنٹہ۔ دام قرض۔ ابرام۔ الحاح۔ دق کرنا۔ ضد کرنا۔

شعر ۳۱۔ بلحاظ حسن و خوبی چاند کو پری چہرہ اور بوجہ گردش قاصد تیز رفتار کہا ہے۔

شعر ۳۲ تا ۳۶، بہرام۔ ستارہ مریخ۔ حدیقہ۔ باغ۔

شعر ۳۷، رستم و سام، ایران کے مشہور پہلوان۔ شعر ۳۸، ۳۹، فرخی فرجام، مبارک انجام۔

شعر ۴۰، مرشد جام، مولانا جامی۔ جرعہ۔ گھونٹ۔ شعر ۴۱، شاہان فارس کے نام۔

شعر ۴۲، ایران کے مشہور پہلوانوں کے نام۔ شعر ۴۳، موشگافی، بال کو چیرنا۔ صمصام۔ تلوار۔

شعر ۴۴، یعنی تیرا تیر غیر کے تیر کو نشانہ بناتا ہے اور تیری تلوار دشمن کی تلوار میں اس طرح سے گھس جاتی ہے کہ جیسے تلوار نیام میں داخل ہو جاتی ہے۔

شعر ۴۵، ۴۶، رعد۔ فرشتہ ابر۔ بادل کی گرج، گراں جسد۔ بھاری تن و توش، رخش۔ گھوڑا۔

شعر ۴۷، ۴۸، فن صورت گری، مصوری، مضروب، ضرب پایا ہوا زخمی۔ ادغام۔ کسی چیز کو کسی چیز میں ملا دینا۔ دھنسا دینا۔ یعنی سر و تن کا ایک ہو جانا۔

شعر ۴۹، ۵۰، ازل، پیدائش، دنیا کے وقت۔ رقم پذیر۔ لیالی جمع لیل۔ ایام جمع یوم۔

شعر ۵۱، شاہد معشوق، دشمن کام، بدقسمت، نامراد۔ عاشق کش، عاشقوں کو قتل کرنے والے۔

شعر ۵۲ تا ۵۶، نیلی فام، نیلے رنگ والا، نم، تری، یم، بیگانہ شحنہ، کوتوال، رخشاں، روشن، توقیع، فرمان شاہی۔

شعر ۵۷، یعنی کاتب قدرت نے تیرے فرمان سلطنت پر نقش دوام لکھ دیا۔

شعر ۵۸، ابد۔ وہ زمانہ جس کی انتہا نہ ہو۔ یعنی تیری بادشاہی ازل سے شروع ہوئی ہے۔ دعا ہے کہ خداوند تبارک و تعالیٰ ابد تک پہنچائے۔

قصیدہ چہارم

صبحدم دروازۂ خاور کھلا ۱ مہر عالمتاب کا منظر کھلا
خسرو انجم کے آیا صرف میں ۲ شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود ۳ صبح کو راز مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ ۴ دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا
سطح گردوں پر پڑا تھا رات کو ۵ موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانب مشرق نظر ۶ اک نگار آتشیں رخ سر کھلا
تھی نظر بندی کیا جب رد سحر ۷ بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا
لا کے ساغر نے صبوحی کے لئے ۸ رکھ دیا ہے ایک جام زر کھلا
بزم سلطانی ہوئی آراستہ ۹ کعبۂ امن و اماں کا در کھلا
تاج زریں مہر تاباں سے ہوا ۱۰ خسرو آفاق کے منہ پر کھلا
شاہ روشن دل بہادر شہ کہ ہے ۱۱ راز ہستی اس پہ سرتاسر کھلا
وہ کہ جس کی صورت تکوین میں ۱۲ مقصد نہ چرخ و ہفت اختر کھلا
وہ کہ جس کے ناخن تاویل سے ۱۳ عقدۂ احکام پیغمبر کھلا
پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام ۱۴ اسکے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا
روشناسوں کی جہاں فہرست ہے ۱۵ واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا
ق توسن شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب ۱۶ تھان سے وہ غیرت صرصر کھلا
نقش پا کی صورتیں وہ دلفریب ۱۷ تو کہے بت خانۂ آذر کھلا
مجھ پہ فیض تربیت سے شاہ کے ۱۸ منصب مہر و مہ و محور کھلا
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک ۱۹ میری حد وسع سے باہر کھلا

تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید ۲۰ کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا
باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار ۲۱ مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا
ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس ۲۲ لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا
غ کُنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا ۲۳ کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا
ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے ۲۴ یار کا دروازہ پائیں گر کھلا
ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ ۲۵ دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا
واقعی دل پر بھلا لگتا ہے داغ ۲۶ زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا
ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کماں ۲۷ کب کمر سے غمزہ کی خنجر کھلا
مفت کا کس کو بُرا ہے بدرقہ ۲۸ رہروی میں پردۂ رہبر کھلا
سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک ۲۹ آگ بھڑکی مُنہ اگر دم بھر کھلا
نامے کے ساتھ آ گیا پیغامِ مرگ ۳۰ رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا
دیکھیو غالب سے گر اُلجھا کوئی ۳۱ ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا
پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال ۳۲ پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا
خامہ نے پائی طبیعت سے مدد ۳۳ بادباں کے اُٹھتے ہی لنگر کھلا
مدح سے ممدوح کی دیکھو شکوہ ۳۴ عرض سے یاں رتبۂ جوہر کھلا
مہر کانپا- چرخ چکر کھا گیا ۳۵ بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب ۳۶ اب علوئے پایۂ منبر کھلا
سکۂ شہ کا ہُوا ہے روشناس ۳۷ اب عیارِ آبروئے زر کھلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ ۳۸ اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے ۳۹ اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا
ہو سکے کیا مدح، ہاں اک نام ہے ۴۰ دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا

فکر ابھی پرستائش ناتمام ۴۱ عجزِ اعجازِ ستائش گر کھلا
جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل ۴۲ تم پہ اے خاقانِ نام آور کھلا
تم کرو صاحبقرانی جب تلک
۴۳- ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

شعر ۱، ۲، خاور- مشرق، گنجینہ- خزانہ-

شعر ۳، سیمیا وہ علم طلسم کہ جس سے روح کو دوسرے کے بدن میں منتقل کرکے جو شکل چاہیں بنجاتے ہیں اور موہوم چیزیں کہ درحقیقت بے وجود ہوتی ہیں دکھائی دیتی ہیں-

شعر ۴، کواکب جمع کوکب، ستارے-

شعر ۵، سطح مجازاً میدان- یعنی ستاروں کے روشن ہونے سے موتیوں کا زیور مراد لیا ہے-

شعر ۶، سر کھلا- ننگے سر- آتشیں رُخ- سرخ رنگ- یعنی آفتاب پر چہرۂ معشوق کا دھوکا ہوا-

شعر ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، صبوحی، وہ شراب جو صبح کے وقت پی جاتی ہے- پھر بادۂ گلرنگ کا ساغر معلوم ہوا- ساغر زر پھر ساغر زر معلوم ہوا- خسرو آفاق- بادشاہ عالم-

شعر ۱۲، تکوین، پیدا کرنا- یعنی وہ بادشاہ کہ جس کی پیدائش کے سبب نو آسمانوں اور سات ستاروں کے ظہور کا مقصد ظاہر ہوا یعنی یہ اسی کے لئے پیدا ہوئے تھے-

شعر ۱۳، عقدہ، گرہ، تاویل- حیلہ شرعی- پھیرنا کلام کا ظاہر سے اس جہت کی طرف کہ احتمال رکھتا ہو تاویل مشتق ہے اول سے یعنی پھیر کلام کا طرف اول کے وغیرہ-

شعر ۱۴، سرہنگ، سردار لشکر و نقیب و چوبدار و پہلوان و افسر حاضر باش-

شعر ۱۵، ۱۶، تھان، گھوڑا باندھنے کی جگہ- غیرت صرصر، ہوا سے بھی زیادہ تیز-

شعر ۱۷، آزر- نام حضرت ابراہیم کے چچا کا جو کہ بت تراش تھے-

شعر ۱۸، چرخ دولاب کا تیر جس کے گرد وہ پھرتا ہے یعنی اصطلاح ریاضی میں وہ خط موہوم کہ جو قطب شمالی سے قطب جنوبی تک کھینچا گیا ہے اور جس کے چاروں طرف زمین گردش کرتی ہے-

شعر ۱۹، یعنی میرے دل میں لاکھوں گرہیں تھیں جن کا کھلنا میری طاقت سے باہر تھا لیکن آپکی توجہ سے ہر ایک گرہ کھل گئی۔

شعر ۲۰، تقفل، تالا۔ کلید۔ کنجی۔ شعر ۲۱، شاہ سخن گستر کھلا یعنی اگر مجھ پر نظر التفات فرمائی۔

شعر ۲۲، طبلہ۔ صندوقچہ۔ شعر ۲۳، مطلب صاف ہے کنج۔ گوشہ۔

شعر ۲۴، یعنی ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ یار کے دروازے پر جاکر دستک دیں تب دروازہ کھلے ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہر وقت دروازہ کھلا رہے اور ہم بے دھڑک اندر چلے جائیں۔

شعر ۲۵، ۲۶، ۲۷، مطلب صاف ہے۔

شعر ۲۸، بدرقہ، رہبر یعنی رہنما کی ناواقفیت کا حال ہم پر ظاہر ہو گیا کہ وہ ہمیں منزل مقصود پر نہیں پہنچا سکتا

شعر ۲۹، یہ توضیح ہے کہ اشکوں کی جھڑی دل میں ضرور کچھ ٹھنڈک پیدا کر دیتی ہے لیکن اُس کا کیا علاج کیا جائے کہ اگر ذرا رونا تھمتا ہے تو سوز دل سے بھڑک اٹھتی ہے۔

شعر ۳۰، یعنی محبوب کا خط آیا اور ہمیں شادی مرگ ہو گئی اور خط ہماری چھاتی پر کھلا رہ گیا۔

شعر ۳۱، یعنی غالب ظاہر میں تو کافر ہے اور باطن میں ولی، اس سے کہیں لڑائی جھگڑا نہ کرنا۔

شعر ۳۲، مدحت طرازی، مضامین مدح کا لکھنا شعر ۳۳، خامہ یعنی قلم کو بادبان سے اور لنگر کو طبیعت کہا ہے۔

شعر ۳۴، مدح کو عرض اور ممدوح کو جوہر تصور کیا ہے شعر ۳۵، رایت۔ علم۔ لشکر،

شعر ۳۶، مطلب صاف ہے شعر ۳۷، عیار۔ کسوٹی۔ سونے تولنے کا ترازو۔

شعر ۳۸، مآل۔ انجام۔ اسکندر کے موجد آئینہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

شعر ۳۹، طغرل و سنجر بادشاہوں کے نام۔ شعر ۴۰، ۴۱، جہانداور۔ بادشاہ عالم، ستایش، مدح و تعریف،

شعر ۴۲، خاقان، بادشاہ، یعنی اے بادشاہ نامور مجھے معلوم ہے کہ تو لوح ازل کی تحریر سے واقف ہے اس لئے میں ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔

شعر ۴۳، صاحبقران وہ بادشاہ ہوتا ہے جس کی ولادت کے وقت زہرہ و مشتری کا قران یعنی اتصال ہوا ہو اور اصطلاح اہل نجوم میں صاحبقران اسے کہتے ہیں کہ جس کے سال ولادت میں زحل و مشتری کا قران عظمیٰ ہوا ہو اور صاحبقران نہایت جلیل القدر اور فارغ بادشاہ ہوتا ہے۔

مثنوی در صفت انبہ

ہاں دل دردمند زمزمہ ساز ۱ کیوں نہ کھولے در خزینۂ راز
خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا ۲ شاخ گل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے ۳ نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے ۴ خامہ نخل رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مرد میداں ہے ۵ ثمر و شاخ گوئے و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں ۶ آئے یہ گوئے اور یہ میداں
آم کے آگے پیش جاوے خاک ۷ پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور ۸ بادۂ ناب بن گیا انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے ۹ شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے ۱۰ آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار ۱۱ جب خزاں ہو تب آئے اسکی بہار
اور دوڑائیے قیاس کہاں ۱۲ جان شیریں میں یہ مٹھاس کہاں
ق جان میں ہوتی گر یہ شیرینی ۱۳ کوہکن باوجود غمگینی
جان دینے میں اسکو یکتا جان ۱۴ پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
ق نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر ۱۵ کہ دوا خانۂ ازل میں مگر
آتش گل پہ قند کا ہے قوام ۱۶ شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام
ق یا یہ ہوگا کہ فرط رافت سے ۱۷ باغبانوں نے باغ جنت سے
انگبیں کے بحکم رب الناس ۱۸ بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس
یا لگا کر خضر نے شاخ نبات ۱۹ مدتوں تک دیا ہے آب حیات

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل ۲۰ ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل
تھا ترنج زر ایک خسرو پاس ۲۱ رنگ کا زرد پر کہاں بو باس
آم کو دیکھتا اگر اک بار ۲۲ پھینک دیتا طلائے دست افشار
رونق کارگاہ برگ و نوا ۲۳ نازش دودمان آب و ہوا
رہرو راہ خلد کا توشہ ۲۴ طوبی و سدرہ کا جگر گوشہ
صاحب شاخ و برگ و بار ہے آم ۲۵ ناز پروردۂ بہار ہے آم
خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو ۲۶ نو بر نخل باغ سلطاں ہو
وہ کہ ہے والئ ولایت عہد ۲۷ عدل سے اسکے ہے حمایت عہد
فخر دیں عز و شان و جاہ و جلال ۲۸ زینت طینت و جمال و کمال
کار فرمائے دین و دولت و بخت ۲۹ چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت
سایہ اس کا ہما کا سایہ ہے ۳۰ خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے
ق اے مفیض وجود سایہ و نور ۳۱ جب تلک ہے نمود سایہ و نور
اس خداوند بندہ پرور کو ۳۲ وارث گنج و تخت و افسر کو

شاد دل شاد، شادماں رکھیو
۳۳۔
اور غالب پہ مہرباں رکھیو!

شعر ۱، زمزمہ، سرود آہستہ یعنی آہستہ گانا، مطلب یہ ہے کہ اے زمزمہ ساز دل دردمند تو خزانہ راز کا دروازہ کیوں نہیں کھولتا۔

شعر ۲، ۳، نکتہ ہائے خرد فزا: عقل بڑھانے والی باریک باتیں۔ شعر ۴، نخل، رطب، کھجور کا درخت۔

شعر ۵، ثمر: پھل، گوئے، گیند۔ چوگاں۔ وہ لکڑی جس کا سر خمیدہ ہو اور جس سے گیند کھیلا جائے۔

شعر ۶، ۷، تاک، انگور کی بیل، اس شعر میں لفظ تاک بصیغہ تذکیر استعمال کیا ہے کیونکہ لغت میں لفظ تاک کے معنی انگور کا درخت لکھے ہیں پس لفظ درخت کے لحاظ سے مذکر لکھا ہے انگوروں کو تاک کے پھپھولوں سے تشبیہ دینا ایک بدیع تشبیہ ہے۔

شعر ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، بادۂ ناب، خالص شراب۔ نیشکر۔ گنّا۔ برگ و بار۔ پتے۔ پھل شعر ۱۲، یعنی انسان کی جان کو اگرچہ جانِ شیریں کہا جاتا ہے مگر اس میں مٹھاس کہاں ہے یہ مٹھاس اگر ہے تو آموں میں ہے۔

شعر ۱۳، ۱۴، کوہکن اور لفظ شیریں کی رعایت ہے شعر ۱۵، ۱۶، یعنی دواخانہ ازل میں یہ ایک شربت بنایا گیا ہے اور اس شربت کا آتشِ گل پر قوام کیا گیا ہے شعر ۱۷، ۱۸، رافت مہربانی، انگبیں۔ شہد یعنی آم کیا ہیں جنت سے بحکم خدا شہد کے سربمہر گلاس بھیجے گئے ہیں۔

شعر ۲۱، ۲۲، ترنج ایک مشہور پھل ہے مثل بڑے لیموں کے، طلائے دست افشار۔ خالص سونا جو ہاتھ میں دبانے سے دب جاتا ہے شعر ۲۳، کارگاہ برگ و نوا، درخت۔ دودمان آب و ہوا۔ باغ۔ اصلی معنی دودمان کے خاندان یا قبیلہ وغیرہ کے ہیں۔ شعر ۲۴، طوبیٰ، بہشت کے ایک درخت کا نام ہے سدرہ، ساتویں آسمان پر ایک بیری کا درخت ہے۔ جسے سدرۃ المنتہیٰ بھی کہتے ہیں۔ شعر ۲۶، نوبر۔ نیا میوہ شعر ۲۷، پہلے مصرعہ میں جو لفظ عہد آیا ہے اس کے معنی عہد و پیمان کے ہیں اور مصرعہ ثانی میں زمانہ اور وقت کے، شعر ۳۰، خدا کا سایہ ظلِ سبحانی کا ترجمہ ہے شعر ۳۱، ۳۲، مفیض۔ فیض پہنچانے والا۔ افسر۔ تاج۔

قطعات

(۱) اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر ۱ اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل
پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ ۲ فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل
تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام ۳ تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل
تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم ۴ تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل
بسخن اوج دہ مرتبۂ معنی و لفظ ۵ ق بکرم داغ نہ ناصیۂ قلزم و نیل
تا ترے عہد میں ہو عیش و طرب کی توفیر ۶ تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل
ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر ۷ زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل
تیری دانش مری اصلاح مفاسد کی رہین ۸ تیری بخشش مرے انجاح مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید ۹ تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل
بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں ۱۰ چرخِ کجباز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ ۱۱ پہلے ٹھونکی ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل
تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم ۱۲ کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِ ثقیل
دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی داڑھی ۱۳ غمِ گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل
فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر ۱۴ کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح ۱۵ میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل
نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف ۱۶ جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

شعر ۱، عدیل وہ دو شخص جو ایک کجاوہ میں دونوں طرف بیٹھیں، بے مثل، بے نظیر، بے شبہ، بے عدیل یہ تمام الفاظ ہم معنی ہیں۔ شعر ۲، اورنگ، تخت، اکلیل۔ تاج۔ فرق سر کی مانگ۔ سر۔ مطلب ہے تیرے پاؤں پر تخت اپنا سر ارادت ملتا ہے اور تاج تیرے سر سے سعادت حاصل کرتا ہے۔ شعر ۳، شانہ۔ کنگھی۔
شعر ۴، کلیم۔ حضرت موسیٰ۔ مائدہ، خوانِ طعام، خوانِ نعمت، بذل بخشش۔ خلیل۔ حضرت ابراہیم۔
شعر ۵، یعنی تیری سخندانی سے الفاظ و معانی کا رتبہ بلند ہو گیا ہے اور تیرے بحرِ کرم کے مقابلے میں قلزم و نیل شرمندہ ہیں۔ شعر ۶، توفیر۔ زیادتی۔ تقلیل۔ کمی۔
شعر ۷، ثور وہ برج آسمانی جو بیل کی صورت ہے، حوت، وہ برج آسمانی جو مچھلی کی صورت پر ہے۔ چاند کا برج ثور میں ہونا اور زہرہ کا حوت میں ہونا مبارک سمجھا جاتا ہے۔ شعر ۸، انجاح۔ حاجت روائی مطلب براری۔
شعر ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، نوید۔ خوشخبری جرِ ثقیل، نام ایک علم کا جس میں وزنی اور بھاری چیزوں کے کھینچنے کے قواعد درج ہوتے ہیں، شعر ۱۳، لقا کی داڑھی اور عمر کی زنبیل، قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ دونوں تلمیحیں داستانِ امیر حمزہ سے لی گئی ہیں، مشہور ہے کہ لقا کی داڑھی کے ہر ایک بال میں موتی پروئے گئے تھے عمر عیار کی نسبت کہا

جاتا ہے کہ جو کچھ اس کی زنبیل میں پڑ جاتا تھا اب غائب ہو جاتا اور وہ کبھی پُر نہ ہوتی۔

شعر ۱۴، ۱۵، ۱۶، ابہام کسی بات کو بھول کر بیان کرنا، توضیح، وضاحت۔ تراوش، ٹپکنا۔ تعجیل۔ جلدی،

(۲) گئے وہ دن کہ نادانستہ غیر کی وفاداری ۱ کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ ۲ قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے

شعر ۱، تقریر کیا کرتے تھے۔ بیان کیا کرتے تھے۔

شعر ۲، ہم نہ کہتے تھے کہ غیر بے وفا ہے بد اصل ہے۔

(۳) کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں ۱ اک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب ۲ وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر ۳ طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ ۴ وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

شعر ۱، ۲، مطرا۔ تازہ۔ صاف۔ آبدار۔

شعر ۳، ۴، حف نظر۔ چشم بد دور (لیکن لغت عربی فارسی میں یہ لفظ بہ تشدید ف آتا ہے جس کے معنی کسی چیز کے گرد ہونا۔ داڑھی مونچھیں سنوارنا اور مہربانی اور خدمت کرنا ہیں)،

(۴) ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی ۱ زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامۂ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے ۲ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے
مُہر مکتوب عزیزاں گرامی لکھیے ۳ حرز بازوئے شگرفاں خود آرا کہیے
مسی آلود سر انگشت حسیناں لکھیے ۴ داغ طرفِ جگر عاشق شیدا کہیے
خاتمِ دست سلیماں کے مشابہ لکھیے ۵ سر پستان پریزاد سے مانا کہیے
اختر سوختۂ قیس سے نسبت دیجے ۶ خالِ مشکیں رُخ دلکش لیلیٰ کہیے
حجر الاسود دیوار حرم کیجے فرض ۷ نافہ آہوئے بیاباں ختن کا کہیے
وضع میں اس کو اگر سمجھیے قاف تریاق ۸ رنگ میں سبزۂ نوخیز مسیحا کہیے

صومعہ میں اسے ٹھہرائیے گر مہر نماز ۹ میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیے
کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے ۱۰ کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے
کیوں اسے گوہرِ نایاب تصوّر کیجیے ۱۱ کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے
کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلیٰ کہیے ۱۲ کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلمیٰ کہیے

اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے ۱۳-

شعر ۱، ۲، ۳، انگشت بدنداں- حیرت زدہ- سر بگریباں- متفکر- حرز- تعویذ-

شعر ۴، ۵، خاتم- انگوٹھی- مانا- مانند- مشابہ-

شعر ۶، ۷، ۸، ۹، حجر الاسود- وہ سیاہ پتھر جو کعبہ میں ہے- صومعہ- عبادت خانہ-

شعر ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، گنج- خزانہ، مردمک- پتلی- تکمہ- گھنڈی- پے- قدم- ناقہ- اونٹنی سلما- نام عرب کی ایک معشوقہ- سویدا- سیاہی-

(۵)، نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا نے   مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر   جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

بادشاہ نے مرزا صاحب کو بیسنی روٹی بھیجی تھی جس کے شکریہ میں یہ قطعہ لکھا گیا تھا- مطلب یہ ہے- کہ بہشت میں بھی ایسی بیسنی روٹی نہیں ہے- اگر حضرت آدم یہ بیسنی روٹی کھا لیتے تو پھر گیہوں کی روٹی کبھی نہ کھاتے-

سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا   باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے   ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ   مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناو بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کئے ہونگے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
رخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگ ابر گہر بار سراسر سہرا
یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہئیے پھولوں کا بھی ایک مکرر سہرا
جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا
رخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا
تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگ ابر بہار
لائے کیا تاب گرانبارئ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں کہدے کوئی اس سہرے سے بہتر سہرا

اس سہرے میں کوئی شعر ایسا نہیں جو قابل شرح ہو، عام فہم ہے، البتہ کا لفظ مرزا صاحب نے لفظ سہرے کو بگاڑ کر لکھا ہے، مرزا غالب کے مقطع کی بنا پر ذوق مرحوم کو بھی سہرا لکھنا پڑا۔ مرزا صاحب کو فکر ہوئی کہ کہیں ملول شاہ ناراض نہ ہو گئے ہوں فوراً ایک قطعہ معذرت لکھا جو درج ذیل ہے۔

(۲) منظور ہے گذارش احوال واقعی ۱ اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری ۲ کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادرو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل ۳ ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں ۴ مانا کہ جاہ و منصب ثروت نہیں مجھے
استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال ۵ یہ تاب، یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
جام جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر ۶ سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون؟ اور ریختہ ہاں اس سے مدعا ۷ جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا ز رہ امتثال امر ۸ دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات ۹ مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ ۱۰ سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں ۱۱ ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

شعر ۱، ۲، ۳، آبا۔ آبا و اجداد۔ مسلک، طریقہ۔

شعر ۴، منصب۔ عہدہ۔ ثروت۔ نعمت و سرداری۔ دولت و حشمت۔ جاہ۔ مرتبہ و عزت۔

شعر ۵، ۶، پرخاش۔ خصومت۔ عداوت۔ بغض و کینہ۔ ضمیر۔ دل۔

شعر ۷، ۸، امتثالِ امر۔ حکم بجا لانا۔ انبساط۔ خوشی۔

(۶) نصرۃ الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے ۱ تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے
گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے ۲ رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے
اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں ۳ غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
خستگی کا ہو بھلا جسکے سبب سے سرِ دست ۴ نسبت یک گونہ مرے دلکو تری بات سے ہے
ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں ۵ یہ دعا شام و سحر قاضیِ حاجات سے ہے
تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا ۶ گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

اس پہ گذرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار
۷ غالبؔ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

یہ قطعہ بھی عام فہم ہے کوئی شعر قابلِ شرح نہیں بعض الفاظ کے معنی لکھے دیے جاتے ہیں۔

شعر ۴، خستگی کا ہو بھلا یعنی میرے زخمی دل پر تو اپنے دستِ کرم سے مرہم لگاتا ہے مجازاً دولت و انعام دیتا ہے

شعر ۵، ۶، عناں۔ لگام۔ خضر سے شہزادۂ خضر سلطان پسر بہادر شاہ بادشاہ مراد ہے۔

شعر ۷، ریو و ریا۔ مکاری و ریاکاری۔

قطعہ آخری چہار شنبہ

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشک بو کی ناند
جو آئے جام بھر کے پیے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند
بٹتے ہیں سونے رُوپے کے چھلے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند
یوں سمجھئے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند
غالب یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت و خواند

آخری چہار شنبہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یوم صحت ہے۔ بادشاہ کے یہاں اس روز خوشی میں سونے چاندی کے چھلے تقسیم کئے جاتے تھے۔

در مدح بادشاہ

اے شاہ جہانگیر، جہاں بخش، جہاندار ۱ ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت
جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو ۲ تو وا کرے اس عقدے کو وہ بھی باشارت
ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر ۳ گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت
آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا ۴ ہے فخر سلیماں جو کرے تیری وزارت
ہے نقش مریدی ترا فرمانِ الٰہی ۵ ق ہے داغ غلامی ترا توقیعِ امارت
تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں ۶ تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت
ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی ۷ ق باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت
ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل ۸ ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت
کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر ۹ قاصر ہے شکایت میں تری میری عبارت

نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں ۱۰ نظارگی صنعت حق اہل بصارت

تجھ کو شرف مہر جہاں تاب مبارک !
غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

شعر ۴، ممکن ہے کرے؟ استفہام انکاری ہے۔

شعر ۶، ۷، سلب کرے، چھین لے۔ تاب شرارت۔ سوزش، چمک۔

شعر ۸، توغل۔ کمال مشق۔ سحر طرازی۔ جادو نگاری۔

شعر ۹، ۱۰، قاصر۔ عاجز۔ نظارگی۔ نظارہ کرنے والے۔ بطور اسم فاعل لکھا ہے۔

شعر ۱۱، عتبہ۔ آستانہ۔

(۱۰) افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو اس شخص کو ضرور ہی روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

افطار۔ روزہ کھولنا۔ صوم۔ روزہ۔ دستگاہ۔ سرمایہ۔ سامان،

گذارش مصنف بحضور بادشاہ

(۱۱) اے شہنشاہ آسماں اورنگ ۱ اے جہاندار آفتاب آثار
تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں ۲ تھا میں اک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی ۳ ہوئی میری وہ گرمئ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز ۴ روشناس ثوابت و سیّار
گرچہ از روئے ننگ بے ہنری ۵ ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی ۶ جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں ۷ بادشہ کا غلام کار گذار
خانہ زاد اور مرید اور مداح ۸ تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر ۹ نسبتیں ہو گئیں مشخص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں ۱۰ مدعائے ضروری الاظہار
پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں ۱۱ ذوقِ آرائشِ سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر ۱۲ تا نہ دے بادِ زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش ۱۳ جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال ۱۴ کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ ۱۵ بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انسان ۱۶ دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی ۱۷ وقنا ربنا عذاب النّار
میری تنخواہ جو مقرر ہے ۱۸ اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مُردے کی چھ ماہی ایک ۱۹ خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات ۲۰ اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض ۲۱ اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا ۲۲ ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں ۲۳ شاعرِ نغز گوئے و خوش گفتار
رزم کی داستاں اگر سنیئے ۲۴ ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے ۲۵ ہے قلم میرا ابر گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد ۲۶ قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا ۲۷ آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ ۲۸ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام ۲۹ شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

شعر ۱، اورنگ۔ تخت۔ یعنی اے وہ شہنشاہ کہ جس کا تخت آسمان کا ہم مرتبہ ہے اور جس کی سلطنت ضیائے آفتاب کی طرح تمام جہان پر چھائی ہوئی ہے۔ شعر ، ثوابت جمع ثابت یعنی وہ ستارے جو حرکت نہیں کرتے سیارے وہ ستارے جو حرکت کرتے ہیں۔

شعر ۹، شخص۔ مخصوص۔ چار بیتیں۔ خانہ زاد غلام۔ مرید۔ مدّاح۔ نوکر۔

شعر ۱۲، زمہریر۔ سخت سردی۔ کرّہ ہوا کا ایک طبقہ جو نہایت سرد ہے۔ شعر ۱۳، نزار۔ لاغر و ناتوان۔

شعر ۱۷، ۱۸، وقنا ربنا عذاب النار۔ خدا ہم کو آگ کے عذاب سے بچائے۔ ہنجار۔ قاعدہ۔

شعر ۲۲، نغز گو۔ نہایت عمدہ، لطیف اور کم گو۔

(۱۲) سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے　　جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہُوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے　　کہ جو شریک ہو میرا شریک غالب ہے

شعر ۱۲، سیہ گلیم۔ سیہ بخت، شریک غالب، وہ شریک جس کا حصہ دوسرے شریک سے غالب یعنی زیادہ ہو۔

(۱۳) سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی　　مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد　　تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

یہ قطعہ دربار کی غیر حاضری کے عذر میں لکھا گیا ہے یعنی مسہل سے پہلے تین دن منضج کے، تین دن مسہل کے تین دن تبرید کے، کیونکہ ہر مسہل کے بعد ایک ایک تبرید پلائی جاتی ہے، علاوہ ان کے تین دن ان تبریدوں کے جو مسہل ختم ہونے پر پلائی جاتی ہیں۔ چونکہ ایام مسہل میں چلنا پھرنا ازروئے طب منع ہے اس لئے بارہ روز کی رخصت طلب کی گئی ہے۔ تبرید وہ سرد دوا جو مسہل کی گرمی کا ازالہ کرے۔

(۱۴) خجستہ انجمن طوئے میرزا جعفر　　کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب　　نہ کیوں ہو مادۂ سال عیسوی محظوظ ۱۸۵۴ء

طوی۔ ترکی میں شادی عروسی کو کہتے ہیں۔ خجستہ۔ مبارک۔ فرخندہ۔ مبارک

(۱۵) ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی — ہُوا بزم طرب میں رقص ناہید
کہا غالب سے تاریخ اس کی کیا ہے — تو بولا۔ انشراحِ جشن جمشید
۱۲۷۰ھ

رقص۔ ناچ۔ ناہید۔ ستارہ زہرہ جو فلک سوئم پر ہے اور اسے مطربۂ فلک بھی کہتے ہیں۔

(۱۶) گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں — دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام — اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

بادشاہ کے دربار کا یہ آداب تھا کہ آپس میں جو وہاں ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے تو ملتے پر ہاتھ رکھنے کی جگہ دایاں ہاتھ دائیں کان پر رکھتے تھے، چونکہ اردو محاورہ میں کانوں پر ہاتھ دھرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم آشنا نہیں۔ اس لئے مرزا نے اس کو اس پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ (یادگار غالب)

رُباعیات

(۱) بعد از اتمام بزم عید اطفال — ایّام جوانی رہے ساغر کش حال
آپہنچے ہیں تا سواد اقلیم عدم — اے عمر گذشتہ یک قدم استقبال

اتمام۔ پورا کرنا۔ انجام کو پہنچانا۔ سواد۔ اطراف شہر۔ اقلیم عدم۔ ملک فنا۔ یعنی جب بچپن کے کھیل کود کی محفل برہم ہوئی تو شراب جوانی میں مست ہوگئے پھر ضعیفی آئی تو گویا ملک عدم کے کنارے آپہنچے اور پھر عمر گذشتہ سے خواہش کی کہ اب تو ایک قدم ہمارے استقبال کے لئے آ۔

شیخ الٰہی بخش رفیق مرحوم کی رباعی جو انہوں نے حالت نزع میں لکھی تھی ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔

کشتیِ عمر سے اترے عدم آباد آیا — بحر ہستی کا کنارہ دل ناشاد آیا
شکر صد شکر کہ آیا ملک الموت رفیق — آج اس عہدہ فراموش کو میں یاد آیا

(۲) شب زلف و رُخِ عرق فشاں کا غم تھا — کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک — ہر قطرۂ اشک دیدۂ پُر نم تھا

رُخِ عرق فشاں۔ پسینہ آیا ہُوا چہرہ۔ یعنی رات کو زلف و رُخ کے خیال میں جو رویا تو زلف کی سیاہی اور رُخ

کی سفیدی کے باعث ہر قطرۂ اشک میں آنکھ کی سی سیاہی و سفیدی پیدا ہو گئی۔ تو گویا ہزار آنکھ سے میں رو دیا۔

(۳) دل تھا کہ جو جان درد تمہید سہی   بے تابیٔ رشک و حسرت دید سہی
ہم اور فسردن اے تجلّی افسوس   تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

جان درد تمہید۔ یعنی وہ جان جس کا آغاز درد سے ہو۔ تجدید۔ از سرِ نو پیدا کرنا۔ سہی۔ شعر اولیٰ کے دونو مصرعوں میں برداشت کے معنوں میں آتا ہے، مطلب یہ ہے کہ جب ہمارے پاس دل تھا تو ہم عشق و محبت کی تمام مصیبتیں برداشت کرتے تھے، لیکن افسوس کہ اب ہمارے دل و جان افسردہ ہو چکے ہیں۔ اے تجلی طور اگر تو دوبارہ اپنا کرشمہ نہیں دکھا سکتی تو تجدید ہی سہی۔ یعنی نئے انداز سے جلوہ افروزی ہو کیونکہ میرے دل افسردہ میں پھر ہوس سوز پیدا ہوئی ہے۔

(۴) آتشبازی ہے جیسے شغلِ اطفال   ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور سے حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی   بچوں کے لئے گیا ہے کیا کھیل نکال

لڑکوں سے معشوق مراد ہیں جو عاشقوں کے جگر جلا جلا کر آتشبازی کا تماشہ دیکھتے ہیں۔

(۵) ہے خلقِ حسد قماش لڑنے کے لئے   وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لئے
یعنی ہر بار صورتِ کاغذ باد   ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لئے

قماش۔ مال و متاع۔ جامہ ریشمیں۔ جوہر۔ صفت، تلاش۔ روزی۔ کاغذ باد۔ پتنگ۔ حسد۔ قماش۔ یعنی جس نے جامۂ حسد پہن لیا ہو یعنی دو شخصوں کا آپس میں ملنا ایسا ہے جیسے دو کنکوے آپس میں لڑتے ہیں۔ وحشت کدۂ تلاش سے دنیا مراد ہے۔

(۶) دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا   اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں   غالبؔ منہ بند ہو گیا ہے گویا

نژند۔ غمناک و خوار۔ مطلب صاف ہے۔

(۷) دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ   دل رک رک کے بند ہو گیا ہے غالبؔ

واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں   سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

دکھ جی کے پسند۔ یعنی دکھ دل کو پسند آگیا ہے۔ سوگند۔ قسم۔

(۸) مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل   سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش   گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

آخر کے مصرعہ میں دو معنی پیدا ہو گئے ہیں ایک یہ کہ اگر ان کی فرمائش پوری کروں اور آسان شعر کہوں تو یہ مشکل ہے کہ اپنی طبیعت کے اقتضاد کے خلاف ہے اور آسان نہ کہوں تو یہ مشکل ہے کہ وہ بُرا مانتے ہیں۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس باب میں صاف صاف بات کہتا ہوں تو سخندان کامل کی نافہمی اور کند ذہنی ظاہر ہوتی ہے اور اگر صاف صاف نہ کہوں تو آپ ملزم ٹھہرتا ہوں پس ہر طرح مشکل ہے۔
(یادگار غالب)

(۹) بھیجی ہے جو مجھ کو شاہ جمجاہ نے دال   ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال   ہے دولت و دیں و دانش و داد کی ال

شاہ جمجاہ یعنی ہم رتبۂ جمشید۔ مصرعہ ثانی میں لفظ دال بمعنی دلالت کرنا استعمال ہوا ہے بادشاہ کے یہاں مونگ کی دال نہایت نفیس و لذیذ پکا کرتی تھی جو شاہ پسند کہلاتی تھی۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے یہ دال مرزا غالب کو بھیجی۔ یہ رباعی اسی کا شکریہ ہے۔

(۱۰) ہیں شہ میں صفات ذوالجلالی باہم   آثار جمالی و جلالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم   ہے ابکے شب قدر و دوالی باہم

سافل۔ پست، مطلب یہ ہے کہ ہمارے بادشاہ میں دو طرح کی شوکتیں اور صفات موجود ہیں اور اس میں جلال و جمال کے آثار ہیں، چونکہ دیوالی اور شب قدر اب کے اکٹھی آئی ہیں۔ اس لئے ادنےٰ و اعلیٰ کیوں نہ خوشیاں منائیں؟

(۱۱) حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے   تا شاہ شیوع دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ   ہے صفر کہ افزائش اعداد کرے

شیوع۔ ظاہر ہونا۔ رواج پانا۔ اشاعت کرنا۔ یہ رباعی مرزا صاحب نے بادشاہ کی سالگرہ کے موقع پر لکھی تھی۔ صفر وہ نقطہ ہے جو حساب میں آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رشتۂ عمر کی جو گرہ ہے یہ گرہ نہیں بلکہ وہ صفر ہے جو ۱۰ کو ۱۰۰ اور ۱۰۰ کو ۱۰۰۰ کر دیتا ہے۔

(۱۲) اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا — اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سینکڑے کو ایک گرہ فرض کریں — ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

یہ رباعی بھی رباعی بالا سے منسلک سمجھنی چاہیئے۔

(۱۳) کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں — عشاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہوگا — کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

ظلم سے ہاتھ اُٹھانا۔ دست بردار ہونا۔ اس میں ایہام ہے۔ سبحان اللہ کیا شعر کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو ہاتھ ظلم سے اُٹھایا جائے گا۔ اس میں ضرور تلوار ہوگی۔

(۱۴) ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے — کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ — وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

درنگ۔ توقف۔ یعنی ہم ہر چند اراکین دربار کی منتیں خوشامدیں کرتے ہیں انہیں جھک جھک کر سلام کرتے ہیں لیکن وہ نہایت لاپروائی سے ہمارے کام میں دیر کرتے ہیں، تنگ آ کر ہم اپنے دل میں کہتے ہیں کہ آؤ خدا ہی کی جناب میں عرض معروض اور دعا کرو۔ دل کہتا ہے اللہ اللہ کرو وہ آپ ہی صبح و شام کرنے والے ہیں۔ صبح و شام کرنا لیت و لعل کے معنوں پر آتا ہے اور یہ معنی بھی صحیح ہیں کہ خدا صبح و شام کا پیدا کرنے والا ہے لیکن اصل مطلب یہی ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ خدا بھی ہماری ہر ایک دعا قبول کرے۔

(۱۵) سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں — آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن — خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں

یہ رباعی بھی اسی قطعہ کے ساتھ دربار میں پیش کی گئی تھی۔ جس میں روزے کا مضمون درج تھا اس رباعی کا مطلب یہی ہے کہ میرے پاس کھانے اور سونے کا تو سامان نہیں روزہ رکھے کون۔ یعنی امرا لوگ تو موسم گرما

میں روزہ رکھ کر اور خس کی ٹٹیاں لگا کر ٹھنڈے مکانوں میں آرام کرتے ہیں اور روزہ کھولنے کے وقت شربت و برف سے کلیجہ ٹھنڈا کرتے ہیں۔ میں خالی روزہ رکھ کر کیا کروں؟

(۱۶۱) ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے — بھیجے ہیں جو ارمغاں شہ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار — فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

ارمغاں۔ تحفہ۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے مرزا صاحب کو ڈالی میں سیم کے بیج بھی بھیجے تھے جس کے شکرانہ میں یہ رباعی لکھی گئی ہے۔ سیم کے بیجوں کو ان کی سبزی کی وجہ سے فیروزہ سے تشبیہ دینا ندرت خیال میں داخل ہے بلکہ عموماً فیروزے جو بیضوی شکل کے ہوتے ہیں وہ سیم کے بیجوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔

پروفیسر ملک محمد عنایت اللہ ایم اے

تمام شد

PDF By :
Ghulam Mustafa Daaim Awan